زمانہ

مرتبہ: دیا نراین نگم، بی۔ اے

نمبر ۱	جنوری سنہ ۱۹۴۱ء	جلد ۷۶

فہرست

تصاویر: ۱۔ رائے بہادر شنکر دیال صاحب مرحوم
۲۔ گروپ کل ہند اردو کانفرنس کانپور

قیمت سالانہ پانچ روپیہ

ممالک غیر سے [illegible] روپیہ

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

(نمونہ سات آنے)

آثارِ وقت

(از پنڈت آنند نراین مُلّا، ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی)

ہر اِک سِمت کالی گھٹا چھا رہی ہے　　پھر اِک عصرِ نَو کی بہار آ رہی ہے
بدلنے کو ہے پھر نظامِ زمانہ　　ہوا ختم وہ دَورِ شاہنشہانہ
لبِ دہر پر ہے نیا اِک فسانہ　　ترانے نئے زندگی گا رہی ہے

ہر اِک سمت کالی گھٹا چھا رہی ہے
پھر اِک عصرِ نَو کی بہار آ رہی ہے

خفا اِس تغیُّر پہ جو ہو رہے ہیں　　ابھی خوابِ غفلت میں وہ سو رہے ہیں
زمانے کی حالت پہ جو رو رہے ہیں　　زمانے کو اُن پر ہنسی آ رہی ہے

ہر اِک سِمت کالی گھٹا چھا رہی ہے
پھر اِک عصرِ نَو کی بہار آ رہی ہے

اُدھر اہلِ دولت کا جھنڈا گڑا ہے　　اِدھر بے نواؤں کا ڈیرہ پڑا ہے
جہاں، دو قطاریں بنائے کھڑا ہے　　زمیں جیسے گردوں سے ٹکرا رہی ہے

ہر اِک سِمت کالی گھٹا چھا رہی ہے
پھر اِک عصرِ نَو کی بہار آ رہی ہے

یہ جھگڑا نہیں سلطنت کا　　نہ یہ تفرقہ مذہب و قومیت کا
تصادم ہے یہ ذہنیت ذہنیت کا　　دلوں میں لڑائی لڑی جا رہی ہے

ہر اِک سِمت کالی گھٹا چھا رہی ہے
پھر اِک عصرِ نَو کی بہار آ رہی ہے

ہر اِک جہدِ ہستی میں یہ جلوہ گر ہے
اِسی پر مدارِ اُمیدِ بشر ہے
کچھ ایسا جہانگیر اس کا اثر ہے
کہ دُنیا سمٹتی چلی جا رہی ہے

ہر اِک سمت کالی گھٹا چھا رہی ہے
پھر اِک عصرِ نو کی بہار آ رہی ہے

یہی چاہتے ہیں، جو ہیں اہلِ ثروت
ہے مٹھی میں جن کی عنانِ حکومت
کسی طور ہاتھوں سے جائے نہ طاقت
مگر پھر بھی طاقت چھنی جا رہی ہے

ہر اِک سمت کالی گھٹا چھا رہی ہے
پھر اِک عصرِ نو کی بہار آ رہی ہے

حکومت کا لیکن طریقہ نہ بدلا
پڑا ہے ابھی تک نگاہوں پہ پردا
ہے انداز اب بھی وہی گفتگو کا
وہی راگ گائے چلی جا رہی ہے

ہر اِک سمت کالی گھٹا چھا رہی ہے
پھر اِک عصرِ نو کی بہار آ رہی ہے

کبھی بھر کے آنکھوں میں چنگاریاں یہ
دیئے جا رہی ہے ہمیں دھمکیاں یہ
کبھی بن کے اِک مادرِ مہرباں یہ
کھلونوں سے بچوں کو بہلا رہی ہے

ہر اِک سمت کالی گھٹا چھا رہی ہے
پھر اِک عصرِ نو کی بہار آ رہی ہے

کبھی ناتوانوں کی دمساز بن کر
کبھی بے زبانوں کی آواز بن کر
کبھی خود مشیّت کی ہمراز بن کر
ہمیں نیک و بد خوب سمجھا رہی ہے

ہر اِک سمت کالی گھٹا چھا رہی ہے
پھر اِک عصرِ نو کی بہار آ رہی ہے

نہیں آتی جب کام تقریر کوئی	نہیں ٹھیک پڑتا ہے جب تیر کوئی
نہیں بنتی جب اور تدبیر کوئی	تو مذہب کے شعلوں کو بھڑکا رہی ہے

ہر اِک سمت کالی گھٹا چھا رہی ہے
پھر اِک عصرِ نَو کی بہار آ رہی ہے

مگر وقت سے کون جیتا ہے بازی	کہیں موجِ طوفاں بھی روکے ہے رُکتی
تزلزل میں ہے قصرِ سرمایہ داری	فصیل اِک نہ اِک ٹوٹتی جا رہی ہے

ہر اِک سمت کالی گھٹا چھا رہی ہے
پھر اِک عصرِ نَو کی بہار آ رہی ہے

منظّم ہیں اب فاقہ مستوں کے لشکر	کڑے پڑ رہے ہیں غریبوں کے تیور
جو اُڑنے لگیں تھیں حکومت کی شہ پر	اب ان چیونٹیوں کی قضا آ رہی ہے

ہر اِک سمت کالی گھٹا چھا رہی ہے
پھر اِک عصرِ نَو کی بہار آ رہی ہے

لئے دل میں اِک جذبۂ بے پناہی	نگاہوں میں اِک جلوۂ صُبح گاہی
ہے پھر کارواں نوعِ اِنساں کا راہی	مجھے اس کے قدموں کی چاپ آ رہی ہے

ہر اِک سمت کالی گھٹا چھا رہی ہے
پھر اِک عصرِ نَو کی بہار آ رہی ہے

مساواتِ اِنساں کے بُڈھے سپاہی	ترے نام دنیا کی ہے تاجداری
عروسِ جہاں ہو چلی نیم راضی	تری گرم نظروں سے شرما رہی ہے

ہر اِک سمت کالی گھٹا چھا رہی ہے
پھر اِک عصرِ نَو کی بہار آ رہی ہے

کلامِ حسرت

(از مولانا حسرت موہانی)

اُسی کا جلوہ ہر جانب عیاں ہے نمودِ حُسنِ بے صورت کہاں ہے
ملی دل کو مُرادِ نامُرادی ترے غم کی بدولت شادماں ہے
فقیرِ بے نوائے درگہِ عشق امیرِ بے نیازِ دوجہاں ہے
نکلنے پائے کیونکر یاد اُن کی درِ دل پر محبت پاسباں ہے
نہ چھوڑی تُم نے حسرت عشق بازی تمنّا پیر ہوکر بھی جواں ہے

عیش میری شکستہ حالی کا عکس ہے اُن کی بے ملالی کا
عہدِ عشرت بھی تیرے ساتھ وہ تھا کیا زمانہ فراغ بالی کا
حُسن تیرا بامتزاج وفا اِک نمونہ تھا بے مثالی کا
پھر وہ آمادۂ خرام ہیں سر پھر ہے مشتاق پائمالی کا
مہرباں ہوکے پاس کچھ تو کرو لبِ حسرت کی بے سوالی کا

سوزِ غم ہے یہ کچھ بخار نہیں تم کو اس کا بھی اعتبار نہیں
کچھ بھی ہو تم سے، طعن یا دُشنام ہم کو واللہ ناگوار نہیں
تھی کبھی یاد اُن کی وجہِ سکون اب کسی حال میں قرار نہیں
حیف اس دل کی بے ملالی پر جو ترے درد کا شکار نہیں
سہل کہتا ہوں ممتنع حسرت نغز گوئی مرا شعار نہیں

محبت نے اثر پیدا کیا یہ دلنشیں ہوکر کہ لب تک شکوہ ہائے حُسن بھی آئے حسیں ہوکر

یادِ اُن کی ہوئی وجہِ سکون ہجر میں حسرت بلبل کے لئے یادِ بہار آئی قفس میں

شاہجہاں پور کے ہندو شعراء

(از حضرت کلیم اعظم گڈھی)

مجھے شاہجہاں پور کے ایک دوست کی عنایت سے دو تین قلمی تذکرے اور ایک مطبوعہ تاریخ شاہجہاںپور کے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہاں کے فارسی گو ہندو شعراء کا کلام پڑھکر حیرت ہوئی۔ یہ اپنے فن کے اُستاد اس طرح دنیائے ادب میں گمنام ہیں کہ کوئی جانتا بھی نہیں۔ بعض ایسے ہیں کہ ان پر اہل زبان ہونے کا دھوکا ہوتا ہے۔ قلمی تذکروں کا یہ عالم ہے کہ کچھ اوراق کہیں کے کچھ اوراق کہیں کے موجود ہیں مولوی صبیح الدین میاں صاحب نے ایک تاریخ شاہجہاںپور لکھی تھی جس میں اُنھوں نے نہایت فراخ دلی سے جو لوگ اُنھیں میسر آسکے ہیں جگہ دی ہے۔ مضمون لکھتے وقت ان کتابوں کا نوٹ پیش نظر تھا شاہجہاںپور کے مایۂ ناز شاعر پنڈت جگموہن ناتھ رینہ شوق ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر سے بھی اس مضمون میں امداد ملی ہے۔ اب اتنی دردسری کے بعد اُن بزرگوں کے کلام سے لطف اُٹھائیے جو اپنے وقت کے آفتاب و ماہتاب تھے

(۱) مسرور

آپ کا اسم گرامی سب سکھ رائے تھا، کایستھوں کے ایک معزز خاندان کے فرد تھے۔ شاہجہاںپور کے محلہ مسجد گنج میں مکان تھا۔ آپ کی پیدائش سنہ ۱۱۱۴ھ میں ہوئی۔ جیسا پہلے دستور تھا کہ تعلیم کے لئے ایک مولوی صاحب مقرر کردیے جاتے تھے آپ نے بھی کتب متداولہ قصبہ کانٹ کے اُستادوں سے پڑھیں جو اس وقت ایک مردم خیز خطہ تھا۔

مسرور کو فارسی اور ہندی دونوں میں دستگاہ کامل تھی۔ مشہور ہے کہ ہندی زبان میں ساٹھ کتابیں لکھیں مگر آج دست بُرد زمانہ سے ایک کا بھی پتہ نہیں، ٹھیک نہیں کہا جا سکتا کہ فارسی میں کتنی کتابیں لکھیں مگر ترجمہ نوادر، دیوان فارسی، انشائے فارسی، افسانہ خوش سواد، بیاض مسرور آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ ان میں سے بعض ایسی کتابیں ہیں جنھیں تذکرہ نگاروں نے خود دیکھا ہے مگر اب اُن کا بھی پتہ نہیں۔ اس امر میں سب متفق ہیں کہ شاہجہاںپور میں شاعری کا رواج مسرور ہی کے دم سے ہوا۔ آپ نے ترسٹھ (۶۳) سال کی عمر پائی اور سنہ ۱۱۷۷ھ میں انتقال فرمایا۔ آپ کے پوتے سرور نے یہ تاریخ وفات لکھی:۔

مسرور کہ رفت زیں جہاں گزراں   بر اہل سخن ہزار غم بر دل و جان

گفتیم دو تاریخ وفاتش اینک افسوس سخنوران غم اہلِ جہاں

نمونۂ کلام اظہارِ بیتابی کے انداز کو ملاحظہ فرمائیے:-

تا خیالِ آتشیں روے مرا از تاب بُرد پارۂ از بیقراری ہائے من سیماب برد

تپِ دل کے دُور کرنے کے لئے نسخہ ملاحظہ فرمائیے:-

حلاوتِ سخن و ترشیِ جبینِ من برائے دفع تپ دل سکنجبین من

معشوق کے فراق میں دیکھنا بھی گناہ ہے، اس لئے کہ جو نگاہ اُس کے چہرے پر پڑ گئی اُسے دوسروں پر ڈالنا احترامِ دوست کے منافی ہے:-

بیا کہ بے رخِ خوبت گذشت ماہے چند ذخیرہ است بچشم من از نگاہے چند

اِس خیال کو کہ معشوق کے بغیر ہمارا وجود ناممکن ہے کس ندرت سے ظاہر فرمایا ہے

بدوریِ تو وجودم کجا نشاں دارد مگر صحیفۂ من خط توامان دارد

سبحان اللہ اس خط توام نے تو اس شعر میں جان ڈال دی۔

معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہانپور کو ابتدا ہی سے کبوتروں سے خاص تعلق ہے، مسرور کی تشبیہ ملاحظہ فرمائیے

تا بشوقِ قد و زلف تو بہ پرواز آمد دل کبوتر شد و یک نیز گرہ باز آمد

(۲) دیوان دولت رائے مبتہج

آپ کا اسمِ گرامی دولت رائے مبتہج تخلص ہے، کتبِ متداولہ کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ آپ نے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی اور شاعری کا ترکہ باپ سے پایا۔ کچھ فارسی غزلوں کی اصلاح اپنے پدر بزرگوار سے لی، اس کے بعد طبیعت خود استاد رہی۔ سن پیدایش آپ کا معلوم نہیں، سال وفات ۱۲۱۵ھ ہے۔ تاریخ وفات آپ کے فرزند مسرور نے کہی، مصرع تاریخ "شد رحیتہ سال فوت آں پاک رواں" ہے۔

آپ کا دیوان مکمل ہو چکا تھا، مگر اب تو نمونۂ کلام پیش کرنے کے لئے بھی اشعار نہیں ملتے، چند شعر جو حاصل ہوئے بطور یادگار درج ہیں:-

در ہجر تو دیدہ ام پر آب است دلِ خانہ بدوش چوں حباب است

دوسرے مصرع میں دل خانہ بدوش کو دیکھئے اور ندرتِ تشبیہ کی داد دیجئے

روئے چو گلش بہ یاد دارم ہر اشک بدیدہ ام گلاب است

اِس ندرت کو ملاحظہ فرمائیے کہ کس طرح اشک کو گلاب بنایا ہے۔ سنا ہے نورجہاں نے اپنے حمام میں گلاب کے پھول کو پانی پر تیرتا دیکھا اور پانی میں خوشبو محسوس کی۔ اس طرح اس کا ذہن عرقِ گلاب کی طرف پہونچا یہاں

مبتہج کی اڑان کو دیکھئے کہ گل عارض نے آنکھوں میں وہ اثر پیدا کیا کہ اشک گلاب ہو گیا۔ سبحان اللہ سبحان اللہ۔

مبالغہ ملاحظہ ہو:۔

امشب نگاہِ من رگِ یاقوت گشتہ است　　شاید کہ شد بہ لعل لبش چشم وا مرا

ذرا اس برات کو ملاحظہ فرمائیے:۔

نوشہ من زیبدم اندر براتِ عشق او　　تارہائے اشک گلگونم بر دیم سہرہ است

اشک کے تار کو کسی نے سہرے سے تشبیہ نہیں دی تھی، یہ مبتہج صاحب کا کمال ہے کہ اُسے سہرے سے تشبیہ دے کر نباہ بھی دیا۔

جز عشق تو پرساں ز دل زار کہ باشد　　جز درد و غمت محرم اسرار کہ باشد

جز فرقۂ طفلاں دلِ دیوانۂ مارا　　در کوچہ و بازار خریدار کہ باشد

اس خریدار کو ملاحظہ کیجئے اور داد دیجئے:۔

مبتہج را بصد قۂ دستار　　گل رخاں سر فراز باید کرد

عمرے گذشت ہائے عبث در دعا مرا　　آں بے وفا ندید ز چشم وفا مرا

ندرت کی شوخی ملاحظہ ہو:۔

نیست ایں رنگِ حنائے بر کفِ پائے کسے

فتنۂ خون منت اینجا کہ بر پائے کسے

(۳) سرور

آپ کا اسم گرامی بہت پرشاد اور تخلص سرور ہے۔ آپ کے والد کا نام دولت رائے ہے جن کا تخلص مبتہج تھا۔ آپ کے دادا سرور ایک بہترین شاعر گذرے ہیں۔ گویا شاعری کی دولت ورثہ میں ہاتھ آئی۔ علوم متداولہ اور فنِ شعر میں منشی عیوض رائے مسرت کے شاگرد تھے۔ طبیعت نہایت دراک پائی تھی، علاوہ شاعری کے آپ کو علم ریاضی میں ملکۂ تامہ تھا، اس فن میں آپ نے کئی کتابیں لکھیں، فن شعر میں منتخب البدائع مرتب ہو چکا تھا مگر اب اس کا کہیں پتہ نہیں۔ آپ نے شاہجہانپور پر بالخصوص اور تاریخ ادب پر بالعموم ایک تذکرہ مسمّٰی بہ شعرائے عجم و ہند لکھکر جو احسان کیا ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے، اگر وہ نہ ہوتا تو لوگ شعرائے شاہجہانپور سے ناواقف ہی رہتے آپ کو تاریخ گوئی میں خاص مہارت تھی، چنانچہ آپ نے ہر ایک ہمعصر کی تاریخ وفات لکھی، مگر افسوس ان کی تاریخ وفات کا پتہ نہیں۔ آپ کے فارسی کلام کا مجموعہ دیوان فارسی ترتیب پا چکا تھا مگر اب اس کا بھی کہیں پتہ نہیں۔

نمونۂ کلام　آپ نے اکثر اُستادوں کی طرحوں پر طبع آزمائی کی ہے، اسی سلسلے میں ایک غزل جس پر حافظ

اور حزیں وغیرہ نے غزلیں لکھی ہیں ناظرین کے سامنے پیش ہے ؎ سرور

سرور:۔ شبِ عید آمدہ مستاں در میخانہ زدند　　ماہ دیدند و نظر بر رخِ پیمانہ زدند

حافظ:۔ دوش دیدم کہ ملایک درِ میخانہ زدند　　گل آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند

دونوں اپنے اپنے رنگ میں فرد ہیں

سرور　شعلۂ آتشِ گل سوخت دلِ بلبل را　　آتشِ شمع اگر در سرِ پروانہ زدند

حافظ　آتش آں نیست کہ بر شعلۂ او خندد شمع　　آتش آنست کہ بر خرمنِ پروانہ زدند

حافظؒ نے پروانہ کے لئے جو رنگ اختیار کر لیا تھا، اس کے بعد اگر پروانہ کے قافیہ کے لئے کوئی اچھی صورت تھی تو یہی تھی جسے سرور نے اختیار کی۔

حافظ علیہ الرحمۃ نے ہفتاد و دو ملت کی جنگ دیکھکر فرمایا:۔

حافظ　جنگِ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ　　چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

سرور نے اِس جنگ کے مٹانے کی تدبیر پیش کی ہے:۔

سرور:۔ تا محبت نہ زند آب کجا بنشیند　　آتشِ فتنہ کہ در کعبہ و بتخانہ زدند

حافظ علیہ الرحمۃ نے اپنے خاص رنگ میں دیوانہ کے قافیہ کو باندھا اور اس کے بعد کوئی جگہ نہ چھوڑی

حافظ:۔ آسماں بارِ امانت نتوانست کشید　　قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

سرورِ غریب کی عالمِ بالا پر اُڑان کہاں اس لئے اس زمین کی بادشاہت تو چھین ہی لی:۔

سرور:۔ ملکِ صحرا ہمہ از قبضۂ مجنوں گیرم　　کز جنوں سکہ بنامِ منِ دیوانہ زدند

آخر میں فرماتے ہیں:۔

اے سرور ایں غزلت طرحِ حزیں و حافظ　　کاں دو سلطانِ سخن نوبتِ شاہانہ زدند

اب ہم مختلف اشعار مختلف جگہوں سے پیش کرتے ہیں، ملاحظہ ہو:۔

شب کہ در چشم خیالِ حسنِ آں گل پوش بود　　خونِ بلبل در رگِ تارنگہ در جوش بود

رعایات قابلِ ملاحظہ ہیں۔

صائب کا رنگ ملاحظہ ہو:۔

کند یکجا ہم یارانِ دور افتادہ را روزی　　لب و دست و زباں شامل بود بر وقت خوردنہا

(۴) منشی انَنت رام خاموش

اسم گرامی منشی اننت رام خاموش تخلص قوم کایستھ محلہ مسجد گنج شاہجہانپور کے رہنے والے تھے۔

علوم متداولہ میں مہارت تامہ حاصل تھی، ابتدائے سنِ شعور میں ایک صوفی گنگا رام کی نظر توجہ پڑی اور اپنا بنا لیا، ایک طوائف پر دل آگیا تھا جس کا نام بیجا تھا۔ متوکل اور قانع تھے۔ بیجا کے مرنے پر فرمایا:-

ہوشِ من از سر بکار عشق بیجا رفتہ است — خویش ازیں ویرانہ معمور بیجا رفتہ است

آپ کے کلام میں تصوف کی چاشنی زیادہ ہے۔ نمونۂ کلام:-

پر کار صفت در انتقال خویشم — سرگشتہ تراز وصال خویشم

آئینۂ حیرت خیال خویشم — خاموش زحسنِ ذوالجلال خویشم

زخاموشی بہ تنگ آمد دلم اے نالہ فریادے — زسوزِ حسن خاکستر شدم اے گریہ امدادے

مست چشمِ پر خمار یک پریزادے شدم — پائے بندے صد جنوں از سرو آزادے شدم

انتہائے رشک ملاحظہ ہو:-

نالہ را بر سر بام تو رسیدن ندہم — اشک را لذتِ راہِ تو چشیدن ندہم

(۵) فرحت

آپ کا اسم گرامی منشی رام کشن فرحت تخلص قوم کایستھ مسرور کے شاگرد تھے۔ فارسی علم ادب میں مہارت تامہ تھی۔ شاعری کے لحاظ سے اپنے ہمعصر شعرا میں ممتاز تھے۔ آپ نے فارسی میں مثنوی مظہر عشق اور فنِ خطاطی میں دو کتابیں نیرنگ سودا اور ارژنگِ سودا لکھیں، ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ۱۲۱۴ھ میں انتقال کیا۔

نمونۂ کلام ندرت تشبیہ ملاحظہ ہو:-

گلبن قامتش نگر، نرگسِ چشم مست ہم — ساقی دہر را بکف شیشہ یکے وجام دو

صنعت مراعاۃ النظیر و حسن تعلیل ملاحظہ فرمائیے:-

نمی دانم کدامی خوش قدے جا کرد در گلشن — کہ نخلِ بید مجنوں گشت شمشاد از طپید نہا

غالب نے کہا ہے:-

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسی رنگ — اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

فرحت صاحب اسی مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں:-

زہستیِ منِ دیوانہ تا نشانے ہست — صدائے سلسلہ و نالہ و فغانے ہست

(۶) لالہ مہتاب رائے رغبت

اسمِ گرامی لالہ مہتاب رائے تخلص رغبت، ناناہال میں پرورش و تعلیم پائی، اپنے ماموں مسرت کے شاگرد تھے، چونکہ ناناہالی اور دادیہالی دونوں خاندان تعلیم یافتہ تھے اس لئے جلد ہی تحصیلِ علم سے فراغت حاصل کرلی۔ تذکرۂ سرور میں ان کی انشا پردازی کی بہت تعریف لکھی ہے مگر آج تلاش کرنے پر بھی کسی کا پتہ نہیں صرف ایک شعر بطور یادگار دستیاب ہوا جو درج ہے ؎

نہ کنم گہے پریشاں پئے ہیچ کار خود را
مگر آں دو زلفِ مشکیں کہ بساخت مار خود را

(۷) ساقی

اسمِ گرامی لالہ موتی لال ساقی تخلص، شاہجہانپور کے قدیمی باشندے قوم کالیستھ محلہ تلیا گھورن میں مکان تھا، تذکرۂ سرور میں آپ کے حالات ملتے ہیں۔ علم اور کلام کے متعلق یہ تحریر ہے کہ "دریں ضعفِ پیری و کبرسنی نشہ جوانی اش ہمچناں باقی است و در تمہید سخن و تسوید عبارت و ترمیم علم سیاق و سیاق ماہر کامل بود" جیسا پرانے تذکرہ نویسوں کا قاعدہ تھا سرور نے بھی بہت کم تاریخ پیدائش اور دوسرے حالات درج کئے ہیں چنانچہ اُن کی بھی تاریخ پیدائش و وفات لامعلوم ہے۔

نمونۂ کلام رشک کے انداز کو ملاحظہ فرمائیے:۔

سیخواستم رسد بکف پائے آں صنم — آں رنگِ پاں کہ برلبِ جاناں رسیدہ ماند

رقیب کو کلاغ کس بہتر انداز سے بنایا ہے:۔

کے رقیب آگہ کند ما را ز تشریفِ صنم — دوستاں ہر شگوں گیری کلاغِ دیگر است
ایں مے و ساغر برائے دیگراں آوردہ اند — از برائے ستیم ساقی ایاغِ دیگر است

التماس ملاحظہ کیجئے:۔

مکن اسیرِ قفس چند روزاے صیاد — زغنچہ تاکہ بہ گلزار رنگ و بو دارد

اثر کرد است شاید دردمن برخاطرش ساقی — کہ عذر جور بیشیں را کنوں در ہر سخن دارد

(۸) نشاط

لالہ مہتاب چند نام اور نشاط تخلص تھا۔ ان کا حال بھی تذکرۂ سرور میں ہے تالیف تذکرہ کے وقت حیات تھے، مگر پھر بھی اُن کے متعلق کوئی معلومات نہیں، نہ سنِ پیدائش کا ذکر نہ سنِ وفات کا صرف اس سے

اتنا پتہ چلتا ہے کہ رنگیں خیال شاعر تھے۔

نموۂ کلام

مارا شہید کرد و قضا را بہانہ ساخت تیغ از میاں کشید و ادا را بہانہ ساخت

جاں بہ تنگ آمدہ از دردِ گرفتاریِ دل با اجل کاش رسد نوبتِ تیماریِ دل

ہمچو شاخیکہ ز بارِ ثمر افتد بہ زمیں زلف افتادہ بہ پائے تو ز بسیاریِ دل

دوسرے شعر میں صنعتِ حسن التعلیل قابل ملاحظہ ہے۔

(۹) مسرت

اسم گرامی منشی عیوض رائے مسرت تخلص قوم کایستھ محلہ مسجد گنج میں مکان تھا، ابتک اُسکی یادگار میں ایک ٹوٹا پھوٹا کھنڈر موجود ہے، آپ کے والد کا نام لالہ لالجی مل تھا۔ شیخ احمد خاں نثار کے شاگرد تھے۔ عربی و فارسی کی تکمیل اُنھیں سے کی نہایت ذہین اور ذکی تھے۔ آپ کی وجہ سے آپ کے اُستاد کا نام بھی روشن ہوا۔ آپ سے پہلے ایسا نازک خیال، نغز گفتار، پُرگو کوئی شاعر پیدا نہیں ہوا ایک نہیں کئی دیوان ترتیب دیے، اُستادوں کے قصائد کی شرحیں لکھیں، چنانچہ حکیم ثنائی کے قصائد کی ایسی شرح لکھی کہ لوگ حیرت میں پڑ گئے، مثلاً شعر ذیل کی تشریح میں مختلف اسلوب سے مختلف معنی پیدا کر دیے

در روشِ حسن و ناز ہست بسے خوش نما غمزہ بطرزِ ستم عشوہ بر نگِ جفا

امرائے دہلی اور لکھنؤ کی شان میں قصائد لکھے۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کو مسرت کے ماہر فن ہونے کا اعتراف تھا۔ مسرت نے آزاد کے پاس نیازمندانہ عریضہ بھیجا۔ جس میں حسب ذیل رُباعی تھی:۔

اے ذات تو مجمع صفات معنیٰ یعنی بصفات خویش ذات معنیٰ

صورت نگرفت دفترِ علم ہنوز گز خامہ رقم زدی برات معنیٰ

آزاد نے جواب میں لکھا:۔

کرد ارشاد بہ اہل سخن استادِ سخن بادشاہِ سخن است آنکہ دہد دادِ سخن

تو سخن سنجی و قدر تو سخنور داند کیست سنجیدہ بامثالِ تو اُستادِ سخن

مسرت کے کلام میں شوخی و صفائی کوٹ کوٹ کر بھری ہے، کلام پڑھتے جائیے اور لطف اُٹھاتے جائیے ثقالت نام کو نہ پائیں گے۔ ان کے کلام پر اہل زبان کا دھوکا ہوتا ہے۔ نواب جلال الدین مرزا مہدی علیخاں خلف نواب سعادت علی خاں مسرت کی قابلیت اور سخنوری کے بڑے قدرداں تھے۔ بارہا فنِ شعر اور

حل مطالب اشعار کے متعلق مسرت سے مشورہ کیا۔ میرزا نصیر الدین بھی اُن کے قدردانوں میں تھے چنانچہ اُنھیں اپنے علاقہ کا ضلعدار بنا دیا تھا۔ باوجود ان قدردانیوں کے تمام عمر فکر معاش میں سرگرداں رہے کہیں چین سے بسر نہ ہوئی، مگر اس میں اُن کی نازک فراجی کا بھی قصور تھا۔ ایک امیر کو لکھتے ہیں:۔

گردشِ دوراں زمقصودم جدا افگندہ است دستگیرم شوکہ گردونم زپا افگندہ است

از تو می باید کہ بازم جا دہی برجائے خویش از کجا ناسازیِ بختم کجا افگندہ است

ایک دوست کو اپنی بیکاری کی شکایت یوں لکھی ہے:۔

بشکستہ اند ہر سر مو از سرشت ما خط شکستہ بود مگر سرنوشت ما

چیزے بجا نماند زما بر سر زمیں بر داں فلک زجا ہمہ از خوب زشت ما

آپ کی تصانیف کی تعداد اٹھائیس تک بتائی جاتی ہے۔ فارسی کے دیوان میں بیس ہزار اشعار تھے قصائد ثنائی، قصائد عرفی۔ قران السعدین۔ دیوان ناصر علی سرہندی۔ دیوان زلالی۔ مثنوی علامہ عبد الجلیل بلگرامی کی شرحیں لکھیں۔ بہار دانش کو منظوم کیا۔ آفتاب مسرت۔ دیوان مسرت۔ باغ سلطان عطا شاہ منظوم جس میں سات سو اشعار تھے، یہ سب لکھیں، مرتب کیں مگر دست بُرد زمانہ سے آج کسی کا پتہ نہیں۔

آپ میں برجستگی بے انتہا تھی، اکثر قلم برداشتہ ایسا لکھتے کہ لوگ سوچ کر بھی نہیں لکھ سکتے۔ آپ کے دوست غلام حسین نے آپ کے پاس چار عدد گنّے بھیجے، شکریہ میں لکھتے ہیں: "در شکر عنایت رباعی شیریں افزا کہ در خامہ تحریر وصفش نیشکری انگشت نما است ایں رباعی شکر ریزکہ بشیرہ جانش پرداختہ اند حلاوت افزائے کام ودہاں دعائے ثنا است ؎

اے نیشکرِ تو داد داد دلہا شیرینیِ کام جاں ازو شد پیدا

باللہ نہ خود شکر زشیرینیِ خویش باہیچو نبات از نبا تست نما

زمانے نے اُن کی قدر نہ کی، مرزا عبد اللہ خاں کے انتقال کے بعد برابر پریشان رہے۔ مزاج میں افلاس اور ناداری نے چڑچڑاپن پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ مایوس ہو کر فرماتے ہیں:۔

قدرِ ہنر نماند مسرت دریں جہاں بیزارم از ہنر چہ ہنر آرزو کنم

۱۲۳۶ھ میں انتقال فرمایا، اُن کے شاگرد سرور نے تاریخ لکھی:۔

کجا مسرتِ افصح سواد درد آمیز سن ہزار و دو صد سی وشش وبال انگیز

بگذشت مسرت وغمش جاں گسل است چوں او نہ دگر صاحب علم و عمل است

جستم چو سن وفاتِ او از ہاتف گفتا کہ شہ سخنوراں بے بدل است

۱۲ ھ ۳۶

نمونۂ کلام مکمل غزل ملاحظہ فرمائیے:۔

از پیر و جواں شور تو لائے تو برخاست | برخیز کہ عالم بہ تمنائے تو برخاست
من سوختم از سوزِ غمِ عشق تو اول | از خانۂ دل آتشِ سودائے تو برخاست
تسبیح بکف دارم و زنار بہ گردن | ایں سلسلہ از زلف چلیپائے تو برخاست
یک نیزہ بلند از سرِ عشاق رود خوں | ایں فتنہ کہ از قامتِ رعنائے تو برخاست
نالیدنِ دلہا عجبے نیست مسرت | سوزِ عجبے از دلِ شیدائے تو برخاست

ایک ہی مضمون کو مختلف شعرا نے کس انداز میں ادا کیا ہے، ملاحظہ ہو:۔

مولانا رومی:۔ بے خطا می جست تیر از شست او | شستِ او شاگردِ چشمِ مست او
غلام جیلانی رفعت:۔ کے تواں جست از صفائے شست او | قبضہ می گیرد قضا از دست او
ہت پرشاد سرور: ساقی آمد جام مے در دست او | جام مے مستِ نگاہِ مست او
مسرت:۔ تیر او نازد بخویش از شست او | شست او قربان ناز دست او

ایک مکمل غزل اور ملاحظہ فرمائیے:۔

دل را بروں زسینہ برائے تو می کنم | خالی ز غیر پردہ سرائے تو می کنم
خود را ز چشم غیر نہاں می کنم ز ناز | روزیکہ یاد شرم و حیائے تو می کنم
ایں موجِ خوں نمی شود از مستہدم بلند | دستے بلند بہر دعائے تو می کنم

آخری شعر میں جو ندرت مسرت نے پیدا کی ہے کہیں دیکھنے میں نہیں آئی۔

توکل الی اللہ کی تعلیم ملاحظہ ہو:۔ رباعی

ہر چند بیکسی، بہ کسے التجا مکن | حاجت روائے خود بخدا جز خدا مکن
حاجت رواست یا ز چہ حاجت بری بہ غیر | ایں نا روا بخویش مسرت روا مکن

کمر کی نزاکت کو تمام لوگوں نے باندھا ہے، مگر مسرت کا رنگ دیکھئے:۔

فتد وقتِ تماشا اشتباہم | کمر یا سایۂ تارِ نگاہم

سُبحان اللہ سایۂ تارِ نگاہ سے کمر کی تشبیہ بالکل اچھوتی ہے۔

مسرت مطلع کا بادشاہ ہے، ملاحظہ ہو:۔

گردشِ چشمِ مست او رقص دہد پیالہ را | موئے کشاں ز جا برد زہد ہزار سالہ را

چند متفرق اشعار ملاحظہ فرمائیے جو مطالب، ندرتِ تشبیہ و حُسنِ تعلیل میں بے مثل ہیں

فارغ از رسم و رہِ گبر و مسلماں کردی　　اے جنوں گرد تو گردم کہ چہ احساں کردی
ز گریہ عرقم و در سینہ داغ می سوزم　　سنم کہ در دلِ دریا چراغ می سوزم
بے ریاضت نتواں شہرۂ آفاق شدن　　مہ چو لاغر شود انگشت نما می گرد
زلف را گفتم سیہ چونی بخود پیچید و گفت　　ہر کہ با خورشید بنشیند سیہ رنگش شود

از حکایت منظوم :-

شاہ پرسید از حکیم ہوشمند　　کز تو پرسم در جہاں آواز چند
گفت شاہا از ہمہ آواز ہا　　چار آواز آمدہ از بس پسند
قلقل بانگ صراحی چرچر سیخ کباب　　چم چم بوس و کنار و کشمکش شلوار بند

مسرت کے مشہور شاگرد سیو رام جوہر۔ لکھن لال بہجت بلگرامی۔ ہت ۔ سرور۔ خلیفہ سمیع اللہ مولوی فخر الدین احمد دہلوی۔ حکیم محمد شاہ عالم لکھنوی ہیں۔ اولاد کا سلسلہ موجود ہے۔ اُن کی غزلیات اور شرح ناصر علی سرہندی ابتک موجود ہے، اگر اس کی طباعت کی طرف توجہ نہ کی گئی تو یہ بھی فنا ہو جائیگی، کیونکہ فارسی کا دور گزر گیا اب تو اس کے سمجھنے والے بھی کم ہیں۔ ایک وقت وہ ہوگا کہ ردی خانے میں ردّیوں کے بھاؤ بیچ دی جائیں گی۔

(۱۰) محظوظ

آپ کا اسم گرامی لچھمی نراین عرفیت ماون لال اور محظوظ تخلص ہے۔ یہ مسرت کے صاحبزادے ہیں تعلیم و تربیت باپ نے کی، شاعری میں باپ کے شاگرد ہیں، تھوڑے دنوں تک سرکاری ملازمت بھی کی مگر جنون کی وجہ سے دست بردار ہونا پڑا، باپ کے علمی سرمایہ کو بھی جنون میں برباد کردیا، کافی عمر پاکر مرے جنون مرتے وقت تک نہ گیا۔ ایک مکمل غزل ملاحظہ ہو:-

چشمش بقتل عاشقاں باشد نہ تنہا یک طرف　　گیسو نگہ خنجر بکف مژگاں صف آرا یک طرف
بہر دلِ بیچارہ ام دارد نزاعے درمیاں　　ہندوئے خالش یک طرف زلف چلیپا یک طرف
آں گلعذار سرو قد چوں شد بہ گلشن جلوہ گر　　گل شد پشیماں یک طرف سرو قد آرا یک طرف
محظوظ از زلف و رخ آں دلربا در حیرتم　　شب جلوہ دارد یک طرف در جلوہ بیضا یک طرف
مردم و سوز غم عشقت نرفت از سینہ ام　　گردہ ام از داغ دل شمع مزار خویش را
ہر کہ بجام دل کند بادۂ دل کشائے او　　بر سر سنگ میزند جام جہاں نمائے او

راہِ کشمیر

(حضرت شادؔ عارفی)

ابر کے سقّوں نے دھویا جب رُخِ گرد و غبار — لے چلا کشمیر کی جانب مجھے شوقِ بہار
آکے اسٹیشن سے باہر، جائے پی کر گاؤں میں — چل دیا میں رات کے تاروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں
تھی ہوا ساکت، فضا خاموش لیکن دم بدم — بوٹ کی چرمر سے پیدا ہو رہا تھا زیر و بم
ماہِ کامل کی شعاعیں تھیں بہ رُجحانِ عجیب — پڑ رہا تھا میرا سایہ میرے قدموں کے قریب
رازِ پستی و بلندی آئینہ پاتا تھا میں — آ رہا تھا جادۂ کشمیر اور جاتا تھا میں

صبحِ کاذب کہر سا برسا گئی ہر چیز پر — بھینی بھینی سی طراوت چھا گئی ہر چیز پر
پھر سحر آئی دوشالا سر سے ڈھلکاتی ہوئی — عارضِ رنگینِ گل پر نور پھیلاتی ہوئی
شمعِ کافوری جلو میں، عود سلگائے ہوئے — سرخیاں لب پر، گلوری پان کی کھائے ہوئے
جب اُجالا ہو چکا، تاریکیاں جاتی رہیں — خندۂ گل کی صدائیں کان میں آتی رہیں
مور، اونچی ٹیکری پر، دُم کو کھولے رقص میں — اور سڑک کے داہنے بائیں کچھ ممولے رقص میں
سرو پر قمری کی تانیں، تار پر شاما کی ریز — جنتِ گوشِ سماعت، روح پرور لطف خیز

اس توقع پر، نشاں کشمیر کے آئیں نظر — میں نے دوڑایا نگاہوں کو بلندی پر، مگر
قلزمِ گُل میں جہاں تک کام کرتی تھی نگاہ — دوڑتی جاتی تھی تا حدِ نظر، پُرپیچ راہ
ایک ناگن تھی کہ گلزاروں میں بل کھاتی ہوئی — تلملاتی خاک پر، سبزہ پہ لہراتی ہوئی
موڑ پر رُکتی ہوئی، تھم تھم کے خم کھاتی ہوئی — رہرووں کو، گل بہ کفِ آئینہ، دکھلاتی ہوئی
ابر کے سایوں میں چھپتی، دھوپ سے بچتی ہوئی — ٹھوکریں کھاتی، سنبھلتی، اینڈتی، بجتی ہوئی
جھلملاتی، رینگتی، چڑھتی۔ مچلتی۔ کانپتی — دوڑتی، تھک کر ٹھہرتی، سانس لیتی، ہانپتی

پُل کے نیچے خندقوں کو جھانک کر ہٹتی ہوئی
اونچے اونچے سخت دِل ٹیلوں سے کچھ کٹتی ہوئی
چوٹیوں سے تنگ آجانے پہ سر دُھنتی ہوئی
ہر مسافر سے طوالت کے گِلے سُنتی ہوئی
کُنج سے مِلتی ہوئی، غاروں سے کتراتی ہوئی
پَے بہ پَے منزل بہ منزل ۔ شان دکھلاتی ہوئی

عین ممکن ہے یہ ہو وہ راہِ گلزارِ خلیل
عہدِ حاضر نے سجائے جس پہ کھمبے ۔ تار ۔ میل
یا یہ وہ دلکش روش ہے کوہِ گردوں بوس پر
مشتمل ہے جس کا اِک اِک دَور سَو سَو کوس پر
دھان کے کھیتوں کی یا وہ مینڈ ہے دیہات میں
دُوب نے چادر اُڑھا دی ہے جسے برسات میں
خشک ہو کر رہ گئی یا جوئے شیرِ بے عدیل
مصر کے دامن میں یا پایاب ہے دریائے نیل
کوہِ ہندوکش کی یا پگڈنڈی مگر آساں گزار
ڈھال خیبر کے درہ کا، جاں فزا و اُستوار
وادیوں میں "چشمۂ حیواں" مگر ٹھہرا ہوا
سیب و خوبانی کا مسکن "تاک" کی عشرت سرا

صانعِ قدرت کی صنعت جادۂ کشمیر ہے
کہکشاں کا عکس "آڑی مانگ" کی تصویر ہے

غزل

(نواب محمد علی خاں عرف آغا علی خاں صاحب اسپشل مجسٹریٹ الہ آباد)

کتنا چھلکا یا مری روح کے پیمانے کو
حسن آباد رکھے آپ کے میخانے کو
دیکھکر مست ہوئے بزم میں سب بادہ پرست
دست ساقی میں چھلکتے ہوئے پیمانے کو
رحم کر رحم، کہیں قیس کی وحشت کی طرح
پچھلی تاریخ نہ دُہرائے اُس افسانے کو
ذرّے ذرّے پہ اُبھر آئیں گے عبرت کے نقوش
غور سے دیکھے جو کوئی کسی ویرانے کو
بزم میں قلبِ شکستہ کی بڑھیگی رونق
حسن ہی جوڑے گا ٹوٹے ہوئے پیمانے کو
اُس کے ہر لفظ سے مِل جائیگا درسِ الفت
ہوش میں لائے تو کوئی ترے دیوانے کو
بے پیئے لغزشِ مستانہ دکھانے کے لئے
ہاتھ سے چھوڑ دیا شوخ نے پیمانے کو
اُٹھیئے در پیش ہے اب آپکی عزت کا سوال
پا بزنجیر لئے جاتے ہیں دیوانے کو
راستہ حسن کی منزل کا دکھانے کیلئے
عشق کی شمع نے روشن کیا بُتخانے کو
اس قدر جوشِ محبت میں بڑھا لطفِ جنوں
عمر بھر ہوش نہ آیا ترے دیوانے کو
حسن نے آتشِ الفت کو جو روشن دیکھا
لے لیا گود میں جلتے ہوئے پروانے کو
تم کو مجبور نظر آئیگا حسنِ رنگیں
غور سے دیکھو تو پھر جاکے صنم خانے کو

تذکرہ آبِ حیات

جدید تحقیق و تنقید کی روشنی میں

(از مولوی مبشر علی صاحب ایم ۔ اے)

محمد حسین آزاد کا نام اُردو ادب میں "آبِ حیات" اور "نیرنگِ خیال" کے مصنف کی حیثیت سے زندہ ہے۔ اُن کی دوسری تصانیف اُن کے نام کی وجہ سے زندہ ہیں۔ موجودہ دَور تنقید کا دَور ہے، اور "آبِ حیات" پر جدید تحقیقات کی روشنی میں جو کچھ اعتراضات کئے گئے ہیں وہ ایک حد تک حقیقت پر مبنی ہیں۔ اس کے باوجود آبِ حیات کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آیا، جو اس کی کامیابی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

یہ اُردو شعرا، کا صرف ایک تذکرہ ہی نہیں ہے بلکہ اس عہد کی جیتی جاگتی تصویر ہے، اس لئے اگر ہم اسے اُردو نظم کی پہلی تاریخ کہیں تو بجا ہے۔ اِس سے قبل اُردو شعراء کے بہت سے تذکرے لکھے گئے جن میں عموماً شاعر کے نام اور ولدیت اور اُس کے کلام پر اچھا یا بُرا ہونے کا فیصلہ صادر کرنے پر اکتفا کیا جاتا تھا۔ اُردو شعراء کا سب سے پہلا تذکرہ راقم کے خیال میں سراج الدین علی خاں کا ہے جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے، اور آخری نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کا "گلشنِ بیخار" ہے جو مطبوعہ صورت میں بھی دستیاب ہوتا ہے۔ یہ تذکرے فارسی میں لکھے جاتے تھے اور کلام کا نمونہ نہیں بلکہ خاصا انتخاب پیش کیا جاتا تھا۔ تنقید کا فن زمانۂ جدید کی پیداوار ہے اور ہمیں ان تذکروں کو جدید تنقید کی روشنی میں نہیں دیکھنا چاہیئے۔ ان میں تاریخی مواد، شاعر کے ماحول کی کیفیت، اس کی شاعری کی خاص خصوصیات، معاصرین پر اس کا اثر، ان باتوں پر کوئی توجہ نہ کی جاتی تھی "آبِ حیات" اُردو نظم کی پہلی تحقیقی و تنقیدی تاریخ ہے جس میں جدید اُصولوں کو مدِنظر رکھا گیا ہے۔ اسی لئے اُردو ادب کی تاریخوں میں اس نے سنگِ راہ کا کام دیا ہے۔ آزاد کے بے نظیر اسلوب بیان نے آبِ حیات میں وہ خیالی طوطا مینا اُڑائے ہیں کہ بعض ناقدوں کے نزدیک "آبِ حیات" کا قصہ افسانہ ہو کر رہ گیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں "آبحیات" پر مختلف زاویۂ خیال سے اعتراضات کئے گئے ہیں لیکن اُردو ادب کی ہر تاریخ لکھنے والا اس کا حوالہ ضرور دیتا ہے۔ حکیم عبدالحیٔ نے "آبِ حیات" کے جواب میں "گلِ رعنا" لکھی، لیکن وہ تردید کے جوش میں ایسی ایسی معمولی باتوں کی تحقیق پر اتر آئے جن کا بیان نہ کرنا ہی بہتر تھا۔ مثلاً ناسخ کے خانگی

حالات کے ضمن میں آزاد نے لکھا ہے کہ وہ خانگی زندگی کے جنجال سے بری تھے اور اُن کے کوئی لڑکا نہ تھا، لیکن صاحب "گل رعنا" نے یہ ثابت کیا ہے کہ اُن کے لڑکے تھے۔ اسی طرح اشرف علی خاں فغاں کے بیان میں آزاد لکھتے ہیں کہ "شجاع الدولہ نے اختلاط میں اُن کے بدن کا کپڑا جلا دیا۔" لیکن صاحب گل رعنا مُصر ہیں کہ کپڑا نہیں بلکہ ہاتھ جلا دیا۔ اسی طرح آزاد نے مرزا مظہر کے بیان میں آبخورہ کا جو واقعہ لکھا ہے صاحب گل رعنا کو اُس سے اتفاق نہیں۔ بہرکیف یہ ایسی باتیں ہیں جو نظر انداز کرنے کے قابل ہیں۔ آزاد کے پیش نظر آبحیات لکھتے وقت متعدد دیوان اور تذکرے تھے لیکن وہ چند ایسے تذکروں کا بھی ذکر کر گئے ہیں جو اُن کی نظر سے بالکل نہیں گزرے تھے۔ میر کا "نکات الشعرا" آزاد نے غالباً نہیں دیکھا تھا "آب حیات" کا خاص تحقیقی ماخذ قدرت اللہ کا "مجموعۂ نغز" ہے۔ چنانچہ "آب حیات" کی بیشتر تحقیقی غلطیاں وہ ہیں جو "مجموعۂ نغز" میں پائی جاتی ہیں۔

آب حیات" کی خامیاں دو قسم کی ہیں، یعنی تحقیقی اور تنقیدی۔ ہم ذیل میں ہر ایک پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہیں۔ تحقیقی خامیاں یہ ہیں:۔

(۱) اُردو کی ابتدا آزاد گنگا و جمنا کے دوآبہ میں مسلمانوں کی آمد کے وقت سے بتاتے ہیں، یہ ایک حد تک درست بھی ہے۔ لیکن اُنھوں نے دکن میں اُردو کی ابتدا و نشو و نما کا ذکر محض ضمنی طور پر کیا ہے۔ غالباً انھیں اس کے متعلق زیادہ معلومات فراہم نہ ہو سکیں۔ دکنی شعرا میں صرف ولی کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔ موجودہ تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اُردو نے شمال میں پہلی مرتبہ ظہور کیا لیکن دکن میں اس نے شمال سے بہت پہلے ادبی و تصنیفی شکل اختیار کر لی تھی۔ آزاد غالباً نصرتی، سراج، غرلت، آزاد، عاجز وغیرہ سے واقف نہ تھے۔

(۲) آزاد "خالق باری" امیر خسرو کی تصنیف بتاتے ہیں۔ حال میں محمود شیرانی نے اپنے ایک مضمون میں ثابت کیا ہے کہ یہ امیر خسرو کی تصنیف نہیں بلکہ کسی اور بزرگ کی کاوش کا نتیجہ ہے۔

(۳) اُردو نثر کی ابتدا آزاد فضلی کی "دہ مجلس" سے بتاتے ہیں۔ جدید تحقیقات کی رو سے اُردو کے ابتدائی فقرے صوفیائے کرام کے دہن مبارک سے ادا ہوئے۔ بعض کے اقوال کا مجموعہ بھی موجود ہے۔ بابا فرید شکر گنج پہلے صوفی ہیں جنھوں نے اُردو نثر کے ابتدائی فقرے اپنے عقیدت مندوں سے گفتگو میں استعمال کئے۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی "معراج العاشقین" اُردو نثر کی پہلی کتاب ہے۔

(۴) آزاد نے آب حیات" میں میر اثر محمد حسین کلیم، قائم، یقین، ہدایت، حزیں، بیان اور بیدار جیسے کہنہ مشق شعرا کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ایک جگہ قائم کے متعلق لکھتے ہیں کہ "ان کا دیوان ہرگز میر و میرزا کے نیچے نہیں رکھ سکتے" لیکن معلوم نہیں ان کو شعرا کی فہرست میں کیوں نہیں شامل کیا گیا۔

(۵) ولی کو آزاد اُردو شاعری کا باوا آدم تصور کرتے ہیں۔ "آبحیات" میں لکھا ہے "اُردو میں اِن کو وہ

رتبہ حاصل ہے جو انگریزی کی نظم میں چاسر کو، فارسی میں رودکی اور عربی میں مہلہل کو حاصل ہے۔" اور یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ ولی سے بہت پہلے دکن میں اُردو شاعری کا آغاز ہو چکا تھا۔ شمال میں بھی امیر خسرو نے دوہروں کی شکل میں اشعار کہنا شروع کر دیئے تھے۔ پہلا صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ ہے۔ ایسی صورت میں ہم ولی کو اُردو شاعری کا باوا آدم کیسے مان سکتے ہیں۔

آزاد کی دوسری غلطی یہ ہے کہ وہ ولی کو گجرات کا رہنے والا بتاتے ہیں، مگر اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی ہے کہ ولی اورنگ آباد کے رہنے والے تھے۔

(۶) اشرف علی خاں فغاں کو آزاد نے قزلباش خاں اُمید کا شاگرد بتایا ہے، میر تقی میر نے بھی "نکات الشعراء" میں فغاں کو اُمید کا شاگرد لکھا ہے۔ لیکن صاحبِ "گلِ رعنا" نے مصحفی کے تذکرے کے حوالے سے اُنھیں علی قلی ندیم کا شاگرد تسلیم کیا ہے۔

(۷) مرزا مظہر جانِ جاں[۱] کے متعلق آزاد نے "آبحیات" میں لکھا ہے کہ اُن کے بعض واقعات کے متعلق "تہذیب آنکھ دکھاتی ہے"۔ آزاد کا خیال ہے کہ اُنھوں نے ایک دھوبن گھر میں ڈال لی تھی۔ آزاد نے عبدالحیٔ تاباں اور مرزا مظہر کے تعلقات کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھا ہے۔ ہمیں کوئی شہادت ایسی نہیں ملتی جو ان واقعات کی تصدیق کر سکے۔ اس لئے اس کو آزاد کی رنگیں بیانی کے سوائے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

(۸) مرزا رفیع سودا کے متعلق آزاد "آبحیات" میں لکھتے ہیں "۱۱۸۵ھ میں لکھنؤ پہونچے، نواب شجاع الدولہ نے بے تکلفی سے یا طنز سے کہا کہ مرزا تمھاری وہ رباعی ابتک میرے دل پر نقش ہے۔ یہ پاسِ وضعداری پھر دربار میں نہ گئے۔

شیخ چاند نے اس سلسلہ میں اپنی مشہور کتاب "سودا" میں لکھا ہے کہ شجاع الدولہ فیض آباد میں رہتے تھے نہ کہ لکھنؤ میں۔ سب سے پہلے آصف الدولہ نے فیض آباد چھوڑ کر لکھنؤ کو دارالسلطنت قرار دیا، لہٰذا سودا فیض آباد گئے تھے نہ کہ لکھنؤ۔ ان کے کلیات نظم میں متعدد قصیدے شجاع الدولہ کی شان میں ملتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نواب کی وفات تک فیض آباد میں رہے۔ آزاد نے سودا کے دہلی کے قدر دانوں میں مہربان خاں رند کا نام لکھا ہے۔ یہ صحیح نہیں کیونکہ مہربان خاں رند فیض آباد میں دیوان تھے اور دہلی میں نہ رہتے تھے۔

(۹) میر تقی میر کے متعلق آزاد کا خیال ہے کہ وہ بہت نازک مزاج بلکہ ایک حد تک بد دماغ تھے، اور کسی کو

---

[۱] مرزا کا پورا نام مرزا مظہر جانِ جاں تھا، جانجاناں غلط ہے۔ بیشتر اُردو ادب کی تاریخوں میں جان جاناں لکھا ہے عوام میں بھی یہی مشہور ہے۔ لیکن یہ "جانِ جاں" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ میر تقی میر نے "نکات الشعراء" میں "جانِ جاں" ہی لکھا ہے۔

خاطر میں نہ لاتے تھے۔ آزاد نے میر صاحب کی اور خان آرزو کی کشیدگی کا ذکر بڑے مزے لے کر بیان کیا ہے
صاحبِ گلِ رعنا نے اس کشیدگی کی تردید کرنے کی کوشش کی ہے اور ثبوت میں میر کی ان سطور کو پیش کیا ہے
جو اُنھوں نے خانِ آرزو کے متعلق "نکات الشعرا" میں لکھی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صاحب گلِ رعنا کی
نظر میں غالباً "ذکرِ میر" نہ تھی۔ مولوی عبدالحق صاحب اس سلسلہ میں "ذکرِ میر" کے مقدمے میں لکھتے ہیں
کہ ہمیں اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خان آرزو اور میر صاحب کے تعلقات واقعی کشیدہ تھے
آزاد نے "آبحیات" میں صحیح لکھا ہے۔ بات یہ ہے کہ میر صاحب کا خیال تھا کہ "نکات الشعرا" ایک عام
کتاب ہے، عوام کی نظر سے گذریگی اس لئے اُنھوں نے ذاتی تعلقات کو اس میں دخل نہیں دیا "ذکرِ میر"
ان کی خود نوشت سوانح عمری تھی، اس میں وہ دل کی بات نہ چھپا سکے اور اصل واقعات من وعن
بیان کر دیئے۔

آزاد میر کے والد کا نام غلط بتاتے ہیں "ذکرِ میر" میں میر صاحب نے اپنے والد کا نام میر متقی
لکھا ہے۔ آزاد لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ نواب سعادت علی خاں سڑک پر مع انشا کے گذرے۔ میر صاحب
بھی ایک طرف سیڑھیوں پر کھڑے ہوئے تھے۔ وہ نواب کی طرف بالکل متوجہ نہ ہوئے۔ انشا نے نواب
سے کہا کہ ابتک ان کی نازک مزاجی کی یہ حالت ہے۔ غالباً آج بھی فاقے سے ہونگے۔ اس پر نواب
نے ان کو طلب کیا لیکن وہ نہیں گئے۔ انشا اس کے بعد خود آئے۔ نواب کی عطا کی ہوئی خلعت اور
روپیہ وغیرہ میر صاحب کو مجبور کر کے دیا۔ کسی تذکرے میں اس کا حوالہ نہیں اور بقول صاحبِ گلِ رعنا
یہ آزاد کی من گھڑت معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح آزاد ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ نواب نے میر صاحب کی
تنخواہ بند کر دی تھی۔ لیکن مرزا علی لطف مصنف "گلشنِ ہند" کا خیال ہے کہ ان کی تنخواہ بند نہیں ہوئی تھی
اسی طرح نواب کی سواری کا گزرنا اور اُن کا میر صاحب سے یہ فرمانا کہ "تم اب ہمارے یہاں نہیں آتے"
اور اس پر میر صاحب کا یہ جواب دینا کہ "راستہ میں بات چیت کرنا شریفوں کا شیوہ نہیں" محض آزاد
کی رنگیں بیانی معلوم ہوتی ہے۔ کسی تذکرے میں اس کا حوالہ نہیں ملتا۔ میر صاحب کے مشہور تذکرے
"نکات الشعرا"[۵] پر آزاد نے متعدد اعتراضات کئے ہیں۔ ہم یہاں صرف تحقیقی اعتراضات پر روشنی ڈالتے ہیں

---

۵ نکات الشعرا ۱۰۷ صفحہ کا ایک مختصر تذکرہ ہے، فارسی میں ریختہ گو شاعروں کے متعلق لکھا گیا ہے۔ ابتدا میں ہر شاعر کے
متعلق چند سطور تعارف کے طور پر ملتے ہیں۔ شعرا کے کلام پر بے لاگ رائے دی گئی ہے۔ کسی کی بیجا طرفداری یا مخالفت
نہیں کی گئی ہے۔ اشعار کے انتخاب میں نیاضی سے کام لیا گیا ہے جو اُس زمانہ کے تذکروں کا طرۂ امتیاز تھی
جہاں اشعار دستیاب نہیں ہوئے ہیں مجبوری ظاہر کی گئی ہے۔ کل شعرا کی تعداد ۱۰۲ ہے۔ جن میں ۳۲
دکنی و گجراتی ہیں۔

آزاد لکھتے ہیں کہ (۱) میر صاحب نے "نکات الشعراء" کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ یہ اُردو شعراء کا پہلا تذکرہ ہے اس میں ایک ہزار شاعروں کا احوال ہوگا، لیکن کوئی غریب اعتراضات سے نہیں بچا۔" (۲) میر صاحب نے وَلی کے متعلق لکھا ہے کہ "ولے شاعریست از شیطان مشہور تر"۔ نکات الشعراء کے دیباچہ میں کہیں یہ نہیں لکھا ہے کہ یہ اُردو شعراء کا پہلا تذکرہ ہے، اور اس میں ایک ہزار شاعروں کا احوال ہوگا۔ وَلی کے متعلق بھی آزاد کا یہ مشہور جملہ "نکات الشعراء" میں نظر نہیں آیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کی نظر سے "نکات الشعراء" بالکل نہیں گزری، اور اُنھوں نے خیالی طوطا مینا اُڑائے ہیں۔

(۱۰) خواجہ میر درد کے متعلق آزاد لکھتے ہیں کہ میر نے ان کو آدھا شاعر مانا ہے۔ لیکن "نکات الشعراء" میں اس کا کہیں پتہ نہیں۔

(۱۱) اسی طرح میر سوز کو آزاد کے قول کے مطابق میر صاحب نے پاؤ شاعر مانا ہے۔ یہ درست نہیں۔ میر صاحب لکھتے ہیں کہ "ہر چند طرز علیحدہ دارد۔"

(۱۲) آزاد میر حسن کو جب تک وہ دہلی میں مقیم رہے اُن کے والد میر ضاحک اور خواجہ میر درد کا شاگرد بتاتے ہیں۔ جب اودھ میں گئے تو سودا اور ضیاء الدین ضیا کے شاگرد ہوئے۔ میر حسن اپنے تذکرے میں خود اپنے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ ضیاء الدین ضیا کے شاگرد ہیں۔

(۱۳) آزاد نے انشا کے مجنون ہونے اور وفات پانے کی بڑی دردناک تصویر کھینچی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ آخر میں اُن کی تنخواہ بند ہوگئی تھی۔ صاحبِ "گل رعنا" انشا کے نواسے مرزا آوج کا حوالہ دیتے ہوئے اسکی تردید کرتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ انشا نہ مجنون ہوئے تھے اور نہ اُن کی تنخواہ بند کی گئی تھی۔ بہرکیف اس معاملہ میں نواسے کی رائے کو آزاد کی رائے پر ترجیح دی جائیگی۔

(۱۴) مومن جیسے اعلےٰ پایہ کے شاعر کو آزاد "آبحیات" کے دوسرے اڈیشن میں شامل کرتے ہیں۔

(۱۵) انشا اور مصحفی کے معرکوں کو آزاد نے ایک افسانہ بنا دیا ہے۔

آزاد کی تنقیدی خامیاں ہمارے خیال میں حسب ذیل ہیں:-

(۱) میر صاحب کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ شاعری کو صرف دلّی والوں کا حق سمجھتے تھے، اور لکھنؤ والوں کو اپنا کلام نہیں سُنایا کرتے تھے۔ وہ خواجہ حافظ اور سعدی کی شاعری کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ میر سوز کو میر صاحب کی وجہ سے اپنا تخلص مجبوراً چھوڑنا پڑا۔ "ذکر میر" اور "نکات الشعراء" کے مطالعہ سے میر صاحب کے کردار پر اچھی روشنی پڑتی ہے، وہ نیک منصف اور حقیقی شاعری کے قدردان تھے۔ اُنھوں نے اچھے اشعار پر داد دینے میں کبھی بخل نہیں کیا۔ دلّی اور لکھنؤ میں امتیاز نہیں کیا بلکہ ہمیشہ کلام کی خوبی کو دیکھا۔ یہ ضرورت ہے کہ

اُن کا معیار بلند تھا۔ اُنھوں نے اپنے معاصرین اور شاگردوں کے اچھے اشعار کی جا بجا تعریف کی ہے۔ وہ اساتذہ کی شاعری کو عزّت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہ کہنا بھی کہ وہ حافظ اور سعدی کی شاعری کو خاطر میں نہیں لاتے تھے میر صاحب پر سراسر بہتان ہے۔ وہ نازک مزاج ضرور تھے لیکن انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پاتا تھا۔ میر سوز نے یہ سمجھکر کہیں اُن کے اچھے اشعار بھی میر صاحب کی طرف منسوب نہ کئے جائیں سوز تخلص اختیار کیا۔ اس میں میر صاحب کا کیا قصور ہے۔

(۲) آزاد نے مرزا مظہر جانِ جاں کی شاعری کا اردو نظم میں صحیح درجہ متعین نہیں کیا۔ مظہر متقدمین میں پہلے شاعر تھے جنھوں نے ہندی دُہروں کو ترک کر کے عربی اور فارسی الفاظ کا استعمال کیا۔ اُردو شاعری کے نشوو نما میں اُن کا کارنامہ بہت اہم ہے۔

(۳) آزاد نے اپنے استاد کے ساتھ "آبحیات" میں جس عقیدتمندی کا اظہار کیا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ ذوق کی بیجا تعریف سے آزاد کی تنقید پر حرف آتا ہے، کیونکہ حقِ شاگردی کے جوش میں وہ حقیقت سے دُور جا پڑے ہیں۔

(۴) آزاد نے سب سے زیادہ بے انصافی ظفر کے ساتھ کی ہے، یعنی ان کا بیشتر کلام اُستاد ذوق کا بتایا ہے۔ جدید تنقید نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ظفر کے کلام کا رنگ ذوق کے کلام سے بالکل جدا ہے ظفر خود ایک قادر الکلام شاعر تھے اور ایک مخصوص رنگ کے مالک۔ یہ ضرور ہے کہ ذوق نے بحیثیت اُستاد اُن کی بعض غزلوں میں اصلاح ضرور دی ہو گی۔

(۵) آزاد نے انشا کو مصحفی پر ترجیح دینے کی کوشش کی ہے۔ انشا کی قادر الکلامی میں کلام نہیں، لیکن آزاد کی تنقید سے مصحفی کی شاعرانہ عظمت پر اثر پڑتا ہے۔ مصحفی دورِ متوسطین کے ایک مشہور شاعر تھے اور اُن کے متعدد دیوان اُردو شاعری میں اُن کی جگہ ہمیشہ قائم رکھیں گے۔

"نکات الشعرا" میر کے عہد شباب کی تالیف ہے۔ تحقیق کا جہاں تک تعلق ہے میر صاحب نے کوشش کی ہے کہ کوئی بات سُنی سُنائی اور محض قیاس کر کے نہ لکھی جائے۔ نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمٰن شیروانی اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ "نکات الشعرا اگرچہ شعرا کا تذکرہ ہے کوئی تاریخی کتاب نہیں ہے۔ تاہم میر صاحب نے یہ التزام کیا ہے کہ جو واقعہ تحقیق نہو اُس کو نہ لکھیں، یا (اگر کسی وجہ سے لکھیں تو) اس کو غیر محقق ہونا ظاہر کر دیں۔ جن شعراء کا حال معلوم نہ تھا وہاں صاف لکھدیا ہے کہ ان کا حال ہم کو معلوم نہیں۔ میر صاحب نے ہماری رائے میں کمال انصاف سے کام لیا ہے اپنی بے لاگ رائے دینے میں کبھی چُوکے نہیں ہیں۔ اُنھوں نے تعلقات دوستی، شاگردی غرض کسی چیز کا خیال نہیں کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں اُن کی رائے جو اُنھوں نے ثاقب۔ حاتم۔ یقین اور تاباں کے کلام پر دی ہے ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ میر سجاد حالانکہ اُن کے سامنے کے صاحبزادے ہیں لیکن اُن کے اچھے اشعار پر میر صاحب داد دینے سے گریز نہیں کرتے۔ اُن کے اِس شعر کی نکات الشعرا میں بہت تعریف کی ہے:-

عشق کی ناوَ پار کیا ہووے جو یہ کشتی تری تو بس ڈوبی

اِن خامیوں سے قطع نظر "آب حیات" میں چند خوبیاں ایسی ہیں جن سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اُردو کی ابتدا کے سلسلہ میں آزاد کے بیان کو (حالانکہ وہ مکمل نہیں ہے) ہمیشہ بڑی اہمیت حاصل رہیگی۔ آزاد نے شعرا کے کلام کے انتخاب کا جو طریقہ پیش نظر رکھا تھا وہ بہت مناسب ہے۔ اُنھوں نے مختلف اشعار جگہ جگہ سے انتخاب نہیں کئے ہیں بلکہ چند مکمل غزلیں درج کر دی ہیں۔ اس سے شاعر کے کلام کے متعلق آسانی کے ساتھ رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ شاعر کے اچھے اشعار کے علاوہ اس کے پست اشعار بھی سامنے آجاتے ہیں۔ موجودہ نقّاد اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ مکمل مضمون یا نظم تنقید کے آئینے کے سامنے لائی جائے تو اچھا ہے۔

بہرحال "آب حیات" اُردو نظم کی تاریخ ہے۔ اور تاریخ کا افسانہ کے پیرایہ میں بیان کرنا ناظرین کی دلچسپی قائم رکھنے کے لئے ضروری تھا۔ آزاد کے بے نظیر اسلوب نے واقعی تاریخ میں افسانہ کا رنگ پیدا کر دیا ہے۔ ہندی افادی مرحوم نے آزاد کے متعلق خوب لکھا ہے کہ "پروفیسر آزاد ہی صرف وہ انشا پرداز ہیں جنھیں اور کسی سہارے کی ضرورت نہیں"۔

غرض "آبحیات" کی ادبی اور تنقیدی اہمیت مسلّمہ ہے۔ آزاد کی تنقید سے بیشتر اور تحقیق سے کم تر اتفاق کیا جائیگا۔ اور تمہید میں اُنھوں نے بھاشا کا جو اثر اُردو پر دکھایا ہے اور جو لسانیاتی بحث کی ہے وہ ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ ولی اور سودا کے متعلق اُن کی تنقید ان شعرا پر ریسرچ کرنے والوں کی رہنمائی کرے گی۔ بقول سر تیج بہادر سپرو یہ اُردو کی ایک کلاسیکل کتاب ہے جس کی ضرورت ہر زمانہ میں رہیگی خواہ دنیا کتنی ہی ترقی کر جائے۔ آئندہ آنیوالی نسلیں بھی اس کی اسی طرح قدر کرتی رہیں گی اور بقائے دوام کے دربار میں آزاد کی جگہ متعین کرنے کے لئے یہ کتاب کافی ہے۔

پچھلی کل ہند اُردو کانفرنس کے خاص خاص اراکین بیگم اعزاز رسول صاحبہ صدر کمیٹی استقبالیہ اور سر شیخ عبدالقادر صاحب پریسیڈنٹ کانفرنس نے رسالہ "زمانہ" کی ادبی خدمات کا حوصلہ افزا الفاظ میں اعتراف کیا، اور اسکے مستقل معیار کو سراہا۔ آپ بھی اس ناچیز پرچے کی قدر کرتے ہیں لیکن کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ اس کے توسیع اشاعت کی بھی کچھ کوشش فرمائیں اور اس طرح اس کے آئندہ بقا اور ترقی میں مدد دیں۔ عام طور پر دوستوں کو تکلیف دینا کوئی پسند نہیں کرتا لیکن اس وقت "زمانہ" کی آئندہ زندگی کا اسی پر انحصار ہے کہ اس کے قدردان اپنے علم دوست احباب سے اسکے خریداری کی سفارش کریں۔ اگر آپ چاہیں تو دو ایک نئے خریدار ضرور دے سکتے ہیں۔ پھر کیا آپ اس طرف توجہ فرما کر اس علمی خدمت کو مزید سرگرمی سے جاری رکھنے میں ہماری امداد کریں گے؟

ایڈیٹر

ہم شکرگذار ہوں گے اگر آپ اپنے علم احباب کے نام نامی سے ہمکو مطلع کرنے کی تکلیف گوارا کریں تاکہ منیجر رسالہ ان حضرات کے پاس نمونہ کا پرچہ بھیج کر اُن سے خریداری کی تحریک کر سکے۔

حمدِ باری

(از سیّد قایم رضا صاحب نسیم)

کیا حمد ہو اس کی جو نہاں ہے نہ عیاں ہے اللہ رے جلوہ کہ جہاں دیکھو وہاں ہے
دم بھرتی ہے خود روح کہ وہ جانِ جہاں ہے کس جا سے ڈھونڈوں کہ بلا قید مکاں ہے
عارف کی حدِ عقل سے بالا وہ صمد ہے
محدود نہ ہونے کی یہ حد ہے کہ اَحد ہے

تو مجمعِ اضداد ہے اے اوّل و آخر بے ہاتھ کے بے پاؤں کے ہر امر پہ قادر
سیکھا نہیں اک حرف، ہر اک علم سے ماہر بے گوش کے سامع تو بغیر آنکھ کے ناظر
بے پردہ ہے موجود، حجابوں میں نہاں ہے
یاں بھی ہے وہاں بھی، نہ یہاں ہے نہ وہاں ہے

ڈھونڈا جو بہت آب و ہوا آتش و گل میں کچھ کچھ نظر آیا نگہِ شوق کے تل میں
پوشیدہ ہے کب شیخ کے کھوئے ہوئے دل میں روپوش ہے جلوہ رخِ عاصیِ خجل میں
زاہد کی نصیحت تھی کہ دیندار سے پوچھو
رحمت نے کہا، جاؤ گنہگار سے پوچھو

جو ڈھونڈے اُسے پانے کی اُمید بھی ہوگی دل سے ہو طلب، غیب سے تائید بھی ہوگی
ظلمت میں نظر بند نہ ہو، دید بھی ہوگی جو تجھ پہ ہو قربان اُسے عید بھی ہوگی
دل جس کا لیا، تو نے خدائی اسے دے دی
جو کھُل کے ملا عقدہ کشائی اسے دے دی

چھپتا جو نہ تو تاک میں پودے نہ اُبھرتے یوں بلبلِ بیتاب بھی فریاد نہ کرتے
جھونکے بھی ہَوا کے نفسِ سرد نہ بھرتے پھولوں میں نہ ہوتا تو ہزار اُن پہ نہ مرتے
ہر شَے میں تری جلوہ نمائی نظر آئی
بت خانے میں دیکھا تو خدائی نظر آئی

ہندوستان کی صنعتی اور تجارتی جہالت

(از مسٹر جلالی شاہجہانپوری)

آبادی اور وسعت کے لحاظ سے ہندوستان کی حیثیت ایک مستقل براعظم سے کم نہیں لیکن جب اس چالیس کروڑ آبادی کے جنگل کو صنعتی تعلیم کے لحاظ سے دیکھا جاتا ہے تو اس سلسلہ میں اس کی حیثیت صفر سے زیادہ ثابت نہیں ہوتی۔ مغربی دنیا کے چھوٹے سے چھوٹے آزاد ملک کی صنعتی تعلیم پر آپ نظر ڈالیں تو وہاں تجارتی تعلیم کے سیکڑوں اسکول اور کالج ملیں گے۔ کیونکہ ان ملکوں نے آزادی کی فضا میں پرورش پانے کی وجہ سے اس حقیقت کو معلوم کر لیا ہے کہ صنعتی ترقی اور تجارتی تعلیم دونوں لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں غلام ہندوستان کی تجارتی تعلیم کا حال مستند دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

۱۹۱۳ء میں پورے ہندوستان میں کل چھبیس ۲۶ تعلیمی اداروں میں صنعتی اور تجارتی تعلیم کا انتظام تھا اور ان میں بھی حکومت کے اداروں کی تعداد صرف تین تھی، باقی تیئیس ۲۳ جگہ پرائیویٹ تعلیم کا انتظام تھا۔ ایسی اہم اور ضروری تعلیم کے لئے ان پرائیویٹ مدرسوں کا جیسا انتظام اور معیار ہوگا اس کو صنعتی تعلیم کے ماہرین اچھی طرح جان سکتے ہیں۔ ۱۹۲۶ء میں اس تعداد میں خاص اضافہ ہوگیا یعنی چھبیس ۲۶ سے بڑھکر پانچسو چھہتر صنعتی اسکول ہوگئے اور ان میں پڑھنے والوں کی تعداد ۱۷٬۳۰۸ ہوگئی۔ لیکن ان تمام اسکولوں کا تعلق براہ راست حکومت سے نہیں تھا بلکہ یہ پبلک کی ذاتی ملکیت کی حیثیت سے چل رہے تھے، اور ان میں ایسے اسکول بھی شامل تھے جن کی نہ پبلک میں کوئی وقعت تھی اور نہ حکومت ہی ان کو قابل توجہ خیال کرتی تھی بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ وہ صرف تنکم پروری کے ذریعوں میں شامل تھے۔ اور اس شمار میں بہت سے ایسے یتیم خانے اور انجمنیں بھی تھیں جو غریب اور یتیم بچوں کو معمولی صنعتی تعلیم دیتی تھیں اور بہت سے ایسے مدرسے بھی تھے جن میں صرف نجاری اور آہن گری وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ چالیس کروڑ انسانوں کے جنگل میں پانچسو چھہتر ۵۷۶ معمولی اسکول اور ان میں ۱۷٬۳۰۸ طلبا کا ہونا ملکی صنعت کی ترقی کا جیسا کچھ ضامن ہوسکتا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان اسکولوں اور

کالجوں میں کوئی ایسا نہیں ہے جس میں موجودہ عہد کے تجارتی رنگ ڈھنگ اور اُصول وطریقے سکھائے جاتے ہوں۔

نفاذ اصلاحات سے کچھ پہلے سے سرکاری صنعتی اسکولوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا ہے، لیکن ان میں ایسی معمولی صنعتوں کی تعلیم دی جاتی ہے جن سے ہندوستان کی صنعتی حالت قیامت تک بھی درست نہیں ہوسکتی۔ خصوصاً جبکہ ان میں موجودہ دور کی تجارتی ضرورتوں کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں اور نہ اس کا علیحدہ طور پر بھی کوئی خاص انتظام ہے ایسی صورت میں ہندوستان کی صنعتی ترقی کا خیال ہی محال ہے اس کے مقابلہ میں یورپ کی صنعتی اور تجارتی تعلیم اور اس کے اداروں کا حال سُنیئے جس سے آزادی کی دولت اور غلامی کی مصیبت کا فرق بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے۔ جرمنی کی آبادی چھ کروڑ ۳۰ لاکھ ہے یعنی جرمنی کی پوری آبادی ہندوستان کی آبادی کا پانچواں حصہ ہے بلکہ اس سے بھی کچھ کم۔ لیکن وہاں تیئیس ۲۳ یونیورسٹیاں ہیں جن کا جال پورے جرمنی میں پھیلا ہوا ہے اور ان میں طالب علموں کی کثیر تعداد صنعتی تحقیق اور فنی تکمیل میں شبانہ روز مشغول رہتی ہے۔ ہندوستان میں ٹکنیکل تعلیم کی ناگفتہ بہ حالت کا ذکر کیا جاچکا ہے۔ ہزاروں لاکھوں تعلیم یافتہ اشخاص اس کے حصول کے شوق میں سرگرداں ہیں لیکن حکومت کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگتی۔ مگر جرمنی میں ان یونیورسٹیوں کے ساتھ ساتھ ٹکنیکل کالجوں کا جال بھی پورے ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ اسی طرح تجارتی تعلیم کے لئے ہندوستان جیسے وسیع ملک میں ایک کالج بھی ایسا نہیں ہے جہاں کاروباری پیچیدگیوں کی عملی تعلیم دی جاتی ہو۔ لیکن جرمنی میں ان کے انتظامات مکمل ہیں۔ برلن، کونگس برگ اور لائزگ وغیرہ میں تجارتی تعلیم کے کئی مستقل کالج موجود ہیں جن میں صرف تجارتی تعلیم دی جاتی ہے اور دنیا کی صنعتی منڈیوں پر قبضہ کرنے کے وسائل وذرائع سے پورے طور پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج جرمنی دنیا کی صنعتی منڈیوں پر پورے طور سے قابض ہے۔

ترکی کی آبادی پچھلی مردم شماری کے اعتبار سے ایک کرور انسی لاکھ ہے یعنی ہندوستان کی آبادی کے بیسویں حصہ کے برابر ہے، سلطنت کا رقبہ بھی یو۔پی اور بہار کے رقبہ سے بڑا نہیں، لیکن آزادی کا سایہ اُس کے سر پر موجود ہے۔ اس لئے اُس کی صنعتی ترقی اور معاشی خوشحالی میں کوئی چیز مانع نہیں ۔ سینتالیس ۴۷ زبردست صنعتی کالج حکومت کے خرچ اور اُس کی نگرانی میں کامیابی سے چل رہے ہیں اور ان کالجوں میں تعلیم پانے والوں کی تعداد ۳۸۰۰۰ سے بھی کچھ زائد ہے۔ لیکن ہندوستان کے چالیس کرور کے جنگل میں سے صرف سترہ ہزار طلبا آج سے چند سال پہلے اس تعلیم میں مصروف تھے اور وہ بھی معمولی قسم

کی تعلیم دیجاتی تھی. تجارتی تعلیم کا تو ذکر ہی فضول ہے ان سرکاری کالجوں کی تعداد کے علاوہ ٹرکی میں پبلک کے صنعتی کارخانوں کی تعداد بھی سیکڑوں تک پہونچتی ہے۔ اگر سرکاری اداروں کی فہرست میں ان کو بھی شامل کرلیا جائے تو کل صنعتی اداروں کی تعداد اکیسو بیالیس[۲۱۴۲] تک ہو جاتی ہے۔ اور ان کارخانوں کو ہندوستان کے لاوارث کارخانوں کی طرح قیاس نہ کرنا چاہیئے کیونکہ ان پر گورنمنٹ کی کڑی نگرانی ہوتی ہے اور گورنمنٹ ان کارخانوں کو ہر قسم کی امداد اور سہولت پہونچانا اپنا ملکی اور قومی فرض تصور کرتی ہے سرکاری معائنے ہوتے ہیں، حسابات اور کام کی باقاعدہ دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ دلچسپ حقیقت بھی قابلِ غور ہے کہ تجارتی کالجوں کی تعداد صنعتی کارخانوں سے زیادہ ہی ہے یعنی جہاں صنعتی کالج سینتالیس[۴۷] ہیں وہاں تجارتی اڑتالیس ہیں۔ آج صنعتی اور تجارتی بازاروں میں ٹرکی صنعت کی مقبولیت انھیں کوششوں کا نتیجہ ہے۔

روس کی صنعتی حالت جنگ عظیم سے پہلے بہت خستہ تھی، مگر اشتراکی انقلاب کے بعد جہاں ہر چیز کا نقشہ بدلا وہاں صنعتی انقلاب بھی ہوا آج روس کے چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ میں صنعتی اسکول اور کالج کھُلے ہوئے ہیں۔ ۱۹۳۷ء میں صرف ایک شہر ماسکو میں دس ہزار سے زائد طلبا صنعتی تعلیم میں مصروف تھے مختلف یونیورسٹیوں میں صنعتی تعلیم پانے والوں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ کے قریب تھی۔ اور ۱۹۳۸ء میں صنعتی اسکولوں اور کالجوں کے طلباء کی مجموعی تعداد ساڑھے پچپن لاکھ سے کچھ زائد تھی۔ تجارتی تعلیم اور اس کے اداروں پر پانی کی طرح روپیہ بہایا جارہا ہے، یہی وجہ ہے کہ کل کا غریب روس آج اپنی خوشحالی کے اعتبار سے دنیا کے لئے باعثِ رشک بن رہا ہے۔

جاپان کی مجموعی آبادی چھ کروڑ ہے، لیکن اس کی حیرت انگیز صنعتی ترقی کو دیکھکر ہندوستان کی بے دست و پا مخلوق کی خستہ حالی پر دو آنسو بہانے کو جی چاہتا ہے۔ ہندوستان کے مقابلہ میں اتنی سی مختصر آبادی میں بارہ ہزار دو سو تیرہ صنعتی اسکول موجود ہیں جن پر حکومت کا کروروں روپیہ صرف ہوتا ہے آخر اس بے دست و پائی کی کوئی حد بھی ہے۔ پالیس کرور کی آبادی میں سرکاری اور پرائیویٹ صنعتی اسکولوں میں تعلیم پانے والوں کی تعداد صرف ۱۰۴۳٫۸ ہے۔ صوبہ پنجاب ہندوستان کے دیگر صوبوں کے مقابلہ میں ایک صنعتی اور تجارتی صوبہ مانا گیا ہے لیکن اس کی ۲۷-۱۹۲۶ء کی صنعتی رپورٹ کے مطابق اس صوبہ میں بھی سرکاری اور پرائیویٹ صنعتی اسکولوں کی تعداد صرف سترہ[۱۷] ہے، اور اس قسم کے اسکولوں میں زیادہ سے زیادہ آہنگری، نجاری اور اسی معیار کی صنعتی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہندوستان کے مدبرین صنعتی اسکولوں اور حرفتی اداروں کے مزید اجرا کے لئے حکومت پر زور ڈال رہے ہیں لیکن ملکی ضرورت کے لحاظ سے پچاس ہزار،

صنعتی اسکول بھی ہندوستان کی صنعتی ترقی کے ضامن نہیں ہو سکتے ہیں جب تک صنعتی تعلیم کے ساتھ تجارتی تعلیم کا معقول انتظام نہیں ہوتا اُس وقت تک ہندوستانی مصنوعات کا ترقی کی طرف قدم اُٹھانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

فرض کیجئے کہ اربوں روپیے سالانہ کا مال یہاں تیار ہونے لگے لیکن تجارتی واقفیت اور تجربہ کے قدم اپنی جگہ پر قائم رہے تو اس اربوں روپیے کے مال کی کھپت کہاں ہوگی۔ ایک نو آموز کو مال کی تیاری سے پہلے اُس کی کھپت اور نکاسی کے عملی طریقوں سے واقف ہونا بھی ضروری ہے۔ ہماری گزشتہ صنعتی ترقی کا راز بڑی حد تک تجارتی رنگ ڈھنگ اور اُسکی عملی تعلیم سے واقفیت پر مبنی تھا۔ صناعوں کی رہنمائی اور غیر ممالک سے تجارتی معاہدوں کی تکمیل حکومت کی سیاسی پالیسی کا سب سے اہم عنوان ہونا چاہیئے۔ ہندوستان میں قومی حکومت قائم ہو تو اس کے تمام کام صرف ہماری بہبودی اور بھلائی کے لئے ہوں، ورنہ موجودہ حالت میں سب سے پہلے انگلستان کے مفاد کا خیال رکھا جاتا ہے۔ بہرحال ہندوستان موجودہ دور کے صنعتی مقابلہ میں اسی وقت پاؤں جما کر ٹھہر سکتا ہے۔ جب تجارتی کارخانوں کے علاوہ صنعتی تعلیم کا بھی معقول انتظام کیا جائے اور حکومت کی سرپرستی صرف ہندوستان کے مفاد کے پیش نظر ہو۔

تبرّکاتِ احسنؔ

(حضرت احسنؔ مارہروی مرحوم)

مَیں بہر صورت تمھارا تابعِ ارشاد ہوں
خوش ہو تم ناشاد رکھنے سے تو میں بھی شاد ہوں

اختیار و جبر کا مجموعۂ اضداد ہوں
عادۃً پابند ہوں میں فطرتاً آزاد ہوں

ہو رہی ہیں پستیوں کی منزلیں اس طرح طے
نقشِ پا ہوں خاک ہوں پامال ہوں برباد ہوں

اِک بھری محفل میں کہتا تھا دلِ بے مدعا
مَیں ہی اس ہستی میں ہم شکلِ عدم آباد ہوں

ذکر میری خود فراموشی کا اور اُن کی زباں
اپنی ہستی کیوں نہ مَیں بھولوں کہ اُنکو یاد ہوں

احسنِ دلریش اپنا حالِ غم خود کیا کہے
ہر دہانِ زخم کہتا ہے لبِ فریاد ہوں

یہ اشعار ہمکو حضرت احسن مرحوم کے صاحبزادہ سید رفیق احمد صاحب مارہروی سے موصول ہوئے ہیں اور شکریہ کیساتھ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں

چاندنی رات کی گنگا

(از پراوپکار سنگھ سریواستو عرشی، ہندو یونیورسٹی بنارس)

اے لبِ خاموش سے کچھ گنگناتی نازنیں — چاندنی راتوں میں جاتی ہے کدھر کو اے حسیں
چادرِ آبِ رواں کو ناز سے ڈالے ہوئے — دوش پر سارے سنہرے بال تو کھولے ہوئے
جگمگاتی، مسکراتی، بات کرتی کس طرف — چاند سا لختِ جگر گودی کھلاتی کس طرف
او ہمالہ کی کھلائی، کوہساروں کی پلی — او سبک رفتار دوشیزہ، دولاری دیش کی
چند لمحوں کے لئے گنگا تو رک جانا ذرا — میری کچھ باتیں ہیں وہ ساحل سے کہنا ذرا
ایک سودائی طبیعت، ایک آوارہ مزاج — گا رہا تھا گیت کچھ لے لے کے تیرے نام آج
اور کہہ دینا کہ تیرے وعدۂ تسکیں کا پاس — رہ گیا ہے رفتہ رفتہ بن کے اک نازک سی آس
کاش تو ہی رہنمائے زیست بن جاتی مری — یاں ٹھہر، او شاہزادی کائناتِ حسن کی

ہم سے انسانوں کو اپنی آن کے تیور سکھا
کچھ تو جینے کے طریقے کچھ تو مرنے کی ادا

ہاں انھیں رعنائیوں میں ناز فرماتا تھا میں — حسن میں تحلیل ہو کر تیر سا جاتا تھا میں
مستیوں میں ان فضا کی رقص فرماتا ہوا — چھیڑتا جاتا تھا تجھ کو اے مغنی ساحرہ
مسکرا دیتا تھا جب میں تو بجا جاتی تھی تو — دیکھ لیتا تھا اگر تو اور اٹھلاتی تھی تو
کیفیت بن کر کبھی عالم پہ چھا جاتا تھا میں — اور جی میں آ جاتا تو تیری روح بن جاتا تھا میں
اب تو اس دنیا میں ہیں محدود ہیں مجبور ہیں — تجھ سے یوں نزدیک ہیں گنگا مگر ہم دور ہیں
درد سے بیتاب ہے انساں بہت لاچار ہے — موت جس پر ناز کرتی ہے یہ وہ سنسار ہے
پھر بھی تیرے واسطے روئے بہت تڑپے تھے ہم — یاد ہے اوپر سے جب گنگا تجھے لائے تھے ہم
یاد ہے وہ روز جب تیری پشیمانی ہوئی — میرے رعبِ حسن کے آگے تو پانی ہو گئی

فخر کرتے ہیں کہ رکھتے ہیں دلِ درد آشنا
ورنہ کیا رکھا ہے ترتیبِ عناصر کے سوا

وہ نقابی رات اور سوئے فضائے پُرضیا
حسن کی دنیا پہ جیسے پیار سا چھایا ہوا
ابتدا سے انتہا تک شوق بے پایاں ترا
میرے ہاتھوں میں نہیں ہے عالمِ امکاں ترا
تیرے پوشیدہ اشاروں کے سہارے پر چلوں
تو اگر چاہے تو میں زندہ رہوں ورنہ مروں
مجھ سے دیکھی اب نہیں جاتی ہیں یہ آزادیاں
حسن کے آغوش میں تیری ترنم سازیاں
جی میں آتا ہے کہ گنگا تیری موجوں کے تلے
قلب کی رفتار رک جائے سکونِ دل ملے

"میں"

(از مسٹر شمبھو دیال نگم، شفق کانپوری)

(۱)

خزاں نے روند دیا جس کو وہ بہار ہوں میں
اجڑ گیا ہے سنور کر جو وہ سنگار ہوں میں
اتر گیا تری ترشی سے جو خمار ہوں میں
گراں زمیں کو جو معلوم ہو وہ بار ہوں میں

(۲)

قدم قدم پہ گماں ہو رہا ہے منزل کا
ہر ایک موج پہ دھوکا مجھے ہے ساحل کا
ہر ایک پردہ سمجھتا ہوں پردہ محمل کا
فریبِ حسن میں الجھی نظر کا تار ہوں میں

(۳)

خیال و خواب کی دنیا بسائی ہے میں نے
ہراس و یاس کی دولت کمائی ہے میں نے
خلش جگر میں تپش دل میں پائی ہے میں نے
کسی کے وعدۂ باطل کا انتظار ہوں میں

(۴)

امید و یاس کی پیچیدگی میں الجھا ہوں
خیالِ سود و زیاں کا شکار بیٹھا ہوں
عجیب حال ہے مرتا ہوں میں نہ جیتا ہوں
قرار جس کو نہ آئے وہ بے قرار ہوں میں

(۵)

بجھا رہی ہے چراغِ حیات بادِ غم
ہٹا رہی ہے نشانِ نشاطِ یادِ غم
یہ ختم ہو نہیں سکتا کبھی سوادِ غم
اجڑ گیا تری غفلت سے جو دیار ہوں میں

(۶)

مری طرف بھی نگاہِ کرم اٹھا ساقی
مری وفاؤں کا کچھ تو ملے صلا ساقی
نہ مے ہو ڈھونڈ کے تلچھٹ ہی لا پلا ساقی
شفق ہے نام، بہت کہنہ بادہ خوار ہوں میں



رائے بہادر شنکر دیال "نگار"

۱۸۶۹—۱۹۴۰

رائے بہادر شنکر دیال صاحب مرحوم

(از مولانا محمد احمد بیخود موہانی مرحوم، ایم۔ اے پروفیسر اردو و فارسی شیعہ کالج لکھنؤ)

ماہ ستمبر ۱۸۶۶ء کی نویں تاریخ بابو برج بہادر صاحب اکاؤنٹنٹ ریلوے ڈپارٹمنٹ ساکن محلہ عیش باغ شہر لکھنؤ کے گھر میں دولت و اقبال کا ستارہ چمکا یعنی رائے بہادر شنکر دیال صاحب کی ولادت باسعادت ہوئی جس روز سے یہ مولود مسعود زینت افزائے محفل ہستی ہوا شوکت و اجلال نے یہیں ڈیرے ڈال دیئے۔ دولت و اقبال اس کی عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتے گئے۔ تعلیم کی ابتدا کی گئی، ذہن و ادراک کی روشنی پھیلنے لگی۔ طبیعت میں گیرائی قدرت نے ودیعت رکھی تھی بہت کم زمانے میں سواد خوانی کی دولت سے مالا مال ہونا نصیب ہوا۔ فارسی و اردو کی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم کی طرف بھی متوجہ کئے گئے۔ انٹرنس اور ایف اے کے امتحانات میں ایسی شاندار کامیابی حاصل کی کہ سرکاری وظیفے سے قدر شناسی کا ثبوت دیا گیا۔ بی۔ اے کی تعلیم کیننگ کالج لکھنؤ میں پائی، اور ۱۸۹۲ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے سند کامیابی حاصل کی۔ جب ۱۸۹۴ء میں وکالت ہائی کورٹ کا امتحان دیا تو اکسیو آٹھ طلبہ شریک امتحان تھے جن میں صرف تین طلبہ کو کامیابی حاصل ہوئی۔ ان میں رائے بہادر صاحب موصوف بھی تھے۔ اس امر سے اُن کی ذہانت کے جوہر کھلتے ہیں، اور طبیعت کی گیرائی اُبھر اُبھر کر ظاہر ہوتی ہے۔ اسی سال وکالت شروع کر دی۔ ۱۸۹۷ء میں منصفی کا عہدہ قبول کر لیا اور رفتہ رفتہ ڈسٹرکٹ و سشن جج کے عہدۂ جلیلہ پر معزز و ممتاز ہوئے۔ جنوری ۱۹۲۲ء میں رائے بہادر کا معزز خطاب تاج برطانیہ کی طرف سے) عطا ہوا۔ ۱۹۲۶ء میں ججی کے عہدہ سے پنشن پائی، اور اسی سال ریاست جے پور کے جج مقرر ہوئے اور پانچ برس تک وہاں بھی داد انصاف گستری دی۔ کسی کے جاہ و دولت سے مرعوب ہونا آپ کی سرشت ہی میں نہ تھا۔ ہمیشہ فیصلے میں دودھ کا دودھ، پانی کا پانی کر دکھاتے۔ بعض طبائع پر یہ انصاف گراں گزرتا، مگر آپ اس کی کچھ پروا نہ کرتے۔ قیام جے پور کے زمانے میں آپ نے شریمد بھگوت گیتا کا ترجمہ اردو نظم میں کیا جو اہل طریقت و معرفت میں بہت مقبول ہوا۔

جناب موصوف ایک صافی نہاد صوفی مشرب، مرنجاں مرنج باہمہ و بے ہمہ بزرگ تھے، صلح کُل اُن کا مسلک تھا۔ ہر وقت وحدت الوجود کا کلمہ پڑھتے ہمہ اوست کا دم بھرتے خدا کی تمام مخلوق سے یکساں لطف و کرم صدق و صفا سے پیش آتے۔ اُمرا کی تونگری اور فقرا کی بے زری اُن کے برتاؤ میں فرق نہ آنے دیتی، کم سخنی اُن کا شیوہ تھا، ضرورت سے زیادہ بات نہ کرتے، تواضع اُن کی سرشت اور اخوت اُن کی خو تھی۔ ساری عمر کسی سے اَن بن نہ ہوئی۔ جس سے

ملتے دل سے ملتے۔ حاضر و غائب ایک حالت رہتی، اُن کی زبان پر وہی آتا جو اُن کے دل میں ہوتا، جب زبان کھلتی عارفانہ نکات کا مینہ برس جاتا۔ کسی سے اختلاف کرتے تو ایسے پیارے انداز اور ایسے شیریں الفاظ میں کہ سامع پر گراں نہ گزرتا اور بات دل میں اُتر جاتی۔ رقت قلب اور حق سرائی، حق پسندی عزم و حیا، مہر و وفا، حلم و سخا ہر وقت اُن کے جلو میں رہتے۔ فرض شناسی اُن کا خاص جوہر بلکہ دین و ایمان تھا۔ ایک انگریزی شعر بہت پڑھا کرتے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ "زندگی کیا ہے ادائے فرض کا اک نام ہے۔"

استواری طبع جناب موصوف پر ناز کرتی تھی، اپنے مذہب کی پابندی سختی سے کرتے مگر کسی مذہب کو بُرا نہ کہتے۔ بلکہ بانیانِ مذاہب کا زیادہ احترام کرتے۔ احسان کرنے سے محبت، اور احسان جتانے اور احسان اُٹھانے سے نفرت رکھتے تھے۔ پاسِ وضع کی حد یہ تھی کہ جج کے زمانے میں بھی چوڑیدار پاجامہ اور اچکن ہی زیب تن فرمایا کرتے تھے۔ غرض جوانی اور بڑھاپا ایک ہی رنگ میں بسر کر دیا اور اپنے پاکیزہ عمل سے اس شعر کی شرح فرماتے رہے:۔

یکرنگ تھے وہ ہم کہ دو رنگی نہ کی پسند پہنا کفن تو جامۂ ہستی اُتار کے

انگریزی لباس کی طرف کبھی غلط انداز نظر بھی نہ ڈالی، فیشن پرستی کی وبا کو عذاب الٰہی سمجھتے تھے، چنانچہ "بادۂ عرفاں" میں بعض مقامات پر تہذیب قدیم کا ماتم کیا ہے اور تہذیب دورِ حاضرہ پر خون کے آنسو بہائے ہیں۔ ہندوستان کی کل قوموں کو اجزائے ہند سمجھتے اور اُن کے باہمی اختلافات و خانہ جنگی سے نہایت ملول رہتے اور فرماتے کہ افسوس ہمارے بزرگوں کی ساری کمائی بُری طرح لُٹ رہی ہے اور ہمارے بنائے کچھ نہیں بنتی۔ وطن پرستی کے بادۂ پُرجوش سے سرشار اور ہندوستان کی اگلی شان و شوکت اور پچھلی حکمت و روحانیت کے سوگوار تھے۔ "بادۂ عرفاں" میں یہ سب چیزیں ملتی ہیں۔ اُن کا حلقۂ احباب وسیع نہ تھا گنتی کے لوگوں سے ملتے مگر یہ ایسے ہی لوگ ہوتے جو حسد و ریاکاری سے دُور بھاگتے۔ یکرنگی جن کا شیوہ اور دین و دیانت جن کا طریقہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ادبی ذوق کی دولت سے بھی بہرہ یاب ہوتے

اب ہم رائے بہادر صاحب مرحوم کی تصانیف کے متعلق اظہار رائے کرتے ہیں:۔

اُردو نظم میں تین کتابیں جناب مرحوم کی یادگار ہیں، اول گنجینۂ معرفت جو سری بھگوت گیتا سی جلیل القدر کتاب کا ترجمہ ہے اور بڑی عرقریزی سے کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ کرم سنیاس اور یوگ سنیاس وغیرہ وغیرہ ایسے دقیق مسائل ہیں کہ نثر ہی میں ان کا ترجمہ کرنا دشوار ہے نہ کہ نظم میں۔ جناب موصوف نے ان کا ترجمہ عام فہم زبان میں اس خوبی سے کیا ہے کہ منہ سے بے اختیار واہ نکل جاتی ہے۔ یہ اور ایسے ہی مقامات ویدانت فلاسفی کے لئے سرمایۂ ناز ہیں یہ وہی ارشادات ہیں جو محاربہ مہابھارت میں ارجن نے سری کرشن جی کی زبان مبارک سے سنے ہیں۔ رائے بہادر صاحب نے پانچ برس کی ملازمت کے بعد بربنائے ناتندرستی استعفیٰ دیدیا اور ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۰ء تک اپنے دولت خانہ

شنکر بھون ہی میں رہے۔ اور دو کتابیں اور تصنیف فرمائیں، آوم مالا، اور بادۂ عرفاں، ہم ان کتابوں پر رائے زنی کرنے سے پہلے کچھ کہہ دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

آپ کے اشعار آپ کا مرقع ہوتے ہیں، آپ کے کلام میں آپ بیتی بہت زیادہ اور جگ بیتی بہت کم ہے۔ سارا کلام اخلاقی اور عرفانی شاعری سے مملو ہے اور ایک ایسا خزانہ ہے جس میں نہایت بیش بہا جواہر ریزے نظر آتے ہیں ذات وصفات الٰہی اور بے ثباتیِ دنیا وغیرہ کی تصویریں اس میں بکثرت ہیں۔ مذمتِ دنیا اور احساس فرائض آپ کے خاص موضوع ہیں۔

"اوم مالا" آپ کی دوسری تصنیف ایک طولانی نظم ہے جسے آپ ہر روز پوجا کے بعد پڑھا کرتے تھے۔ یہ نظم مذمتِ دنیا و ترکِ دنیا و حمد و ثنائے ذات وصفات الٰہی کا گنجینہ ہے۔ زبان کی سلاست مطالب کی متانت خیالات کی رفعت ہر آئینہ قابل داد ہے۔

جناب موصوف کی تیسری تصنیف 'بادۂ عرفان' ہے، یہ آپ کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ یہ بھی اخلاقیات اور عرفانیات کا آئینہ ہے۔ یہ کتاب گویا ایک میخانہ ہے جو حکمت و معرفت کے بادۂ سرجوش سے لبریز ہے

حبِ وطن کے متعلق بعض اشعار ملاحظہ ہوں:۔

کیا تھا یہ ہند پہلے جو ہے وطن ہمارا — دنیا کے باغ میں تھا یکتا چمن ہمارا
سب سے قدم ہمارا ہر علم میں تھا آگے — یکتا تھی اپنی صنعت یکتا سخن ہمارا
کوہِ ہمالیہ سے تا انتہائے لنکا — ہر جا رہا ہے جھنڈا سایہ فگن ہمارا
وہ فوج تھی ہماری جس سے زمیں تھی لرزاں — ہر ایک فیلِ جنگی تھا صف شکن ہمارا
ہیئت میں ہم تھے کامل حکمت میں ہم تھے یکتا — اک سکۂ رواں تھا ہر اک سخن ہمارا

متفرق غزلیات کا انتخاب یہ ہے:۔

الٰہی سلامت رہے میری پیری — یہی ہے مرے ساتھ جانے کے قابل
نہ بلوا مجھے حشر کی انجمن میں — یہ منہ کب رہا ہے دکھانے کے قابل
درد ہوں سوز ہوں، فرقت ہوں تمنا میں ہوں — سو بکھیڑے ہیں مرے ساتھ وہ تنہا میں ہوں
اپنی بہار ہوں نہ چمن کی بہار ہوں — قسمت مری کہ گلشنِ ہستی کا خار ہوں
کیا پوچھتا ہے عشق کی مجبوریوں کا حال — بے اختیار گریۂ بے اختیار ہوں
کچھ سمجھ میں مری آتا نہیں ہونا کیا ہے — قطرے قطرے کو ہے یہ زعم کہ دریا کیا ہے

یہ شعر دورِ حاضرہ کی انانیت (غرور) کا مرقع ہے، اس لئے کہ بے کمالی پر ناز کمال اس عہد کے برکات میں سے ہے،

میری پستی میں ملی حد کی بلندی کو پناہ		مَیں وہ ذرہ ہوں کہ آگے مرے تارا کیا ہے

یہ شعر خاکی نہاد انسان کی رفعت و شان کا آئینہ ہے۔

ہے کچھ عجب چیز سہارا اُمید کا		آنکھوں سے اشک گرنے ہی کو تھے سنبھل گئے

نہ اک ذرے کو بھی بے قدر جانو		یہ دنیا ایک موتی کی لڑی ہے

کیا جانے کیا کرے دل بے اختیار تو		تجھ کو جو ایک پل بھی خدا اختیار دے

موت بن جائیگی آخر ایک دن		زندگی ہے دشمنِ جانی مری

دشت محشر بن گیا باغ و بہار		رنگ یوں لائی پشیمانی مری

۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۷ء تک رائے بہادر صاحب شنکر بھون ہی میں رہے اور قریب قریب سارا وقت ریاضت و عبادت ہی میں بسر کیا۔ عبادت کی صبح تھی تو ریاضت کی شام۔ ریاضت کا دن تھا تو عبادت کی رات کبھی کبھی شعر گوئی کی طرف متوجہ ہوتے تو گویا عبادت نظم میں ہونے لگتی۔ اس پر اوم مالا اور بادۂ عرفاں ایسے ۲ دو شاہد عادل گواہ ہیں۔ وفات سے چھ مہینے قبل بائیں ہاتھ میں درد پیدا ہوا جو برابر بڑھتا گیا، پندرہ دن کے بعد چکر بھی آنے لگے، ایک ہفتہ اسی حالت میں گذر گیا۔ پھر کوئی ایک ہفتہ سکون رہا، اب بخار بھی آنے لگا اور تپ بڑھتی ہی گئی، مرنے سے پندرہ دن پہلے جناب موصوف نے مندرجۂ ذیل شعر کہے اور یہی اُن کا آخری کلام ہے:-

درد سے پیدا ہوا یارب یہ کیسا انقلاب		جو بہار آستیں تھا ہے وہ بارِ آستیں

ہاتھ کا یہ درد میری جان لے کر جائے گا،		اس کے ہاتھوں بن گیا ہے ہاتھ مارِ آستیں

ان اشعار کے بعد ہچکیاں آنے لگیں جن کا سلسلہ مرتے دم تک جاری رہا اور یہ عالم ہو کے رہ گیا ؎

ہچکیوں نے کھو دیا لطفِ بیانِ دردِ دل		ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھدی داستانِ دردِ دل

ایسے باخدا بزرگ کی موت اہل نظر کے لئے سانحۂ عظیم ہے ؎

اِک فرد کی نہ ایک گھرانے کی موت ہے		اہلِ صفا کی موت زمانے کی موت ہے

آپ نے اپنی تمام زندگی عبادت ریاضت اور خدمتِ خلق میں بسر کی۔ خدائے عادل نے دنیا میں صلہ یہ دیا کہ چار فرزند سعید ورشید اُن کی یادگار ہیں۔ بڑے صاحبزادے بابو ترلوکی ناتھ صاحب ورما بی۔اے۔ ایل ایل۔بی۔ منصفی کے عہدے پر سرفراز ہیں۔ منجھلے صاحبزادے بابو تربھون ناتھ صاحب ورما ایم۔اے، ایل ایل۔بی۔ وکالت کا کام سیکھ رہے ہیں سنجھلے صاحبزادے بابو رجیندر ناتھ صاحب ورما بی۔ایس۔سی، ایل ایل۔بی وکیل ہیں۔ سب سے چھوٹے صاحبزادے بابو پرکاش ناتھ ورما ہیں جو ایم۔اے فائنل میں پڑھتے ہیں۔

یہ بات بھی کہنے کے قابل ہے کہ جناب رائے بہادر صاحب مرحوم کی تمام مادّی و روحانی ترقیاں اُنکی ذاتی سعیِ جمیل کا ثمرہ ہیں

مجھے بھی جناب موصوف سے نیاز حاصل تھا میں نے دو تاریخیں کہی ہیں جو ہدیۂ ناظرین کرام ہیں :-

قطعۂ تاریخ اردو

شنکر دیال رائے بہادر کی موت سے — چھایا ہے کائنات پہ بادل ملال کا
اہلِ صفا کی موت زمانے کی موت ہے — غم سے عجیب حال ہے اہلِ کمال کا
کہتے ہیں اس کو عشق کہ جب کھل گئی زباں — قصہ چھڑا خدا کے جمال و جلال کا
ہر لفظ اک شبیہ صفاتِ الٰہ کی — ہر شعر ایک آئینہ حق کے جمال کا
سمجھے جو ذرے ذرے کو قدرت کا آفتاب — ملتا ہے آدمی کہیں ایسے خیال کا
تھا زندگی بھی ہجر کی مدت کا ایک نام — جب آگئی اجل تو دن آیا وصال کا

آفت سرِ بساطِ جہاں پر گذر گئی
ماتم ہے اک زمانے میں شنکر دیال کا

۱۳۶۱ = ۱۳۵۹ ہجری

جامعۂ ملیہ کے قاعدے

یہ چھ قاعدوں کا ایک سٹ ہے جس میں (۱) آسان قاعدہ (۲) بچوں کا قاعدہ (۳) حرفوں کا قاعدہ (۴) مدرس کا قاعدہ نمبر (۵) اُردو سکھانے کا آسان قاعدہ یا طریقہ (۶) نئی کتاب (قاعدہ) ہیں۔

پہلے قاعدہ میں بچوں کو آوازوں کے ذریعہ سے الفاظ سکھائے گئے ہیں، اور اشیاء کو دیکھکر آواز پیدا کرنے کے لئے بہت سی قلمی تصویریں حاشیہ پر درج کرکے ان کے سامنے اس چیز کا نام جلی حرفوں میں درج کردیا گیا ہے اور نام کا آخری حرف سکھایا گیا ہے۔ لیکن اس کی بعض تصویریں بھدی اور غلط ہوگئی ہیں۔

دوسرے قاعدہ میں بھی تصویروں کے ذریعہ سے بول سکھائے گئے ہیں، اور چھوٹے چھوٹے لفظ ملاکر دلچسپ کہانیاں بنائی گئی ہیں۔

تیسرے میں مختلف حرفوں اور پیشوں سے متعلق تصویریں دے کر لفظوں کی تعلیم دی گئی ہے، اور پھر انھیں لفظوں کو الٹ پھیر کرکے مختلف جملے اور فقرے بنانا سکھایا گیا ہے۔

چوتھے میں صاحبزادہ سعید الظفر خاں صاحب نے جو قاعدہ مرتب کیا ہے اس میں استاد کو اس قاعدے کے سبق پڑھانے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔

پانچواں قاعدہ بھی استادوں کے لئے ہے جس میں بڑی عمر والوں کو تعلیم دینے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔

چھٹویں میں بھی تصویروں کے ذریعہ سے بول سکھائے گئے ہیں۔ لکھائی چھپائی اچھی قیمت ۲ روپیہ مکتبہ جامعہ دہلی سے طلب کیجئے

پیامِ سالِ نو

(از مسٹر منوہر لال کپور طالب حکوالی، بی-اے (آنرز) ایل-ایل، بی)

گذشتہ سال کی ناکامیوں کا ذکر لاحاصل　　شکستِ غم کی بدنامیوں کا ذکر لاحاصل
گذشتہ سال کی کمزوریوں کا ذکر جانے دے　　گذشتہ سال کی مجبوریوں کو منہ چڑانے دے
گذشتہ سال کی باتوں کا قصہّ چھوڑنا ہوگا　　تعلق سال بھر کا ہے مگر یہ توڑنا ہوگا
جو کل تک "حال" تھا ہے آج "ماضی" میں شمار اُسکا　　ہوا ہے آج کا طالب جو کل تک تھا وقار اُسکا
فروغِ آفتابِ سالِ نو سے لے نئی ہمّت　　نئی ہمّت سے پیدا کر نئی دُنیا نئی قسمت!
پیامِ سالِ نو ہے، کر نیا جوشِ عمل پیدا　　پُرانی مشکلوں کا کر نئی ہمّت سے حل پیدا

تری تدبیر سے تقدیر کا پانسہ پلٹ جائے!
تعجّب کیا تعصّب کی کڑی زنجیر کٹ جائے!

آزادی کا لمحہ

سُنو اے ساکنانِ خطۂ خاک　　صدا کیا آرہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا ہے اک لمحہ بہتر　　غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

روحِ شادمانی

جوش ملیح آبادی

آزاد ہو روح، شادمانی ہے یہی　　بشّاش ہو قلب، کامرانی ہے یہی
کچھ بھی ہو، خراشِ قلب و نیشِ غم کو　　محسوس نہ کر، کہ زندگانی ہے یہی

حجاباتِ نظر

افسانہ

از محترمہ فرحت ہاشمی صاحبہ (بدایونی)

(۱)

رابعہ نواز محسنم، سلام مسنون۔

اللہ... آج چار ہفتہ ہونے آئے کہ صاحبِ فرش ہوگئی ہوں، تمھارے احساس نے کروٹ بھی نہ لی..... تمھارے دل میں ایک ہلکی سی جنبش بھی نہ ہوئی۔ تمھارے دماغ میں ایک خفیف ارتعاش بھی نہ ہوا۔ میرے زخمۂ انتظار نے تمھارے تارِ محبت پر ساز سے سوز پیدا نہیں کیا! —— ہاں تم! تم میری عیادت تک کو نہ آئے!

غم اور علالت دونوں نے اس درجہ اختر شماری میں محو کر دیا ہے کہ آنکھیں رات کے چین اور آرام کی نیند سے بیگانہ ہیں۔ ہر صبح نئی اُمیدیں لیکر آتی ہے.... مگر دن کے اختتام تک وہ سب ایک دُکھے دل کی گہرائیوں میں ڈوب جاتی ہیں۔ میرے خیالات کی دنیا اور میں، اُمیدیں اور یقین..... شاید اب میری مجبوریاں تم کو اپنی محبت کا واسطہ دے کر مجھ تک لے آئیں گی۔ اور خیال ہوتا تھا کہ آج تمھارا خط ضرور آئیگا! جو میرے لئے امن و سکون کا پیغام ہوگا —— نویدِ دید ہوگا!

مگر آہ تم کہ خواب میں بھی آنے سے گریزاں ہوتے تھے —— مگر نہ معلوم کیوں تم خواب میں گھر جاتے تھے، اور —— پھر چشم زدن میں آنکھوں سے دُور..... بہت دُور۔

مجھے معلوم ہے کہ تم میری اس "شکایت" پر چیں بہ جبیں ہو گے اور طوعاً و کرہاً رسمی الفاظ لکھکر بھیج دو گے "مجھے سخت تردد ہے۔ اب طبیعت کیسی ہے۔ معاف کرنا مجھے صحیح وقت پر اطلاع نہ ملی، ورنہ ضرور آتا"

ممکن ہے تمھارے خیال میں الفاظ کے یہ جھوٹے نگینے "میری نظر کو دھوکا دے سکیں —— مگر یہ رسمی تحریر اطمینان بخش نہیں ہوسکتی، ہرگز نہیں ہوسکتی، بلکہ نمکدان کا کام دے گی اور زخمِ دل میں اور ٹیس پیدا کرے گی اب اگر کوئی خیال تسکین بخش ہوسکتا ہے تو یہی کہ جب اس درد کا درمان ہی نہیں تو کیوں نہ اس سے مانوس ہو جاؤں۔ آہ سے

یوں بھی تکمیل غمِ عشق ہوا کرتی ہے ۔۔۔ اُسکی قسمت میں ہوں میں، جو مری قسمت میں نہیں

سچ پوچھو تو شکایت کس سے کروں "تم" اور "میں" یعنی اپنے آپ سے ذرا ایمان کی بھی کہنا، تم کو میرا دل دُکھا کے میری حسرتیں پامال کر کے میرے چمنِ زندگی کو اُجاڑ کے کیا ملا ...... مگر اُسکو اگر تم دل (خدا نہ کرے) پھیر بھی دو تو میں تمہاری "نوازش ہائے پنہاں" کا احساس کرتے ہوئے تمہارے قدموں پر اُسے پھر نثار کر دوں .....

ایک عرصہ کے بعد آج تھوڑا سا سکون ہوا تھا، جی گھبرایا تم کو خط لکھنا شروع کر دیا۔ ہاں دیکھو میری باتوں کا بُرا نہ ماننا۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے دل میں کوئی سوءِ ظن پیدا نہ ہوگا۔ تم ہی سمجھو تمہارے سوا میرا کون ہے ــــ تم اِس جسدِ محبت کی روح ہو ..... ہاں! ہاں تم میرے سب کچھ ہو۔ تم اپنے آپ کو میرا نہ سمجھو مگر دیکھو مجھے اپنا سمجھتے رہنا، میرے لئے یہی کافی ہے ......"

اس وقت نہ معلوم کیوں اس قدر بے اختیار جی ہو رہا ہے کہ تم میرے پاس ہوتے ......
تم کو یاد ہو گا پچھلی برسات میں جب میں اور تم دونوں ندی کنارے بیٹھے ہوئے تھے تو تم نے کہا تھا "اُس تبسّم کی بہار ہی کیا جس میں اشکباری نہ ہو"۔ کاش تم اس وقت ہوتے تو تم وہی بہار میری آنکھوں میں اور وہی تبسّم میرے لبوں پر دیکھتے۔ لو تم ناراض ہو گئے، خط کو طول ہو گیا، اچھا تو میں یقین کر لوں کہ تم ضرور آؤ گے ..... ہ

تھا ابھی جلوہ، ابھی پردہ، ابھی کچھ بھی نہیں — آپ کی یہ حسرتِ دیدار جو چاہے کرے

تمہاری اور صرف تمہاری
حسرت مآب: رابعہ

(۲)

بہن نجمہ، پھلو، پھولو، خوش رہو۔

یہ جو تم نے میری مصیبتوں اور اندوہناکیوں پر اظہارِ ملال اور تاسّف کیا ہے، تو اچھا کیا، کاش یہ الفاظ صرف "دُنیا" ہی کے الفاظ نہ ہوں، میری نظر کے لئے سُراب نہ ہوں اور فی الحقیقت تمہاری ہمدردی کا چشمہ ہوں۔ مگر میرا اب کیا پوچھنا ــــ میں وہ تخمِ محبت ہوں جو بہار کی احسان مند ہی نہیں ایسی ناکارہ ہوں کہ "موت" نے بھی مجھ سے منہ پھیر لیا۔ تم نے تسلّی دی ہے، خوشگوار اُمیدوں کا ایک حقیقت نما منظر میرے سامنے پیش کیا ہے۔ مگر.....

ہجومِ یاس میں کوشش نہ کوئی کام آئی — تسلیوں نے کیا اور بے قرار مجھے

رنیق حیات...... "جمیل" کو سمجھ سکتی ہو، اس کی ہستی کو سمجھنا کہیں آسان ہے، لیکن تم......
کی ہستی کو کیا جانو۔ وہ عوام کی ہستی سے بہت بلند ہے، اس کی اہمیتیں، اس کے جذبات کا عمق اس کے دل کی کیفیات، اس کے احساسات کی رفعت کا تعلق اس دنیائے آب وگل سے نہیں، پیاری نجمہ...... کی محبت اس دنیا کی محبت جیسی نہیں۔ اُن کا تخیل محدود نہیں، اُن کے عناصر ترکیبی محبت۔ سوز، غم اور عشق نہیں۔ میں خود بھی اکثر اُن کی ہستی کو سمجھنے سے قاصر رہتی ہوں۔ جو کچھ تم نے مجھ سے دریافت کیا ہے، اُس کا جواب تو مجھے خود بھی نہیں آتا، میں تو خود اِسی معمہ کے حل کی فکر میں ہوں ؎

لفظ و معنیٰ جس کو چھو سکتے نہیں　　　وہ مرا افسانۂ آغاز ہے

تم نے لکھا ہے کہ تم مسوری جا رہی ہو، اچھا جاؤ، بہار کے دن بہار میں گزارو، تمھیں ایک میری مونس تھیں، میری بدنصیبی اسے بھی نہ دیکھ سکی، جو تسلی دل حزیں کو تم سے مل جاتی تھی اب وہ بھی نہ سہی...... خیر۔　ہاں تو میں تم کو مبارکباد پیش کرتی ہوں، مگر اس آواز میں سوز بھی ہے خوشی بھی ہے غم بھی ہے۔ اب یہ تم خود سمجھ سکتی ہو کہ کس کا وفور زیادہ ہے۔ ہاں دیکھو میری ایک التجا تم کو ضرور ماننا ہوگی۔ تم وہاں کی رنگین بہاروں اور رومانی فضاؤں میں میرے تلخ واقعات کو اپنے دماغ میں جگہ نہ دینا۔ مصیبت میں مَیں کسی کو شریک نہیں دیکھ سکتی۔ یہ تو مجھے اکیلے ہی پسند ہے تمھاری خوشگوار ساعتیں اس بار کی متحمل نہ ہو سکیں گی۔

ہاں گھبرانا نہیں، ابھی مروں گی نہیں، مجھے یقین ہے کہ تمھاری واپسی پر پھر یہی تلخ نغمہ چھیڑوں گی نجمہ! غم اور زیست ایک دوسرے کے لئے لازم ہیں، زندگی کا وجود غم سے ہے......
غم زندگی کا ایک اہم عنصر ہے...... اور اسی کی دنیائے دل میں کارفرمائی ہے۔

تمھاری "رابعہ"



رابعہ نواز......

سرتاجِ من سلام قبول کیجئے۔

خزاں، فسردگیِ شوقِ ناتمام مری　　　بہار، ہستیِ ناقص مرے فسانہ کی

عقل کام نہیں کرتی کہ کیا جواب لکھوں، ہاں "شاہد" نے مجھ سے سچ کہا تھا، کاش اس کے الفاظ پہلے سے میرے کانوں تک پہونچ جاتے۔ "تم" کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے، وہاں سے مجھے ایک خط

بھی لکھا تھا جو ڈاکیہ کی لاپروائی سے مجھ تک نہ آسکا اور واپس آ کر سخت علیل ہوگئے۔

بللہ مجھے معاف کرنا، نہ معلوم کیوں —— شاید اس دل کی بے قراری اور تلاطم جذبات نے مجھے تمھاری تحریر کے باور کرنے سے باز رکھا۔ یہ جو تم نے مجھ سے یوں استفسار کیا ہے تو اس کا جواب تم اپنے ہی ضمیر میں تلاش کرو۔ مجھے یقین ہے کہ تمھارا ضمیر خود تم کو مجھ سے بہتر جواب دے سکے گا۔ —— اور اس کا فیصلہ بھی تم ہی پر رکھتی ہوں...... !

تمھیں کیا معلوم کہ مَیں نے تم کو کھو کر کیا کھو دیا —— وہی اور بالکل "وہی" جو چاند گہن کے بعد اور پھول مُرجھانے کے بعد —— نہیں! مَیں نے غلطی کی۔ مَیں نے اس سے بھی زیادہ کھو دیا!

دنیا انسان کی مجبوریوں کے تسلسل کا نام ہے، اور اس ربابِ حیات کا نغمہ جاں نواز نہیں جاں کاہ ہے، آہ اب اس شکستہ تار پر یادِ رفتہ کی مضراب نہ لگاؤ...... !

آہ، اُس تارہ کی کیا قسمت جو رات بھر دیدۂ بیدار کی طرح ضیا پاشی کے جلوؤں کا منظر رہا —— اور بقا اور فنا کے ایک نحیف خطِ درمیانی پر آ کر ڈوب گیا —— ہمیشہ کے لئے فنا ہو گیا۔

غم نصیب کا پرسانِ حال کون ہے ؟

سراپا آرزو ہوں، درد ہوں، داغِ تمنا ہوں
مجھے دنیا سے کیا مطلب، کہ میں آپ اپنی دُنیا ہوں

"رابعہ"



.........رابعہ نواز !

اگر مجھے کوئی تم پر فطری حق ہے اور مجھے تم سے کسی سوال کے دریافت کرنے کا مجاز ہے تو میں تم سے اتنا ضرور پوچھوں گی کہ آخر میرا کیا قصور تھا، جو تم نے خط بھیج کر بھولے ہوئے قصہ کو پھر یاد دلایا؟ ذرا غور کرنا، تم کو اس سے کیا فائدہ ملا —— وہ زخم جواب مندمل ہو رہا تھا تم نے اسے نشتر کے اشارہ سے پھر ہرا کر دیا۔ آج پھر مجھے زخمِ دل کی ٹیس میں وہ لذت مل گئی جس سے دلوں سے کم آشنا ہو رہی تھی......

...... ایک عرصہ تک میری سعی اور صلہ میں یوں ہی کشمکش رہی۔ خاموش اور ساکت بیٹھی اپنی کوششوں کی شکست دیکھا کی۔ اپنے احساسات کا مدوجزر دیکھا کی —— میری کھوئی کائنات مجھے دوبارہ مل گئی۔ اور یہ سیلابِ اشک نہ جانے کیوں اُمڈا چلا آرہا ہے۔ قطرات ٹپک رہے ہیں اور میں روک نہیں سکتی آہ —— آہ انھیں آنسو سمجھ کر یوں نہ مٹی میں ملا ظالم   پیامِ دردِ دل ہے اور آنکھوں کی زبانی ہے

——مجھے میری کھوئی ہوئی چیز مل گئی —— آہ تمھارا خط!

مگر میں یہ کوشش کروں گی کہ تم کو آئندہ خط لکھنے کے خیال کی بھی جرأت نہ کروں۔ اِس خیال سے بھی ایسی ہی نا آشنا رہونگی، جس طرح میرے دلِ محزوں سے آرام ناواقف ہے۔

دیکھو—— خدارا مجھ پر رحم کرو۔ اس مزید تلطف سے دبی ہوئی آگ کو نہ بھڑکاؤ۔ مجھے یاد نہ کرو....... مجھے دوبارہ خط نہ لکھنا—تم سمجھ گئے..... غالباً مان بھی جاؤ گے۔

"رابعہ"



پیاری نجمہ!

وائے مجبوری کہ تم اس وقت موجود نہیں، ورنہ تمھارے گلے میں باہیں ڈال کر چپکے سے ایک راز کی بات کہتی...... ایسا راز جو تمھارے "جمیل" سے بھی پوشیدہ ہے۔

دیکھو نجمہ تم کو معلوم ہے کہ میرا ارادہ تھا کہ میں اب کبھی بھی اُن سے نہ ملونگی ——

کیوں، تم جانتی ہو، اس لئے کہ میرا خیال تھا کہ اُنھوں نے "فریب" کیا، مگر حقیقت یہ ہے کہ اُن کی ذات فریب سے بری ہے۔ میں نے خود ہی اپنے آپ کو فریب دیا...... میرے وہم غلط کار نے مجھے دھوکا دیا، کل کی بات ہے "وہ" واپس آئے —— میرے کمرے میں داخل ہوئے —— بخار چڑھا ہوا تھا چہرہ نڈھال تھا اور حالت سے عجب سراسیمگی عیاں تھی —— ہاں تو "وہ" آئے، میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہوگئے۔ اِن کمبخت آنسوؤں کا بُرا ہو کہ زبان تو بند ہوگئی اور خود ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ مجھے یوں روتا دیکھکر بولے" رابعہ... آخر یہ کیوں.... کیا تم مجھ سے ناراض ہو..... نہیں تم ناراض کیوں ہوتیں.... بولو... بتاؤ" اُن کا ہاتھ بخار میں جل رہا تھا، اُن کے ہاتھ کی گرمی سے ایسا معلوم ہوا گویا ایک بجلی میرے بدن میں سرایت کرگئی، اور تمام جسم میں ارتعاش پیدا ہوگیا۔ میں نے پوچھا" کیا آپ واقعی بیمار تھے؟" بولے" اگر تم یقین لاسکو تو باور کرو، میں پہونچنے کے بعد ایسا بخار میں بیہوش ہوا کہ ڈاکٹر نے گفت وشنید بھی منع کردی اور جو خطوط تمھارے مجھ تک گئے وہ ملازم ہی تک رہے اور میں کیفیت سے آگاہ نہ ہوسکا—— ایک ہفتہ بعد وہ خطوط مجھے ملے، علالت سے دماغ ایسا مختل ہوچکا تھا کہ بمشکل تمھارے خطوط کا مفہوم لے سکا، اور اس پر بھی اس آخری خط کو تو سمجھ ہی نہ سکا۔ اب اس خط کو لیتا آیا ہوں، تم پڑھو، پڑھکر سناؤ...... مجھے خود بتاؤ کہ آخر مجھ سے یہ ناراضگی کا کیا باعث...... بتاؤ، جلد بتاؤ۔ ورنہ میرا دماغ اور بھی مختل ہوجائیگا"۔

تمھیں بتاؤں کہ میں اُن کے استفسار پر کس قدر خجل اور نادم ہوگئی......میں نے وہ قصور کیا ہے جو شاید تو "وہ" تو معاف کردیں مگر کوئی اور (غالباً تم بھی) معاف نہ کرسکتا۔ میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں، دل میں ایک خوشی کی لہر پیدا ہوئی...... میری آواز بھر گئی میں نے ہرچند چاہا کہ دل کو قابو میں لاسکوں..... مگر تم جانتی ہو کہ یہ میرے بس سے باہر تھا میں نے مسکرا کر اُن کے زانو پر خط پھاڑتے ہوئے کہا "کیا تم اپنی رابعہ کے اس حماقت کو معاف کردوگے"...... سچ جانیئے میرے وہم نے مجھے دھوکا دیا، میری غلط فہمی......!"

میں نے دیکھا کہ اُن کے ہونٹوں پر بھی تبسم رقص کرنے لگا اور بولے "رابعہ... کیا یہ وہی تبسم ہے جس کا ذکر تم نے پہلے خط میں کیا تھا...." اُن کی نظریں بتا رہی تھیں کہ اُنھوں نے مجھے معاف کردیا۔

پیاری نجمہ، میں جانتی ہوں کہ تم اپنے دل میں کس قدر مجھ پر ملامت کروگی، اور غالباً زبان سے بھی کیا کیا کچھ کہہ ڈالوگی ـــــ میں اُس سے بھی زائد سُننے کے لائق ہوں۔ مگر یہ سمجھ لینا کہ اگر تم نے اپنے "جمیل" سے اشارتاً بھی اس کے متعلق کچھ کہا تو ایسی چٹکی لونگی جو یاد رہے۔ اچھا میں نے تم کو بہت دیر تک میاں "جمیل" کے خیال سے دور رکھا..... سمجھ گئیں اپنے میاں جمیل سے نہ کہنا ورنہ ایسی دُکھتی رگ پکڑی ہو کہ یاد رہے:-

اپنی ہستی کے جوانوار سے بیگانہ رہے وہ فقط چند "حجابات" کا دیوانہ رہے

تمھاری رابعہ

رونقِ لالہ زار

(از مس کے۔ احمد شجاع عصمت)

رونقِ لالہ زار کیا کہیئے ہے گلوں پر بہار کیا کہیئے
غنچہ و گل پہ پھٹ پڑا ہے شباب جوش پر ہے بہار کیا کہیئے
اُٹھ گیا ہے حجاب بلبل و گل لذتِ شوقِ یار کیا کہیئے
چشمِ بلبل کے سُرخ ڈوروں پر ہے بلا کا خمار کیا کہیئے
مسکراتا ہے غنچہ نوخیز پھول ہے مشکبار کیا کہیئے

آج یادِ انیس اے عصمت
آتی ہے بار بار کیا کہیئے

قیودِ علائق

(از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش، ایم-اے)

بشر تو ہے بستۂ علائق یہ سہہ رہا ہے کہاں کی قیدیں
کڑی جو ہیں اِس زمیں کی قیدیں تو سخت ہیں آسماں کی قیدیں

کہیں جو ثقلِ زمیں سے ہٹتا تو اہلِ حکمت یہ کیا نہ کرتا
یہ اُڑ کے عرشِ بریں پہ جاتا، اگر نہ ہوتیں مکاں کی قیدیں

زمیں کو تا سطحِ مہ اُٹھاتا، جو مستقر مہر میں یہ پاتا
کبھی نہ اِن پستیوں کا مارا یہ جھیلتا اِس جہاں کی قیدیں

نفس نفس میں جو اُلجھنیں ہیں، قدم قدم پر ہیں سخت پھندے
زمیں کی قیدیں زماں کی قیدیں، مکیں یہ ہیں سو مکاں کی قیدیں

ہوا ہے مجروح آہ کیا کیا، ہمارا ذوقِ نجات اِن سے
ارے یہ خود اپنے خوں کے چسکے، ارے یہ حظِّ نہاں کی قیدیں

کہاں ہیں مدہوش اہلِ ظلمت، عذابِ زندانیت یہ کیوں ہے
بتاتے کچھ اہلِ راز ہم کو، مگر ہیں اُن پر زباں کی قیدیں

رُباعی

بیٹھے ہو اداس اہلِ ظلمت! صد حیف!! — خود ہو گئے وقفِ یاس اہلِ ظلمت! صد حیف!!
ظلمات کے آگے آبِ حیواں بھی ہے — ہو عاصیِ ناسپاس اہلِ ظلمت! صد حیف!!

مدہوش

عراقی کی ایک غزل

اور اُس کا ہندوستانی ترجمہ

(از سیّد مقبول حسین، احمد پوری، بی۔ اے)

بہ شرارہ قلندر بہ زن اَز حریف مائی
کہ نماند بیش مارا سرِ زہد و پارسائی

جوگی کی جیون جوالا سے بارے دل کا دیپک بھائی
پوجا پاٹ سے اپنی طبیعت، گیانی اب تو بہت اُکتائی

نیَم اہلِ زہد و تقویٰ بمن آر ساغرِ مے
کہ بہ صدق توبہ کردم ز عبادتِ ریائی

تَپَسی بھگت نہیں ہم کوئی بھر دے پریم کے رس کا پیالہ
تج کے دِکھاوے کی سب باتیں پریم سے ہم نے لگن لگائی

تو مرا شراب دردہ کہ ز توبہ توبہ کردم
ز صلاحِ خود ندیدم ہمہ لافِ خود نمائی

مجھکو پریم کی مَدِرا لادے، توبہ سے بھی توبہ کرلی
اپنے مُنھ سے اپنی بڑائی، پریمی مجھکو راس نہ آئی

چو زِ بادہ مست گشتم چہ کلیسا و چہ کعبہ
چو بترکِ خود گرفتم چہ وصال و چہ جدائی

مست ہوئے جب پریم سے گیانی، کعبہ اور کیلاش برابر
تج کے خودی بیراگ لیا تو ایک ہوئے سنجوگ جدائی

بہ قمار خانہ رفتم ہمہ پاکباز دیدم
چو بصومعہ گزشتم ہمہ یافتم دَغائی

گئے جُوا گھر ہم تو دیکھا ایک سے ایک بھگت تھا بیٹھا
مٹھ کے رستے آن پڑے تو کرنے لگا ہر ڈھیٹھ ڈھٹھائی

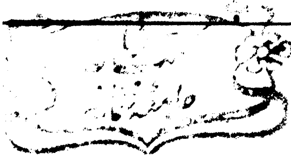
بطوافِ کعبہ رفتم بہ حَرَم رَہَم ندادند
کہ بروں تو خود کہ باشی کہ درونِ کعبہ آئی

گئے جو کعبے کے درشن کو، روک لیا بھیتر جانے سے
کہا ہٹو اور دُور کھڑے ہو، یہاں تمھاری نہیں سَمائی

درِ دَیر می زدَم سر زِ درون ندا برآمد
کہ بیا بیا عَراقی تو ز خاصگانِ مائی

گئے شِوالے بُت پوجن کو، بھیتر سے یہ کہا کسی نے
آؤ عَراقی آؤ آؤ، تم نے محبّت خوب نبھائی





تنقید کتب

تاریخ گولکنڈہ[1]

دکن میں سلطنت بہمنیہ کے زوال کے بعد اس کے کھنڈروں سے پانچ نئی سلطنتیں گولکنڈہ۔ احمد نگر بیجاپور۔ بیدر اور ایلچ پور۔ قطب شاہی، نظام شاہی، عادل شاہی، بریدشاہی، اور عماد شاہی کے نام سے قائم ہوگئی تھیں۔ ان میں احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈہ کی سلطنتیں خاص طور پر اہمیت رکھتی تھیں۔ چنانچہ اس کتاب میں مولانا عبدالمجید صاحب صدیقی، ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی، پروفیسر تاریخ جامعہ عثمانیہ نے سلطنت گولکنڈہ کی مفصل تاریخ لکھی ہے۔ اس میں پانچ حصے اور چوبیس باب ہیں۔ پہلے حصہ میں سلطنت گولکنڈہ کی بنیاد، دوسرے میں استحکام تیسرے میں عروج، چوتھے میں زوال اور پانچویں میں ریاست کے تمدنی حالات درج ہیں۔ گولکنڈہ کا آخری بادشاہ ابوالحسن قطب شاہ ہوا ہے جسے عرف عام میں تاناشاہ کہتے ہیں مغل مورخین نے اس کی شخصیت اور کیرکٹر کو بہت مذموم رنگ میں پیش کیا ہے۔ لیکن فاضل مصنف نے مستند حوالوں سے کام لیکر مغل مورخین کے تمام الزامات رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کوشش میں وہ کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا حال کتاب کے مطالعہ سے ظاہر ہوگا کتاب محنت سے لکھی گئی ہے، اور شاہان قطب شاہی کی تصویریں بھی دیگئی ہیں جن سے کتاب کی دلچسپی اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اس کتاب کا پانچواں حصہ جس میں گولکنڈہ کے تمدن سے بحث کی گئی ہے خاص طور پر قابل قدر ہے لکھائی، چھپائی، کاغذ سب عمدہ، جلد انگریزی۔

کتب سلسلۂ یوسفیہ

عام خیال ہے کہ اردو نظم کی ابتدا ولی دکھنی سے ہوئی۔ لیکن جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ ولی دکھنی سے بھی پہلے دکن میں بہت سے بلند پایہ شاعر گزرے ہیں، اگرچہ ان کی زبان اس قدر صاف نہیں تھی جتنی کہ ولی کی ہے۔ اس کے علاوہ پرانے دکنی شاعروں کی توجہ زیادہ تر مثنویوں کی طرف رہتی تھی، غزل بھی کہتے ہونگے مگر کم۔ نظم اردو کو زیادہ تر ترقی کا موقعہ سلاطین عادل شاہیہ و قطب شاہیہ کے عہد میں ملا، جو خود بھی شعر کہتے تھے اور شاعروں کی سرپرستی و قدر افزائی کرتے تھے۔

مدتوں سے ان پرانے دکنی شاعروں کی تصانیف گمنامی میں پڑی تھیں۔ لیکن ۱۳۵۶ھ میں سٹی کالج

[1] قیمت ساڑھے تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ سب رس کتاب گھر، خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن۔

حیدرآباد میں ولی دکنی کی جو دو صد سالہ برسی منائی گئی اور اس کی نمائش میں بہت سے پرانی تحریرات ایسی فراہم ہوگئیں جو پرانے دکنی شاعروں کی تصانیف تھیں یا ان سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس نایاب موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے "جشن یادگار ولی" کے صدر نواب سالار جنگ صاحب بہادر نے تحریک کی کہ اس جشن کی مستقل یادگار میں ولی کے معاصرین اور ان سے پہلے کے شاعروں اور مصنفوں کی اردو کتابیں مرتب اور شائع کی جائیں۔

چنانچہ چھ سات اہل علم اور محققین کا ایک بورڈ سید محمد اعظم صاحب پرنسپل سٹی کالج حیدرآباد کی صدارت میں قائم ہوگیا۔ اور مختلف اصحاب نے مختلف دکنی شاعروں اور مصنفوں کی تصانیف کی ترتیب کا کام اپنے ذمہ لیا جس کا نتیجہ "کتب سلسلۂ یوسفیہ" کی صورت میں برآمد ہوا جس میں سے اس وقت پانچ کتابیں ہمارے پیش نظر ہیں اس سلسلے کی پہلی کتاب

۱۔ پھول بن

ہے، جو دکنی اردو کی مثنوی ہے جسے ۱۰۶۶ھ میں گولکنڈہ کے شاعر ابن نشاطی نے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں لکھا تھا۔ یہ مثنوی چند قصوں کا مجموعہ ہے، جس میں من براد رہمایوں فال کا قصہ تو خاص ہے اور باقی حصے ضمنی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان قصوں کی نوعیت ویسی ہی ہے جیسے "گل بکاؤلی" یا "باغ وبہار" کی۔ البتہ جس زبان میں یہ مثنوی لکھی گئی وہ اس زمانہ کی فصیح ترین زبان تھی۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

اول میں حمد رب العالمیں کا ۔۔۔ دل و جاں سوں لکھوں جاں آفریں کا

خداوندا تجھے ہے جسیم غذائی ۔۔۔ ہمیشہ تجکوں سا جے کبریائی

ازل کوں نیں سمجھ تیرا ابتدا ۔۔۔ ابد کوں فہم میں تیرا نہایت

مولوی عبدالقادر سروری صاحب کی کوششیں قابل تحسین و داد ہیں جنھوں نے کافی مطالعہ، تحقیق و تدقیق کے بعد یہ کتاب مرتب کی ہے حتی کہ تلاش و تجسس میں انھوں نے فرانسیسی محققین موسیو گارسان دتاسی، اور انگریز محقق اسٹوارٹ کی تحریروں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ کتاب کے پہلے حصے میں "پھول بن" اور اس کے مصنف پر ایک مبسوط اور فاضلانہ مقدمہ ہے، دوسرے حصہ میں اصل مثنوی ہے جو پونے دو سو صفحوں تک چلی گئی ہے۔ فٹ نوٹوں میں جا بجا ان نسخوں کے حوالے دیئے گئے ہیں جن سے متن کی صحت کی گئی ہے سلطان عبداللہ قطب شاہ اور مثنوی کے مصنف ابن نشاطی کی تصویریں بھی کتاب میں شامل ہیں جو تاریخی حیثیت سے بہت دلچسپ ہیں

۲۔ کلام الملوک

دکن کی مشہور سلطنت بہمنیہ اور اس کے انتشار کے بعد عادل شاہی، قطب شاہی وغیرہ جو سلطنتیں

دکن میں قائم ہوئیں اُن کے سلاطین علم و ادب کے قدردان ہونے کے علاوہ خود بھی شاعر و ادیب تھے، مگر ان کا کلام گوشہ گمنامی میں پڑا ہوا تھا۔ اب میر سعادت علی رضوی صاحب ایم۔اے نے بڑی تلاش و تجسس سے ان کا فارسی کلام مرتب کر کے ایک فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ "کلام الملوک" کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب گویا دکن کے شاعر بادشاہوں کا تذکرہ ہے جس میں سلطان محمد ثانی بہمنی، سلطان سکندر بہمنی، فیروز شاہ بہمنی، سلطان یوسف عادل شاہ، اسمٰعیل عادل شاہ، ابراہیم عادل شاہ، سلطان جمشید قلی قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ، سلطان محمد قطب شاہ کے مختصر حالات اور اُن کے فارسی کلام کے نمونے درج ہیں۔ اس میں سلاطین دکن کی تصویریں اور اُن کے شجرے بھی دیدیئے گئے ہیں۔ جن کی وجہ سے اس کتاب کو تاریخی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ ہفت بند کاشی کے نمونہ پر گولکنڈہ کے بادشاہ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے جو بند لکھے ہیں وہ پڑھنے کے قابل ہیں۔ تیسری کتاب طوطی نامہ ہے۔

۳ - طوطی نامہ

جو سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ کے شاعر ملا غواصی کی تصنیف ہے اور ۱۰۴۹ھ میں لکھی گئی تھی اسے میر سعادت رضوی ایم۔اے نے تحقیق و تدقیق کے بعد مرتب کر کے پبلک کے سامنے ایک فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں ایک چالاک طوطے کی زبانی بہت سی مختصر کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ اصل کتاب سنسکرت زبان میں "شکا سپتتی" (طوطے کی بیان کردہ ستر کہانیاں) تھی، اس کی باون کہانیوں کا مولانا ضیاء الدین بخشی نے ۷۳۰ ہجری میں فارسی زبان میں ترجمہ کیا، اور ملا غواصی نے اس کتاب کا مثنوی کی بحر میں دکنی زبان میں ترجمہ کیا لیکن صرف بنیتالیس کہانیاں رکھیں۔ اُردو زبان میں یہ کتاب نثر میں "طوطا کہانی" کے نام سے پہلے ہی سے موجود ہے۔ طوطی نامہ کی نظم کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے:۔

جو آیا نکل دیس اقبال کا　　ہوا شاد سینا مرے حال کا
صفا آرسی طبع کی پائی پھر　　نوی دولت ایک مو کہ دکھلائی پھر
مرے بخت کا دیک تارا توی　　کیا زمانا مری پھیر دی

کتاب میں عبداللہ قطب شاہ اور ملا غواصی کی تصویریں بھی شامل ہیں، اور مرتب صاحب کا مقدمہ قابل دید ہے۔

۴ - قصہ بے نظیر

یہ مثنوی ۱۰۶۵ھ کی تصنیف ہے جسے سلطان محمد عادل شاہ بیجاپور کے زمانہ میں صنعتی نے مثنوی کی صورت میں لکھا تھا۔ قصہ الف لیلہ کے سندباد جہازی کی سیر و سیاحت کے قصوں کی وضع کا ایک بے سر و پا قصہ ہے جس میں زیادہ تر جنوں اور پریوں کا ذکر ہے۔ یہ قصہ "قصہ ابو تمیم انصاری" کے نام سے مشہور تھا۔ جسے

صنعتی نے نظم کردیا۔ اب بہت کچھ ریسرچ کے بعد مولوی عبدالقادر سروری ایم۔ اے۔ ایل ایل بی۔ نے مرتب کرکے شائع کیا ہے۔ مقدمہ میں صنعتی کے حالات زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے کلام پر بھی تنقید کی گئی ہے۔ مثنوی کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

ثنا بول اول تو سبحان کا — جو خلاق ہے جن و انسان کا

بشر کو اپس قدرتِ پاک سوں (اپنی، سے) — بنایا اگن جل پون خاک سوں (آگ پانی ہوا)

اپس ہات سوں راست کر اس شتاب — دھریا مہربانی سوں آدم خطاب (دیا)

۵۔ سیف الملوک و بدیع الجمال

یہ ایک دلچسپ قصہ ہے جس میں سیر و سیاحت اور گل بکاؤلی کی وضع کے عناصر سمو دیئے گئے ہیں۔ ۱۰۳۵ھ میں مُلا غواصی نے مثنوی کی بحر میں لکھا تھا۔ جسے اب میر سعادت علی صاحب رضوی نے مرتب کرکے ایک فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اِن پانچوں کتابوں کی لکھائی اور چھپائی میں خاص اہتمام کیا گیا ہے، کاغذ بھی عمدہ اور قیمتی لگایا گیا ہے۔ پانچوں کتابیں بڑی تقطیع کی ہیں اور خاصی ضخامت رکھتی ہیں۔ شائقین سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدر آباد دکن سے طلب کریں

گرام سُدھار

ترقیِ دیہات کے موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، لیکن یہ چھوٹی سی کتاب بھی اسی طرز کی ایک کتاب ہے، جس میں مختلف عنوانات پر بحث کی گئی ہے۔ مثلاً کسان کا گھر، کسان اور زمیندار، کسان اور ساہوکار، کسان اور حکومت گاؤں میں بیماریاں، کسان کے مویشی، کسان کو کیا کرنا چاہیئے۔ حکومت اور کسان کے تعلقات کے سلسلے میں بہت سی مفید باتیں لکھی گئی ہیں۔ اگرچہ فاضل مصنف کا طرز بیان سہل اور عام فہم ہے مگر بعض بعض جگہ کسی قدر اُلجھ گیا ہے اُمید ہے کہ پروفیسر عبدالشکور صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ بریلی کالج جو اس کتاب کے مصنف ہیں، آئندہ ایڈیشن میں انھیں صاف کردیں گے۔ لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ حجم ۱۲۰ صفحات قیمت صرف چھ آنہ۔ ملنے کا پتہ منیجر اسلامیہ گرلس ہائی سکول بریلی

ضروری باتیں

اِس چھوٹے سے رسالے میں مولوی عبدالشکور صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ بریلی کالج نے کسانوں کے فائدے کے لئے صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کے تمام جغرافیائی اور تاریخی و اقتصادی حالات عام فہم زبان میں مختصراً بیان کردیئے ہیں اور دو نقشے بھی دیئے ہیں۔ لکھائی چھپائی، کاغذ عمدہ، حجم سوا دو جزو۔ قیمت دو آنے ملنے کا پتہ منیجر اسلامیہ گرلس ہائی اسکول بریلی

"عصمت" کی کہانی

اِس چھوٹے سے پمفلٹ میں دہلی کے مشہور زمانہ رسالۂ "عصمت" کی اٹھائیس سالہ تاریخ بیان کی گئی ہے۔ لکھائی چھپائی، کاغذ عمدہ، حجم نوّے صفحے۔ قیمت آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ عصمت بک ڈپو۔ دہلی۔

لطفِ سخن

شمیم - خواجہ عبداللطیف صاحب بھیروی

وہ آئے تو دنیا ہی دل کی بدل دی
گئے تو بھرے گھر میں ویرانیاں ہیں

یہ طوفانِ جلوہ، یہ جذبِ تجلّے
نہ جوشِ نظر ہے نہ حیرانیاں ہیں

وہ "دادِ نفس" پر پشیماں ادھر ہیں
ادھر میرے درپے گراں جانیاں ہیں

شمیمؔ اس جوانی میں پینے سے توبہ
بداندیشیاں ہیں یہ نادانیاں ہیں

صابر - مسٹر اے۔ بی۔ فلپس اکبرآبادی

ناخدا اپنے سفینے کا اگر دل ہو جائے
موجِ طوفاں جو اُٹھے دامنِ ساحل ہو جائے

تو بھی بیچارگیِ عشق کا قائل ہو جائے
او ستمگار مرا دل جو ترا دل ہو جائے

آشنا اپنی حقیقت سے اگر دل ہو جائے
خود بخود اُٹھ کے الگ پردۂ حائل ہو جائے

ذرّے سب حسن کی بگڑی ہوئی تصویریں ہیں
جس کو دامن میں اُٹھا لوں وہ مرا دل ہو جائے

شوق میں صورتِ تسکیں ہے فقط بیخبری
پھر قیامت ہے جو اندازۂ منزل ہو جائے

حسرتیں جمع ہوں میری تو بنے اُن کی شبیہ
اُن کے جلوے جو ہوں یکجا تو مرا دل ہو جائے

جب پریشان خیالات کی تصویروں کو
اِک قرینے سے سجا دیجئے محفل ہو جائے

ایک آشوبِ مسلسل ہے یہ دنیا صابرؔ
صبر فطرت میں نہ شامل ہو تو مشکل ہو جائے

(سید محمد عسکری طباطبائی، بی۔اے۔ بلندشہر)

ہو دل تو وردِ مجسم، نظر گلا نہ کرے
کسی غریب پہ یوں آ بنے، خدا نہ کرے

وہ دل کی اِک نہ سنیں دل مرا کہا نہ کرے
پڑے کسی سے کسی کی غرض، خدا نہ کرے

جنونِ عشق کی معصوم حسرتیں، توبہ!
وہ منتیں کریں، دل عرضِ مدعا نہ کرے

نگاہِ ناز ہو جب آپ سلسلہ جنباں
تو کون ہوگا جو تجدیدِ مدعا نہ کرے

کسی کے وعدۂ فردا کی شرم رہ جائے
خدا کرے کہ مری زندگی وفا نہ کرے

شبِ فراق کے تارے یہ کہہ کے ڈوب گئے
کسی کا کوئی محبت میں آسرا نہ کرے

ظفر۔ جناب شیخ محمد یوسف صاحب، بی۔اے۔

وہ یاد آگئے تو قیامت ہی ڈھا گئے　　　ہم زندگی میں موت کا احساں اُٹھا گئے
جن کو نہ تھیں قبول دو عالم کی وسعتیں　　　لو! وہ سمٹ کے میری نگاہوں میں آگئے
ممنون ہوں کہ عہدِ جنوں میں مرے لئے　　　تم میرے ساتھ ساتھ، جہاں بھی گیا، گئے
اللہ رے اہتمام کہ ہلنے دیئے نہ لب　　　وہ رازِ عشق چاکِ گریباں سے پا گئے
کچھ مسکرا کے، کچھ نگہِ شرمگیں کے ساتھ　　　اپنا بنا گئے، مجھے اپنا بنا گئے
گیسو کھلے تو کھول دیا عقدۂ حیات　　　نظریں ملیں تو رازِ دو عالم بتا گئے
یہ دن شباب کے ہیں ظفر، دن غباب کے　　　وہ آج آگئے تو یہ سمجھیں گے آ گئے

فطرت۔ جناب ایم۔ عبدالعزیز صاحب۔ راولپنڈی

دفعتاً چاک ہر اک پردۂ حائل ہونا　　　تیری محفل کا مرے شوق کی منزل ہونا
رنگِ غم کا مرے ہر اشک میں شامل ہونا　　　بننا قطروں کا گہر، اور ترے قابل ہونا
حسن کی کم نگہی پر بھی ہے یہ عشق کا حال　　　دل کے ہر داغ نے سیکھا مہِ کامل ہونا
کتنی احساس فزا تھی تری محفل کی فضا　　　ذرے ذرے کو میسر ہے یہاں دل ہونا
رفتہ رفتہ ترے چہرے سے سرکنا پردہ　　　ہوتے ہوتے مہِ نَو کا مہِ کامل ہونا
جز کے دل میں ہے نہاں کُل کی تمنا فطرت　　　حسرتِ ذرہ ہے خورشید سے واصل ہونا

فطرت۔ جناب فطرت واسطی۔ فیض آباد

آتا ہوں تیرے دید کا ارماں لیئے ہوئے　　　عزمِ نظر ہے، ذوقِ بہاراں لئے ہوئے
لَو دے رہے ہیں داغ بھی دل میں خدا گواہ　　　تاریکیاں ہیں بزمِ چراغاں لئے ہوئے
مَیں بے سکت ہوں پھر بھی مری عظمتیں نہ پوچھ　　　ہر ہر قدم ہے گردشِ دوراں لئے ہوئے

کاظمی۔ جناب سید فضل الحسن شفقت کاظمی

(۱)
عجب اک رنگِ مایوسی مرے رخ سے جھلکتا ہے　　　نگاہِ یار کو بھی جس کے نظارے سے سکتا ہے
نہیں بدلی ہے اب تک انتظارِ شوق کی حالت　　　ہجومِ نامرادی میں بھی تیری راہ تکتا ہے
کبھی روشن کیا تھا جس کو تیری خوش جمالی نے　　　وہ شعلہ آج بھی اپنے کلیجے میں بھڑکتا ہے
وہ جب اپنے کسی پابند کو آزاد کرتے ہیں　　　خدا جانے کہ پہروں تک دل اپنا کیوں دھڑکتا ہے
کہوں کیا اُس نگاہِ سحر زا کی کارفرمائی　　　کہ اب دل کی جگہ پر ایک کانٹا سا کھٹکتا ہے

سُنانے کو تو بیٹھے ہو اُنھیں روداد غم اپنی — اگر وہ کاظمی کہدیں "ارے کیا لغو بکتا ہے؟"

دامنِ ضبطِ محبت ہاتھ سے جانے لگا — (۲) پھر ترے روزِ جدائی کا خیال آنے لگا

اے مری رسوائیوں سے تھی بہت تجھ کو خوشی — ہر زباں پہ تذکرہ تیرا بھی اب آنے لگا

حسن کی حسرت نگاہی نے لئے کیا کیا قدم — اُٹھ کے اُس محفل سے جب مجبور میں جانے لگا

شوق کی مایوسیاں آخر کو آڑے آگئیں — دہ تو وہ اب غیر بھی مجھ پر ترس کھانے لگا

کاظمی پاکر مجھے مجبورِ آئینِ وفا — اور بھی وہ شوخ مشقِ ناز فرمانے لگا

گوھر - جناب ڈاکٹر بر پرشاد صاحب دہلی

ہنستے ہوئے بہار کی صورت گزر گئے — دامن ہمارا پھولوں سے آکر وہ بھر گئے

دل لے کے کیا غرض انھیں کیوں ہم کلام ہوں — جو وار کرنے والے تھے وہ وار کر گئے

بدلی سی چھا گئی دلِ امیدوار پہ — گیسو جو رُخ پہ آپ کے کھُل کر بکھر گئے

محبوس کو خبر نہیں گوہر بہار کی — جھونکے نسیم کے کدھر آئے کدھر گئے

مسیح - جناب مسیح الدین صاحب بمبئی

رہ رہ کے چھیڑتا ہے غمِ انتظار کیوں؟ — مِٹ مٹ کے بن رہا ہے دلِ بیقرار کیوں؟

کیفِ نظر پیامبرِ حُسن دوست ہے! — لذت فزائے غم ہوا بر بہار کیوں؟

غارت گرِ شباب تھا انجام آرزو! — تڑپا رہی ہے پھر مجھے فصلِ بہار کیوں؟

گم کردۂ فریب ہے ارمانِ زندگی! — خونِ جگر سے سینچئے اِک لالہ زار کیوں؟

کیا آگئے بہار کے دن آج کل مسیح — پھر سوئے دشت جاتے ہو دیوانہ وار کیوں؟

ساغر - جناب جگدیش پرشاد ناظر - مراد آبادی - ایم اے -

نہ پوچھو تم شبِ غم میرے آنسو اپنے داماں سے — جہاں کا خون کھنچتا ہے محبت کے رگِ جاں سے

نظامِ کائناتِ عشق برہم ہونے والا ہے — جبینِ ناز پر ہیں آج گیسو کچھ پریشاں سے

خزاں کا خوف، فکرِ آشیاں - صیاد کا کھٹکا — یہی پابندیاں ہیں تو قفس اچھا گلستاں سے

کہیں ایسے دیار و ملک بھی آزاد ہوتے ہیں — ہوا انس و محبت جس جگہ انسان کو انساں سے

نہ جانے کیسے مل جاتا ہے لوگوں کو خدا حسرت — ہمیں تو ہو گیا دشوار ملنا ایک انساں سے

نظامی - حضرت - نظامی - بدایونی

جدا بھی ہیں ہے جدا بھی ہے مجھ سے — وہ واصل بھی ہے اور واصل نہیں ہے

مرے دل کو ٹھکرا کے غصہ سے بولے
نگاہِ محبت کے قابل نہیں ہے

اُسے لطف آتا ہے مشقِ جفا میں
ستم سے کسی وقت غافل نہیں ہے

جہاں ہم سے آزاد بھی وقت کاٹیں
یہ محفل تمھاری وہ محفل نہیں ہے

مساوات کا مدعی ہے نظامی
گدا گر نہیں ہے وہ سائل نہیں ہے

وجدا - جناب سکندر علی صاحب کناڈ دکن

دردِ دل کو باعثِ آرامِ جاں سمجھا تھا میں
برقِ گلشن کو چراغِ آشیاں سمجھا تھا میں

یاس کی شدت نے دنیا ہی بدل ڈالی مری
عیش کو اب تک نصیبِ دشمناں سمجھا تھا میں

دل بہا اشکوں میں کب اس کی خبر تک بھی نہیں
خون کے قطرے کو بحرِ بیکراں سمجھا تھا میں

یاد ہیں وہ دن چڑھا تھا نشۂ رنگِ بہار
بیخودی یہ تھی قفس کو گلستاں سمجھا تھا میں

قافلہ ہے اور نہ وہ محمل نہ وہ محمل نشیں
وجدا گرد کارواں کو کارواں سمجھا تھا میں

مائل - جناب ایشور چند سیٹھ غازی آباد

میں اک مایوس ہستی ہوں میں ناکام تمنا ہوں
زمانے سے نرالی اپنے غم کی آپ دنیا ہوں

میں اک اعجاز حسن و عشق کا اسکو سمجھتا ہوں
وہ ہیں میری تمنا اور میں ان کی تمنا ہوں

دلِ بیتاب میں اب اور گنجائش کہاں باقی
تمہاری یاد ہے اس میں تمہارا درد رکھتا ہوں

خدا کیواسطے اس کو بھی اب لے لیجئے مجھ سے
جو اتنا ہوش باقی ہے کہ معروفِ تماشا ہوں

مجھے کس بزم میں پہونچا دیا مائل مرے دل نے
نہ اُن کو دیکھ سکتا ہوں نہ خود بھی بیٹھ سکتا ہوں

(۲)

جلوے ترے اس دل میں اگر کاش نہاں ہوتے
ہم کس لیئے راتوں میں معروفِ فغاں ہوتے

جب لطف سمجھتا میں اس طرح اگر ملتے
میں اُن میں چھپا ہوتا وہ مجھ میں نہاں ہوتے

اے کاش جھلک اُٹھتی آرائشِ جزو و کل
میں تم سے عیاں ہوتا تم مجھ سے عیاں ہوتے

شاید کہ پہونچ جاتا منزل پہ کبھی اپنی
ذرّے مری ہستی کے گر ریگِ رواں ہوتے

اک کعبہ سمجھتا ہوں ہر نقشِ قدم اُن کا
پھر اُس پہ یہ خواہش ہے کچھ اور نشاں ہوتے

تم خود نہ دکھا دیتے جلووں کو اگر اپنے
وہ لاکھ چھپانے پر تم سے نہ نہاں ہوتے

اچھا ہوا محشر میں تم دور رہے مجھ سے
میں چپ نہ کبھی رہتا یوں منہ میں زباں ہوتے

تم چاہے جہاں رہتے ہاں چاندنی راتوں میں
خاموش اندھیری میں مائل کے یہاں ہوتے

جذب۔ جناب راگھووندراؤ صاحب وکیل عالمپور دکن

زمانے کی طرح بدلا ہے نقشہ اُن کی محفل کا
ہماری شکل بھی محفل میں پہچانی نہیں جاتی

تماشا بن گیا ہے چشم اہل ہوش میں، پھر بھی
ترے وحشی کی خوئے چاک دامانی نہیں جاتی

میں بزم دوست میں آئینے کی فطرت کا حامل ہوں
مثال آئینہ میری بھی حیرانی نہیں جاتی

ہزاروں دل مٹے اور خاک پیکر ہو گئے لاکھوں
یہ تیری دل کشی اے عالمِ فانی نہیں جاتی

خلش اے جذب کیا سمجھے کوئی دردِ محبت کی
کہ یہ محسوس ہوتی ہے مگر جانی نہیں جاتی

خوشتر۔ جناب دلیسراج صاحب خوشتر خیالی سرگودھوی

میں چپ ہوں اپنی جانِ تمنا کے سامنے
بیمار بن گیا ہوں مسیحا کے سامنے

پاسِ ادب ضرور ہے اے بیخودیِ شوق
جھکنے دے مجھ کو ساغر و مینا کے سامنے

تیرے کرم کے سامنے کچھ بھی نہیں گناہ
قطرے کی کیا بساط ہے دریا کے سامنے

خوشتر ملی ہے مجھ کو مری حسرتوں کی داد
خوش ہوں کہ لٹ رہا ہوں میں دنیا کے سامنے

خلیق :- جناب خلیق برہانپوری

کیا لفظِ محبت بھی لبریز معانی ہے
تفسیر میں پوشیدہ دنیا کی کہانی ہے

میں وحدت و کثرت کے اسرار سمجھتا ہوں
روداد اک اُن کی ہے اِک میری کہانی ہے

تھا ذرہ کبھی اب تو ذروں میں چمکتا ہوں
وہ فطرتِ اوّل تھی یہ فطرتِ ثانی ہے

دلکش ہیں فسانے دو انسان کی ہستی کے
اک ذکر ہے طفلی کا اِک ذکرِ جوانی ہے

مانوس خلیق اپنا دل کیوں ہو زمانے سے
دل خوب سمجھتا ہے ہستی مری فانی ہے

رہبر۔ جناب رہبر بی۔اے۔ سنگرور ریاست جیند

گلشن میں لے کے جائیں دلِ داغدار کیا
پہلو میں ہو جو درد تو لطفِ بہار کیا

منزل ہے جس کی دُور ارادہ بلند ہے
کرنا ہے کارواں کا اسے انتظار کیا

خود اُن کو اپنی بات کا جب پاس کچھ نہیں
وعدوں پر اُن کے اور کو ہو اعتبار کیا

میری خموشیاں ہیں مری ترجمانِ دل
وہ مجھ سے پوچھتے ہیں بھلا بار بار کیا

رہبر تپے کی بات زباں سے نکل گئی
ورنہ سخنوروں میں ہمارا شمار کیا

درخشاں - جناب اے۔ایچ۔حیدری کانپور

تصویر میں بھی تیری اعجاز کا عالم ہے
"خاموشی و گویائی، گویائی و خاموشی"

وہ عرضِ تمنا پر چپ رہنے کو کہتے ہیں ۔۔۔ کیا چیز ہے گویائی، کیا بات ہے خاموشی
کانوں سے جو سنتے تھے وہ دیکھ لیا ہم نے ۔۔۔ پردے ہی سے رو پوشی پردے ہی سے سرگوشی
اللہ ری بے باکی میخانہ ہے اور رخشاں ۔۔۔ رندوں کی بھری محفل یہ دَور یہ مینو شی

۲

جوشِ وحشت دیکھئے، خونِ تمنّا دیکھئے ۔۔۔ میری آنکھوں سے ذرا دل کا تماشا دیکھئے
باغِ عالم میں تھی ہر سُو حسنِ دلکش کی بہار ۔۔۔ تھیں کہاں آنکھیں کہ ناکامِ تمنا دیکھئے
ہوگئی بے پردہ رخشاں طور پر برقِ جمال ۔۔۔ اب دھرا کیا ہے کہ سینا میں تجلی دیکھئے

شاعر:۔ حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی مرحوم[1]

بزمِ دشمن سے اب آئے ہو مزے لوٹے ہوئے ۔۔۔ ہوش میں آؤ کہیں مجڑتے ہیں دل ٹوٹے ہوئے
تم یہاں آکر تو دیکھو بجز یں کیا حال ہے ۔۔۔ دل کے ہاتھوں آج سو سو حشر ہیں ٹوٹے ہوئے
وائے ناکامی کہ گلشن میں خزاں آنے لگی ۔۔۔ دو ہی دن گزرے تھے ہم کو قید سے چھوٹے ہوئے
دل فریبی لالہ رویوں کی نہیں مٹتی کبھی ۔۔۔ یہ ستمگر خاک میں مل کر بھی گل بوٹے ہوئے
سونگھ لے شاعر اگر کچھ ہے دماغِ بوئے گل ۔۔۔ میرے گلشن کے یہ تازے پھول ہیں ٹوٹے ہوئے

معذرت

یہ پرچہ کسی قدر تاخیر کیساتھ نامکمل حالت میں حاضر ہو رہا ہے جس کی وجہ ایڈیٹر کے چھوٹے بھائی رائے بہادر مسٹر رام سرن نگم ڈپٹی کلکٹر کی شدید علالت اور افسوسناک وفات ہے جو کلکتہ میں جہاں مرحوم زیرِ علاج تھے۔ ۲۷ جنوری ۱۹۴۱ء کو واقع ہوئی۔ ۱۶ جنوری سے ایڈیٹر بھی انھیں کے ساتھ تھے۔ مسٹر رام سرن زمانہ کے پرانے مضمون نگار بھی تھے اور ان کا شمار صوبہ کے بہترین ڈپٹی کلکٹروں میں تھا۔ تین سال تک بنارس کے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ رہے وہاں سے تبدیل ہوکر الہ آباد آئے مگر یہاں مشکل سے تین ماہ رہے ہونگے کہ دسمبر ۱۹۳۹ء سے علالت کا سلسلہ شروع ہوگیا جو لاکھ علاج معالجہ کے باوجود آخری جان ہی لیکر ختم ہوا۔ مرحوم کی عمر صرف ۵۲ سال تھی یہ تیسرا حادثہ عظیم ہے جو دو سال کے اندر اندر زمانہ اور اُن کے عزیزوں کو برداشت کرنا پڑا۔ مگر مشیت ایزدی کے سامنے گردن جھکانے کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔



---

[1] ہمیں دلی افسوس ہے کہ یہ غزل آنجہانی حضرت آغا شاعر صاحب کی حیات میں موصول ہوئی تھی لیکن ایسے وقت شائع ہو رہی ہے جب ممدوح اس دنیائے فانی میں موجود نہیں ہیں۔

THE ZAMANA, FEB. 1941 REGD NO. A 147

زمانہ

مرتبہ:۔ دیا نراین نگم

نمبر ۲	فروری سنہ ۱۹۴۱ء	جلد ۷۶

فہرست مضامین

تصویر:۔ پنڈت جگموہن ناتھ رینہ شوق

قیمت سالانہ پانچ روپیہ

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

نمونہ سات آنہ

زمانہ

جلد ۷۶ — فروری ۱۹۴۱ء — نمبر ۲

چاند بی بی

(از ڈاکٹر ایم ۔ حفیظ سید ۔ ایم ۔ اے ۔ پی ایچ ۔ ڈی ۔ ڈی ۔ لٹ)

چاند بی بی حسین نظام شاہ والیٔ احمد نگر کی بیٹی تھی،[1] (۱۵۶۵ - ۱۵۵۴) تاریخی حیثیت سے وہ سب سے پہلے جنگ تالی کوٹ کے موقع پر نمایاں ہوئی ہے ۔ سلاطین بہمنیہ اور وجے نگر کے ہندو راجاؤں کے درمیان آپس میں ہمیشہ سے نزاع چلی آتی تھی ۔ سلطنت کے حصے بخرے ہو جانے کے بعد جو ریاستیں قائم ہوئیں وہ آپس کی خانہ جنگیوں میں اس قدر مصروف تھیں کہ وہ اپنے موروثی قدیمی دشمنوں کی طرف کوئی توجہ نہ دے سکیں ۔ ان کی اِن خانہ جنگیوں کی وجہ سے وجے نگر کے ہندو راجہ کبھی ایک فریق کی اور کبھی دوسرے کی مدد کرتے اور اِن لڑائیوں سے پوری طرح فائدہ اُٹھاتے تھے ۔ غرض تقریباً ۱۵۶۴ء میں وجے نگر کے حکمراں رام راجہ کا طرزِ عمل اپنے مسلمان ہمسایوں کے ساتھ[2] اِس قدر توہین آمیز اور ناقابلِ برداشت ہو گیا کہ مسلمانوں نے باہمی اختلافات کو پس پُشت ڈال کر اس کو سزا دینے کے لئے ایک سیاسی اتحاد قائم کرنے کا تہیہ کر لیا جس کو مستحکم کرنے کے لئے انھوں نے آپس میں رشتۂ ازدواج قائم کرنا چاہا ۔ اس لئے حسین نظام شاہ نے اپنی بیٹی چاند بی بی کی شادی علی عادل شاہ سے کر دی اور سولاپور کا قلعہ جہیز میں دیدیا ۔ اور عادل شاہ کی بہن ہدیہ سلطانہ کی شادی حسین نظام شاہ کے بڑے بیٹے مرتضٰے سے ہوئی ۔ یہ دونوں شادیاں

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد سوم صفحہ ۱۲۰

[2] تاریخ فرشتہ جلد سوم صفحہ ۱۲۵

بڑی دھوم دھام سے ہوئیں۔

چاند بی بی کی شادی کے بعد کے حالات زندگی سنہ ۱۵۸۰ء تک معلوم نہیں ہیں۔ کزن (Cousen) کا قول ہے کہ نکاح کے بعد ہی وہ اپنے شوہر کے معاملات میں دلچسپی لینے لگی اور بعینہ گھر کی طرح میدان جنگ میں بھی شوہر کی رفاقت کا حق ادا کرتی رہی۔ علی عادل شاہ کے ساتھ اکثر لڑائیوں میں شرکت کرکے وہ فنونِ جنگ سے بخوبی واقف ہوگئی۔ چنانچہ اس کے شوہر علی کے انتقال کے بعد عادل شاہی حکومت پوشیدہ طور سے اُسی کی ہدایات پر عمل پیرا تھی۔

علی عادل شاہ کے انتقال کے بعد کامل خاں نے (جو تمام امرا میں ایک ممتاز شخصیت رکھتا تھا) عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لیلی۔ اور چاند بی بی کو نابالغ بادشاہ ابراہیم ثانی کا سرپرست مقرر کردیا۔ ابراہیم کی عمر اس وقت مشکل سے دس سال تھی، کچھ عرصہ تک کامل خاں نے سلطنت کا کام نہایت حسن و خوبی سے انجام دیا، لیکن بعد میں وہ مطلق العنان بن بیٹھا۔ اور چاند بی بی کے ساتھ اس کا برتاؤ اچھا نہ رہا، کیونکہ اب وہ اس کے ساتھ اُس عزت و وقار سے پیش نہ آتا تھا جس کی وہ مستحق تھی چاند بی بی اپنی ہمت و حوصلہ کے باعث بادشاہ کے قائم مقام کی خودرائی کو کسی طرح گوارا نہ کرسکتی تھی، اس لئے اس نے کامل خاں کو حکومت سے برطرف کردینے کا ارادہ کرلیا، اور کامل خاں سے نجات حاصل کرنے کے لئے کشور خاں سے جو دربار کا ایک معزز اور با اثر امیر تھا مدد طلب کی۔[۱]

یہاں پر یہ امر قابل لحاظ ہے کہ کشور خاں خود بیوہ ملکہ کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ ملکہ کی سرپرستی اور اُس کی خوشنودی میں اُس کیلئے ترقی کے دروازے کھلتے تھے۔

بہرحال جب کامل خاں کو کشور خاں کی سازش اور ان ارادوں کا علم ہوا تو اُس نے ملکہ کو ان تمام واقعات سے آگاہ کرکے اپنا پُشت پناہ بنانا چاہا۔ لیکن جب چاند بی بی کے مقربین سے یہ معلوم ہوا کہ کشور خاں کے تمام منصوبے چاند بی بی کی ایما پر منحصر ہیں تو اُس کے ہوش و حواس جاتے رہے اور پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ وہ دارالخلافت سے بھاگ نکلا، لیکن کشور خاں کے آدمیوں نے تعاقب کرکے اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔[۲]

کشور خاں کی اس کارگزاری کے صلہ میں ملکہ نے اُس کی قائم مقامی کے مطالبہ کی پُرزور تائید کی اُسی کی سرپرستی میں سلطنت کے کل انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لئے اور نہایت اطمینان سے مطلق العنان

۱؎ کہا جاتا ہے کہ چاند بی بی نے کشور خاں کے پاس ایک زنانہ لباس تھوڑی سے روئی اور ایک چرخہ بھیجا تھا کہ وہ یا تو کامل خاں کو برطرف کرنے میں مدد دے ورنہ زنانہ لباس پہن کر چرخہ کاتے۔ بساتین السلاطین صفحہ ۱۵۲

۲؎ فرشتہ جلد سوم صفحہ ۱۴۶-۱۴۴ بساتین السلاطین صفحہ ۱۵۳-۱۵۶

ہوکر حکومت شروع کردی لیکن اس سے کاروبار سلطنت میں کوئی ترقی نہ ہوئی۔ کیونکہ اب چاند بی بی اور دربار کے امراء کو ایک مجہول بادشاہ کے بجائے ایک جابر اور ظالم بادشاہ سے سابقہ پڑا۔ اسی زمانہ میں نظام شاہی فوج سلطنت عادل شاہی کے کچھ سرحدی علاقوں پر قبضہ کرنے کے لئے آگے بڑھی۔ کشور خاں نے عین الملک گیلانی کو حملہ آوروں کے مقابلہ کے لئے بھیجا۔ حملہ آور مغلوب و پسپا ہوکر بھاگ گئے، اُن کا ڈیرہ، خیمہ، ہاتھی اور توپ خانہ سب مال غنیمت میں شامل کرلیا گیا۔ عین الملک نہایت مسرّت اور شادمانی سے فاتحانہ طور پر دارالسلطنت واپس آیا۔ چاند بی بی بہت مسرور ہوئی۔ اس فتح کی خوشی میں خوب جشن منائے گئے۔ کشور خاں نے ملک کے ایما سے افسران متعلقہ کو امتیازات اور انعامات عطا کئے۔

تھوڑے ہی دنوں کے بعد کشور خاں نے افسرانِ ماتحت کے نام یہ فرمان جاری کیا کہ حال کی جنگ میں جو ہاتھی بطور مال غنیمت ہاتھ آئے ہیں وہ سلطنت کے فیل خانہ میں واپس کردیئے جائیں یہ فرمان چاند بی بی کے مشورہ کے بغیر جاری کیا گیا تھا[۱]۔ ماتحت اُمراء اس سے بہت ناراض ہوئے۔ چنانچہ اُن میں ایک قسم کی شورش اور ہیجان پیدا ہوگیا۔ غالباً یہ واقعہ چاند بی بی کے خلاف مزاج ہوا کہ اس کے اختیارات اس بیدردی سے ٹھکرادیئے جائیں۔ کچھ امیروں نے چاہا کہ چاند بی بی کے حضور میں باریابی پاکر کشور خاں کی معزولی کی رائے دیں اور انتظام سلطنت کے لئے بنکاپور سے مصطفےٰ خاں کو بلانے کی تجویز پیش کریں۔ بعض لوگوں نے اظہار ناراضی کے لئے وجے نگر ہجرت کرنا چاہا تاکہ چاند بی بی اس سے متاثر ہوکر خود ہی کشور خاں کو معزول کردے[۲]۔

مگر جب کشور خاں کو اِن شورش پسند امراء کے ارادوں کا علم ہوا تو اُس نے اس کے دفعیہ کے لئے نہایت چالاکی سے مصطفےٰ خاں کو جسے وہ اپنا حریف سمجھتا تھا قتل کرادیا۔ اسی مصطفےٰ خاں کے طرفدار دربار کے شورش پسند امراء تھے۔ یہ امر قرین قیاس ہے کہ کشور خاں نے مصطفےٰ خاں کے قتل ہوجانے کی اطلاع اس وقت تک چاند بی بی کو نہ ہونے دی ہو جس وقت تک کہ اس کے ارادے ناتمام ہوں۔ چاند بی بی چاہتی تھی کہ کشور خاں امور سلطنت اور تمام ملکی معاملات میں اس سے صلاح او مشورہ کرے، لیکن کشور خاں ہر شخصی اثر سے بے نیاز ہوکر مطلق العنان حکومت چاہتا تھا۔ چاند بی بی نے مصطفےٰ خاں کے قتل کی خبر سُن کر کھلے الفاظ میں سخت ناپسندیدگی کا اظہار

---

[۱] بساتین السلاطین صفحہ ۱٦۱ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدار المہام کو کوئی حکم صادر کرنے سے پہلے بیوہ ملکہ سے مشورہ کرنا پڑتا تھا۔

[۲] فرشتہ جلد سوم صفحہ ۱۴۳-۱۴٦ - بساتین السلاطین صفحہ ۱٦۱

اظہار کرتے ہوئے کشور خاں کی سختی سے فہمائش کی۔ انھیں وجوہ سے چاند بی بی نے کشور خاں کو تخت سے اُتار دینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اور دارالسلطنت کے اُن تمام امرا کی ہمدردی حاصل کر لی جو کشور خاں سے ناخوش تھے۔ کشور خاں چاند بی بی کو دامِ فریب میں لانا چاہتا تھا۔ اس لئے ہر ممکن طریقہ سے اپنے دلی جذبات پوشیدہ رکھتے ہوئے وہ ملکہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کرتا رہا۔ ایسی حالت میں ملکہ کو بھی شبہ کی کوئی گنجایش نہ تھی۔ کشور خاں نے اپنی حکمتِ عملی سے پوشیدہ طور پر نوعمر بادشاہ سے کہدیا کہ ملکہ اپنے بھائی سے خفیہ مل گئی ہے اور اُسے بیجاپور پر حملہ کرنے کے لیئے مدعو کر رہی ہے۔ اِس طرح سے اس نے بادشاہ کو دھوکا دیکر دشمن سے سازش کرنے کے الزام میں چاند بی بی کی گرفتاری کے لئے فرمان پر دستخط کرا لیئے۔ چنانچہ ملکہ نہایت ذلت اور رُسوائی کے ساتھ محل سے نکال دی گئی اور قلعہ میں ایک قیدی کی حیثیت سے رکھی گئی۔ اس چالاکی اور فریب کی وجہ سے کشور خاں ایک حد تک محفوظ ہو کر مطلق العنان حکومت کرنے لگا۔[۵۱]

کشور خاں کے اس فعل سے دارالسلطنت کا ہر متنفس کھلے الفاظ میں ناراضی اور ناپسندیدگی کا اظہار صاف صاف کرنے لگا۔ حتیٰ کہ جب اس کی سواری نکلتی تو لوگ "مصطفےٰ خاں کا قاتل" اور "چاند بی بی کا قید کرنے والا" کہہ کر اُسے لائقِ تعزیر ٹھہراتے تھے۔ اور حبشی اُمرا نے تو اخلاص خاں کی سرکردگی میں کشور خاں کو تخت سے اُتار دینے کا پکا ارادہ کر لیا۔ انھوں نے کشور خاں کے بھائی اور بیٹے کو شاہ دُرگ میں قید کر کے بیجاپور کا رُخ کیا تاکہ اُس کی سرکوبی کریں۔ لیکن جیسے ہی اس کو اِن واقعات کی خبر مل گئی وہ دارالسلطنت سے بھاگ نکلا۔ پہلے احمدنگر اور پھر گولکنڈہ آیا۔ جہاں مناسب طریقہ سے اپنے انجام کو پہونچا، اور مصطفےٰ خاں کے حامیوں اور طرفداروں نے اُسے قتل کر ڈالا۔[۵۲]

اخلاص خاں نے برسرِ حکومت ہوتے ہی چاند بی بی کو رہا کر دیا اور دارالخلافہ میں نہایت احترام کے ساتھ اس کا پُرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ اب چاند بی بی دوبارہ نوعمر بادشاہ کی سرپرست اور اتالیق مقرر[۵۳] ہوئی۔ غالبًا حبشیوں کا عروج اس کے لئے باعثِ تکلیف تھا۔ اِس لیئے کچھ عرصہ بعد اُس نے اخلاص خاں کو حکومت سے معزول کر دیا اور تمام سلطنت کی دیکھ بھال اور اس کا انتظام ابوالحسن کے سپرد کر دیا[۵۴]۔ لیکن عجیب و غریب اتفاقات، اور غیر متوقع واقعات کی وجہ سے، جو تواریخ دکن میں

---

[۵۱] فرشتہ جلد سوم صفحہ ۱۴۷-۱۴۸ بساتین السلاطین صفحہ ۱۶۵-۱۶۲
[۵۲] فرشتہ جلد سوم صفحہ ۱۴۹-۱۵۰ بساتین السلاطین صفحہ ۱۶۵-۱۶۷
[۵۳] فرشتہ جلد سوم صفحہ ۱۵۰ بساتین السلاطین صفحہ ۱۶۹　[۵۴] بساتین السلاطین صفحہ ۱۶۸-۱۶۹

بکثرت موجود ہیں، اخلاص خاں حبشی اپنے حصولِ مقصد میں کامیاب ہوگیا۔ حامد خاں اور دلاور خاں کے دوش بدوش اُس نے قائم مقام کے دل پر اپنی وفاداری کا سکہ بٹھادیا۔ قائم مقام کی فرمانبرداری اور اطاعت کے ساتھ ساتھ یہ امورِ سلطنت میں بھی اُس کی مدد کرنے لگا۔ اِن تینوں سرداروں نے مل کر بہت جلد ابوالحسن کو قید کرکے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔[1]

اخلاص خاں نے اپنے متقدمین کے مقابلہ میں کچھ بہتر حکومت نہ کی، اس نے حامد خاں اور دلاور خاں کی مدد سے اپنا ایک گروہ علیحدہ بنا لیا اور روزمرہ کے ملکی معاملات سے دلچسپی نہ رکھتے ہوئے اور اُن سے بے نیاز ہوکر اپنے ذاتی مفاد کے لئے انتظام حکومت آپس میں تقسیم کرلیا۔ اسی اثنا میں احمدنگر اور گولکنڈہ کی ہمسایہ ریاستوں نے عادل شاہی سلطنت پر غاصبانہ حملہ کیا کہ ممکن ہے کچھ مقبوضات ہاتھ آجائیں۔ لیکن ان کو دلاور خاں نے شکست فاش دی۔ اس غیر متوقع فتح سے دلاور خاں کی ہمت اور بڑھ گئی۔ حکمرانی کی ہوس میں پھنس کر اُس نے حکمت عملی سے اپنے دونوں ساتھیوں کو گرفتار کرلیا۔ اور چاندبی بی کے تمام اختیارات سلب کرلیئے۔ فرشتہ کا قول ہے کہ "چاندبی بی کے اختیارات اس قدر محدود ہوگئے تھے کہ کوئی درباری اُس کے احکام کی پروا نہ کرتا تھا"[2] دلاور خاں نے آٹھ سال تک مطلق العنان ہوکر آزادانہ حکومت کی۔ اِس امر کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ اس اثنا میں اُس نے مملکت کی فلاح و بہبودی کے لئے حتی الامکان کسی قسم کی کوئی کوشش سے دریغ نہ کیا۔[3]

دلاور خاں نے بیجاپور اور احمدنگر کے تعلقات استوار کرنے کے لئے اسی پُرانے طریقے کی بنا پر آپس میں رشتہ ازدواج قائم کرنا چاہا۔ اُس نے احمدنگر اور مرتضیٰ نظام شاہ نے اُس کے جواب میں بیجاپور اپنے اپنے سفیر روانہ کئے۔ اس طرح سے دلاور خاں کے لڑکے میراں حسین کی شادی بہت شان و شوکت سے شاہ احمدنگر کی بہن خدیجہ سلطان سے ہوگئی۔ چاندبی بی بھی شہزادی کے ہمراہ اپنے بھائی سے ملنے آئی۔ غالباً چاندبی بی کے احمدنگر چلے آنے کی وجہ یہ تھی کہ بیجاپور میں اب اُس کا اقتدار ختم ہوچکا تھا اور وہاں اُسے کوئی خاص امتیاز حاصل نہ تھا۔ دلاور خاں کی قائم مقامی میں گزشتہ عظمت و حکومت بالکل باقی نہ رہی تھی اور اُمورِ مملکت اور سلطنت کے معاملات میں اسے کسی قسم کا کوئی تعلق باقی نہ رہا تھا۔

احمدنگر بھی بالکل تبدیل ہوگیا معلوم ہوتا ہے کہ چاندبی بی اپنے بھتیجے میراں حسین نظام شاہ سے دور حکومت ہی میں گوشہ نشین ہوگئی تھی میراں حسین کے مختصر عہد حکومت کے بعد ...

[1] بساتین السلاطین صفحہ ۱۰۹
[2] فرشتہ جلد سوم صفحہ ۱۵۰-۱۵۱ بساتین السلاطین صفحہ ۱۰۹-۱۱۰
[3] فرشتہ جلد سوم صفحہ ۱۵۰-۱۵۲ بساتین السلاطین صفحہ ۱۰۹-۱۱۰

اظہار کرتے ہوئے کشور خاں کی سختی سے نہمالیش کی۔ انھیں وجوہ سے چاند بی بی نے کشور خاں کو تخت سے اُتار دینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اور دارالسلطنت کے اُن تمام اُمرا کی ہمدردی حاصل کرلی جو کشور خاں سے ناخوش تھے۔ کشور خاں چاند بی بی کو دام فریب میں لانا چاہتا تھا، اس لئے ہر ممکن طریقہ سے اپنے دلی جذبات پوشیدہ رکھتے ہوئے وہ ملکہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کرتا رہا۔ ایسی حالت میں ملکہ کو بھی شبہ کی کوئی گنجایش نہ تھی۔ کشور خاں نے اپنی حکمت عملی سے پوشیدہ طور پر نوعمر بادشاہ سے کہدیا کہ ملکہ اپنے بھائی سے خفیہ مل گئی ہے اور اُسے بیجاپور پر حملہ کرنے کے لیئے مدعو کر رہی ہے۔ اِس طرح سے اس نے بادشاہ کو دھوکا دیکر دشمن سے سازش کرنے کے الزام میں چاند بی بی کی گرفتاری کے لئے فرمان پر دستخط کرالیئے۔ چنانچہ ملکہ نہایت ذلت اور رُسوائی کے ساتھ محل سے نکال دی گئی اور قلعہ میں ایک قیدی کی حیثیت سے رکھی گئی۔ اس چالاکی اور فریب کی وجہ سے کشور خاں ایک حد تک محفوظ ہو کر مطلق العنان حکومت کرنے لگا[۵۱]۔

کشور خاں کے اس فعل سے دارالسلطنت کا ہر متنفس کھلے الفاظ میں ناراضی اور ناپسندیدگی کا اظہار صاف صاف کرنے لگا۔ حتیٰ کہ جب اس کی سواری نکلتی تو لوگ "مصطفےٰ خاں کا قاتل" اور "چاند بی بی کا قید کرنے والا" کہہ کر اُسے لائق تعزیر ٹھہراتے تھے۔ اور حبشی اُمرا نے تو اخلاص خاں کی سرکردگی میں کشور خاں کو تخت سے اُتار دینے کا پکا ارادہ کر لیا۔ انھوں نے کشور خاں کے بھائی اور بیٹے کو شاہ درگ میں قید کر کے بیجاپور کا رُخ کیا تاکہ اس کی سرکوبی کریں۔ لیکن جیسے ہی اس کو ان واقعات کی خبر مل گئی وہ دارالسلطنت سے بھاگ نکلا۔ پہلے احمدنگر اور پھر گولکنڈہ آیا۔ جہاں مناسب طریقہ سے اپنے انجام کو پہونچا، اور مصطفےٰ خاں کے حامیوں اور طرفداروں نے اُسے قتل کر ڈالا[۵۲]۔

اخلاص خاں نے برسر حکومت ہوتے ہی چاند بی بی کو رہا کر دیا اور دارالخلافہ میں نہایت احترام کے ساتھ اس کا پُرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ اب چاند بی بی دوبارہ نوعمر بادشاہ کی سرپرست اور اتالیق مقرر ہوئی[۵۳]۔ غالباً حبشیوں کا عروج اس کے لئے باعث تکلیف تھا۔ اِس لیئے کچھ عرصہ بعد اس نے اخلاص خاں کو حکومت سے معزول کر دیا اور تمام سلطنت کی دیکھ بھال اور اس کا انتظام ابوالحسن کے سپرد کر دیا[۵۴]۔ لیکن عجیب وغریب اتفاقات اور غیر متوقع واقعات کی وجہ سے (جو تواریخ دکن میں

[۵۱] فرشتہ جلد سوم صفحہ ۱۴۸-۱۴۷ بساتین السلاطین صفحہ ۱۶۵-۱۶۲

[۵۲] فرشتہ جلد سوم صفحہ ۱۵۰-۱۴۹ بساتین السلاطین صفحہ ۱۶۸-۱۶۷

[۵۳] فرشتہ جلد سوم صفحہ ۱۵۰ بساتین السلاطین صفحہ ۱۶۹   [۵۴] بساتین السلاطین صفحہ ۱۶۸-۱۶۹

بکثرت موجود ہیں، اخلاص خاں حبشی نے حصول مقصد میں کامیاب ہوگیا۔ حامد خاں اور دلاور خاں کے دوش بدوش اُس نے قائم مقام کے دل پر اپنی وفاداری کا سکّہ بٹھا دیا۔ قائم مقام کی فرمانبرداری اور اطاعت کے ساتھ ساتھ یہ امورِ سلطنت میں بھی اُس کی مدد کرنے لگا۔ ان تینوں سرداروں نے مل کر بہت جلد ابوالحسن کو قید کرکے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔[1]

اخلاص خاں نے اپنے متقدمین کے مقابلہ میں کچھ بہتر حکومت نہ کی۔ اس نے حامد خاں اور دلاور خاں کی مدد سے اپنا ایک گروہ علیحدہ بنا لیا اور روزمرّہ کے ملکی معاملات سے دلچسپی نہ رکھتے ہوئے اور اُن سے بے نیاز ہوکر اپنے ذاتی مفاد کے لئے انتظام حکومت آپس میں تقسیم کرلیا۔ اسی اثنا میں احمد نگر اور گولکنڈہ کی ہمسایہ ریاستوں نے عادل شاہی سلطنت پر زبردست حملہ کیا کہ ممکن ہے کچھ مقبوضات ہاتھ آجائیں۔ لیکن ان کو دلاور خاں نے شکست فاش دی۔ اس غیر متوقع فتح سے دلاور خاں کی ہمت اور بڑھ گئی۔ حکمرانی کی ہوس میں پھنس کر اُس نے حکمت عملی سے اپنے دونوں ساتھیوں کو گرفتار کرلیا۔ اور چاند بی بی کے تمام اختیارات سلب کرلئے۔ فرشتہ کا قول ہے کہ "چاند بی بی کے اختیارات اس قدر محدود ہوگئے تھے کہ کوئی درباری اُس کے احکام کی پروا نہ کرتا تھا"[2] دلاور خاں نے آٹھ سال تک مطلق العنان ہوکر آزادانہ حکومت کی۔ اس امر کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ اس اثنا میں اُس نے ملک کی فلاح و بہبودی کے لئے حتی الامکان کسی قسم کی کوئی کوشش سے دریغ نہ کیا۔

دلاور خاں نے بیجاپور اور احمد نگر کے تعلقات استوار کرنے کے لئے اُسی پُرانے طریقے کی بنا پر آپس میں رشتۂ ازدواج قائم کرنا چاہا۔ اُس نے احمد نگر اور مرتضیٰ نظام شاہ نے اُس کے جواب میں بیجاپور اپنے اپنے سفیر روانہ کئے۔ اس طرح سے دلاور خاں کے لڑکے میراں حسین کی شادی بہت شان و شوکت سے شاہ احمد نگر کی بہن خدیجہ سلطان سے ہوگئی۔ چاند بی بی بھی شہزادی کے ہمراہ اپنے بھائی سے ملنے آئی۔ غالباً چاند بی بی کے احمد نگر چلے آنے کی وجہ یہ تھی کہ بیجاپور میں اب اُس کا اقتدار ختم ہوچکا تھا اور وہاں اُسے کوئی خاص امتیاز حاصل نہ تھا۔ دلاور خاں کی قائم مقامی میں گزشتہ عظمت و حکومت بالکل باقی نہ رہی تھی اور امورِ مملکت اور سلطنت کے معاملات میں اسے کسی قسم کا کوئی تعلق باقی نہ رہا تھا۔

احمد نگر اب بالکل تبدیل ہوگیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ چاند بی بی اپنے بھتیجے میراں حسین نظام شاہ سے دور حکومت ہی میں گوشہ نشین ہوگئی تھی۔ میراں حسین کے مختصر عہد حکومت کے بعد [illegible]

---

[1] بساتین السلاطین صفحہ [illegible]
[2] فرشتہ جلد سوم صفحہ [illegible] — بساتین السلاطین صفحہ [illegible]
[3] فرشتہ جلد سوم صفحہ [illegible] — بساتین السلاطین صفحہ [illegible]

اسی میں بادشاہ مارا گیا - ایک مہدوی امیر جمال خاں نامی اسماعیل نظام شاہ کو تخت پر بٹھانے میں کامیاب ہو گیا اور بیجاپور سے برسر پیکار رہا۔ آخر کار آپس میں صلح ہو گئی اور یہ طے پایا کہ چاند بی بی بیجاپور بھیجدی جائے۔ لیکن تاریخ سے کہیں اس کا پتہ نہیں چلتا کہ وہ بیجاپور گئی ہو۔[51]

جمال خاں کے انتقال کے بعد اسماعیل کے باپ برہان نظام شاہ اول نے اپنے بیٹے اسماعیل کو تخت سے اتار دیا اور خود چار ماہ سولہ دن حکومت کرکے مئی ۱۵۹۵ء میں راہی ملک عدم ہوا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا دوسرا بیٹا ابراہیم تخت نشین ہوا، اس نے اپنے باپ کے اتالیق میاں منجو کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا۔ لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد ابراہیم بیجاپوریوں کے خلاف ایک جنگ میں کام آیا اور سلطنت میں بدامنی پھیل گئی۔

اس بدامنی سے فائدہ اٹھا کر مختلف جماعتوں نے اپنے اپنے امیدوار تخت سلطنت کے لئے کھڑے کر دیئے۔ حبشیوں نے چاند بی بی کی حمایت کی جو سابق بادشاہ کی بچی تھی۔ اور یہ تجویز پیش کی کہ اس کی قائم مقامی میں بادشاہ سابق کے اکلوتے شیر خوار بچے بہادر کو بادشاہ بنایا جائے۔ لیکن میاں منجو جو اس وقت معاملات کی ترجمانی میں سرگروہ تھے احمد کے طرفدار تھے جو بادشاہ طاہر کا بیٹا بنایا جاتا تھا۔ (فرشتہ کا قول ہے کہ اس سے قبل یہ لڑکا دولت آباد میں قید تھا) میاں منجو اس لڑکے کو شاہی خاندان کا ایک فرد بتاتے ہوئے اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے -۶۔ اگست ۱۵۹۵ء میں اس کی تاجپوشی کی رسم ادا کی گئی۔ بہادر نامی شیر خوار دعویدار اپنی چچی کے پاس سے علٰحدہ کرکے قلعہ چاؤنہ بھیج دیا گیا۔[52] اگرچہ عام طور سے یہ بات پہلے ہی سے مشہور تھی کہ احمد شاہی خاندان سے نہیں ہے لیکن اب واضح طور سے ثابت ہو گیا۔ اخلاص خاں کو جب ان واقعات کا علم ہوا تو اسے نہایت افسوس ہوا کہ اس نے ایسے شخص کی تخت نشینی کے لئے کیوں اپنی رضامندی کا اظہار کیا اب اس نے بالکل علٰحدہ ایک تیسرے شخص مطیع کو تخت سلطنت کا مدعی بنایا۔ اس موقع پر میاں منجو نے مغلوں کو اپنی امداد کے لئے طلب کیا۔ یہ میاں منجو کی ناقابل تلافی غلطی تھی۔[53]

شہزادہ مراد نے جو دکن پر حملہ کرنے کے لئے موقع کا منتظر تھا نہایت خوشی سے میاں منجو کی دعوت قبول کی۔ اور خانخاناں اور راجہ علی خاں والیِ خاندیش کے ہمراہ مغلوں اور راجپوتوں

---

[51] فرشتہ جلد سوم ص۲۹۶

[52] اس سے تائید ہوتی ہے کہ چاند بی بی بیجاپور نہیں گئی۔　　　ص۱۹۱۔

[53] برہان　J. A　جلد سوم ص۲۹۵　　فرشتہ جلد سوم ص۲۹۳　گرل جلد اول ص۲۳۲

[54] برہان　　　فرشتہ جلد سوم ص۲۹۶

کی ایک کثیر فوج لے کر دسمبر ۱۵۹۵ء میں احمد نگر کے قریب پہونچا۔ میاں منجو جو اس درمیان میں حبشیوں پر فوقیت حاصل کر چکے تھے اور اپنے حسب منشا تمام معاملات بھی تقریباً طے کر چکے تھے، مغلوں سے گفتگو کر کے بہت متاسف اور نادم ہوئے۔ لیکن اب ان کی ندامت بعد از وقت تھی۔ پھر بھی میاں منجو نے دارالسلطنت کی حفاظت کے لئے تیاری کی، رسد کا انتظام کر کے انصار خاں کو دارالخلافہ میں اپنا نائب اور چاند بی بی کو قائم مقام کر کے انسا کی راہ لی تاکہ بیجاپور اور گولکنڈہ سے فوجی امداد طلب کرے۔ اپنے ساتھ اُس نے نوعمر بادشاہ کو بھی لے لیا[1]۔ میاں منجو کے روانہ ہوتے ہی چاند بی بی نے فوج کی نگرانی اپنے ذمے لی، اور انصار خاں کو قتل کرا دیا۔ رعایا کی وحشت اور خوف وہراس کو دور کرنے کے لئے خود قلعہ کے برج پر چڑھ گئی، چتر شاہی اُس کے سر پر رکھا ہوا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا آفتاب اپنی تابانی کے عالم میں تمام دنیا کو منور کر رہا ہے۔ اُسے دیکھتے ہی تمام اُمرا، سردار، شہر کی ادنیٰ و اعلیٰ کل رعایا نے صدائے قومی بلند کی، اور اُس کی توقیر و تعظیم کا اظہار کیا[2]۔ یہی نہیں بلکہ عملی طور سے تمام اہل شہر متفق ہو کر اُس کی مدد کے لئے دل و جان سے تیار ہو گئے۔ اور ہر شخص اُس کی حمایت اور طرفداری میں رطب اللسان تھا۔ غرض اس طرح سے چاند بی بی نے بہادر شاہ کو جو چاونڈ میں مقید تھا[3] احمد نگر کا بادشاہ بنا دیا۔

چاند بی بی حبشیوں سے سلسلۂ مراسلت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے ابہنگ خاں کو قلعہ کی فوری مدد کے لئے طلب کیا۔ ابہنگ خاں نے زبردستی راستہ نکالنا چاہا، لیکن مغلوں نے اُسے پسپا کر دیا اور شکست فاش دی۔ ابہنگ خاں اندھیری رات میں چند چیدہ اور تجربہ کار سواروں کو ہمراہ لے کر قلعہ میں داخل ہو گیا۔ اِس تھوڑی سی مدد نے اہل قلعہ میں ایک تازہ روح پھونک دی اُن کی ہمت اس قدر بلند اور حوصلہ اس قدر بڑھ گیا کہ وہ محاصرہ کا سختی سے مقابلہ کرتے رہے۔

دو ماہ کے طویل اور خاموش محاصرے کے بعد ۲۔ مارچ ۱۵۹۶ء میں مغلوں نے قلعہ کی دیوار میں رخنہ اندازی شروع کر دی اور اس میں وہ ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ یہ دیکھکر اور اس سے خوفزدہ ہو کر مخصوص افسران نے بھاگنے کا مصمم ارادہ کر لیا[4]۔ لیکن برخلاف اس کے چاند بی بی نے نہایت مردانگی سے زرہ پہن، نقاب ڈال، برہنہ شمشیر ہاتھ میں لیکر رخنہ اندازی کی حفاظت کے لئے وہاں آموجود ہوئی۔ اِس دلیری اور مردانگی نے اہل قلعہ کے حوصلوں اور اُن کی ہمتوں کو اور بڑھا دیا

---

[1] برہان کہتا ہے کہ احمد خود بھاگ گیا اور میاں منجو نے بھی یہی کیا، دیکھو اکبر نامہ E. D. IV صـ ۹۲

[2] برہان I. A جلد سوم صـ ۲۹۹

[3] فرشتہ جلد سوم صـ ۲۹۵-۲۹۷　برہان جلد سوم صـ ۲۹

[4] برہان کے خیال سے یہ غلط ہے، اس میں شک نہیں کہ افسران خوفزدہ ضرور ہو گئے تھے مگر وہ مدافعت پر تیار تھے اور چاند بی بی کے تحریک پر تامل سے بہت کچھ ان کی ہمت افزائی ہو گئی تھی۔ برہان I. A جلد سوم صـ ۳۲۳-۳۲۶

اور سب کے سب متفق ہوکر اس کی مدد کرنے اور اس کا ساتھ دینے کے لئے ہر ممکن طریقہ سے آمادہ ہوگئے۔
اس موقعہ پر یہ بتلا دینا نامناسب نہ ہوگا کہ چاند بی بی اپنے ہمراہ تھوڑا سا زہر بھی لائی تھی کہ اگر خدانخواستہ قلعہ ہاتھ سے جاتا رہا تو وہ زہر کھا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کرلے گی۔[۵۱]

آخر کار دن کے آخری چار گھنٹوں میں غروب آفتاب تک برابر لڑائی ہوتی رہی اور غنیم کو بغیر کسی نتیجہ پر پہونچے ہوئے پسپا ہونا پڑا۔ لیکن پھر بھی چاند بی بی اپنی جگہ سے نہ ہٹی اور اپنی موجودگی میں معماروں کو بلا کر راتوں رات قلعہ کی دیوار پتھر سے تیار کرا دی۔ اس طرح سے رخنے بند کر دئے گئے اس کے بعد چاند بی بی فوجی رسالوں کو ضروری ہدایات کرکے اپنے جائے قیام پر واپس آئی۔

دوسرے دن غنیم نے پھر حملہ کیا لیکن ناکام رہا۔ محصورین نے نہایت بہادری سے اُس کا مقابلہ کیا۔ مغل فوجیں رسد کی کمی کی وجہ سے پریشان تھیں اور محصورین سے کافی نقصان اور تکلیف برداشت کر چکی تھیں۔ اس لئے مغلوں نے نظام شاہی افسروں کو ورغلانا اور برانگیختہ کرنا چاہا۔ لیکن چاند بی بی کی عدیم المثال شخصیت کی وجہ سے ان کی کوششیں بے اثر اور ناکام ثابت ہوئیں۔ اسی اثنا میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ بیجاپور اور گولکنڈہ کی متحدہ فوجیں احمد نگر کی مدد کے لئے آرہی ہیں۔ بالآخر مجبور ہوکر مغلوں نے صلح کے لئے گفت و شنید کی صلح کا پیغام کیا آیا گویا محصورین کی منہ مانگی مراد بر آئی۔ صلح کے شرائط میں مغلوں نے برار کا صوبہ بھی طلب کیا، پہلے تو چاند بی بی نے اس شرط کے ماننے سے صاف انکار کر دیا، لیکن پھر غور و خوض کے بعد آمادہ ہوگئی، کہ ممکن ہے متحدہ کمک جو احمد نگر کی مدد کے لئے آرہی ہے پسپا ہو جائے اور پھر یہ شرائط بھی ہاتھ نہ آئیں۔ اس لیے اُس نے اپنی رضامندی کا اظہار کیا اور ۲۳ مارچ ۱۵۹۶ء کو صلح نامہ پر بہادر شاہ کی جانب سے دستخط کر دیئے اور مغل واپس گئے۔[۵۲]

مغلوں کی واپسی کے بعد میاں منجو کو یہ امید تھی کہ ان کا آوردہ احمد بادشاہ تسلیم کرلیا جائیگا لیکن اہنگ خاں اور چاند بی بی کے موافق دوسرے اُمرا نے اِس سے انکار کر دیا، قلعہ کے دروازے بند کر دیئے اور فوج کا ایک دستہ بہادر شاہ کی حفاظت اور اس کو قلعہ چونہ سے لانے کے لیئے روانہ کیا۔ اس فعل سے احمد نگر میں ایک زبردست خانہ جنگی کے ہونے کا پھر احتمال تھا۔ لیکن ابراہیم عادل شاہ نے جسے چاند بی بی نے بحیثیت ایک شخص ثالث کے مدعو کیا تھا معاملات

---

[۵۱] برہان صفحہ ۳۴۲-۳۳۹ فرشتہ جلد سوم صفحہ ۳۰۱-۳۰۲
[۵۲] برہان صفحہ ۳۴۱-۳۴۶ فرشتہ جلد سوم صفحہ ۳۰۲-۳۰۳ اکبر نامہ II E.D. صفحہ ۹۴

کو نہایت حسن و خوبی سے رفع دفع کر دیا۔ ابراہیم نے یہ معلوم کر کے کہ احمد نظام شاہی خاندان سے نہیں ہے اُسے ایک جاگیر دے کر علیحدہ کر دیا۔ اور میاں منجو کو اس کی حمایت اور پشت پناہی سے باز رکھا۔ مزید احتیاط کے لئے اُس نے میاں منجو کو اپنے اراکین سلطنت میں شامل کر لیا۔

اس حکمت عملی سے چاند بی بی اپنے دلی مقاصد میں کامیاب ہوئی۔ بہادر شاہ اُس کے قبضہ میں آگیا اور احمد نگر کا بادشاہ مقرر ہوا۔ چاند بی بی نے اپنے مشیر خاص محمد خاں کو پیشوا مقرر کیا۔ محمد خاں نے اپنے مخصوص دوستوں اور رفیقوں کو ترقیاں دے کر اور جدید واقعات و حوادث میں اقتدار حاصل کرنے والے اور حصہ لینے والوں کی حق تلفیاں کر کے اپنے کو بہت جلد بدنام کر لیا۔ اس شورش اور فتنہ و فساد کو دفع کرنے کے لئے اس نے حبشیوں کے سردار اہنگ خاں کو قید کر لیا۔

محمد خاں نے مطلق العنان ہو کر چاند بی بی کو بالکل فراموش کر دیا۔ چاند بی بی نے اپنی حق تلفی کا احساس کر کے ابراہیم عادل شاہ کو اپنی مدد کے لئے بلایا تاکہ محمد خاں معزول کر دیا جائے۔ ابراہیم عادل شاہ نے سہیل خاں کو چاند بی بی کے احکام کی پوری طور سے تعمیل کرنے کے لئے احمد نگر بھیجا[۵۱]۔

محمد خاں آسانی سے مغصوب تخت کو دینے والا کب تھا۔ اُس نے شہر پناہ کے دروازے بند کر دیئے۔ سہیل خاں چار ماہ تک احمد نگر کا محاصرہ کئے پڑا رہا۔ آخر کار مجبور ہو کر محمد خاں نے مغلوں سے کمک طلب کی اور خانخاناں کو برار سے اپنی مدد کے لئے اس شرط پر بلایا کہ وہ آئندہ سے مغلوں کا باج گزار رہیگا۔ اہل قلعہ کو جب اس سازش کا حال معلوم ہوا تو وہ محمد خاں کو گرفتار کر کے ملکہ کے پاس لے آئے۔ محمد خاں قید کر دیا گیا اور ملکہ نے اہنگ خاں کو قید سے رہا کر کے ملکی معاملات کی دیکھ بھال کے لئے محمد خاں کی جگہ پر مقرر کیا، اور بیجاپوریوں کو اپنے ملک واپس جانے کی اجازت دیدی[۵۲]۔

چاند بی بی صرف احمد نگر پر اپنا سکہ بٹھانے سے مطمئن نہ تھی بلکہ وہ ان مغلوں کی بھی سرکوبی چاہتی تھی جنھوں نے احمد نگر کی بدامنی سے فائدہ اُٹھا کر برار کے باہر پتھری پر قبضہ کرنے کا ارادہ ظاہر کر کے صلح نامہ کی عہد شکنی کا ثبوت دیا تھا۔ ملکہ نے سلاطین گولکنڈہ اور بیجاپور کو مغلوں کی اس غارت گری سے مطلع کیا چنانچہ اس خبر کے پاتے ہی ابراہیم عادل شاہ نے سہیل خاں کو برار کی جانب مغلوں کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ محمد قلی قطب شاہ نے بھی گولکنڈہ سے ایک فوج

---

۵۱ فرشتہ جلد سوم صفحہ ۳۰۶

۵۲ فرشتہ جلد سوم صفحہ ۳۰۵ - ۳۰۶

بیجاپوریوں کی مدد کے لئے بھیجی۔ دونوں فوجیں نظام شاہی لشکر کے ساتھ برار کی طرف بڑھیں اور شہر سونپت کے قریب خیمہ زن ہوکر نبرد آزما ہوئیں۔

اس جنگ میں پہلے تو مغل پسپا ہوئے لیکن اپنی خوش قسمتی سے آخر کار فتحیاب ہو گئے۔ اس کے بعد مغل فوجوں میں آپس میں کچھ جھگڑا ہو گیا، خان خاناں واپس بلا لیا گیا، غالباً اسی وجہ سے نظام شاہی سلطنت مغلوں کے فوری حملہ سے محفوظ رہی[۱]۔

جنگ سونپت کے بعد دونوں متحدہ فوجیں اپنی اپنی جگہ واپس گئیں۔ ابہنگ خاں احمد نگر کے وزیر نے دار السلطنت کی طرف مراجعت کی محمد خاں کی طرح وہ بھی چاند بی بی کی بیخ کنی کے لئے بادشاہ اور ملکہ کو اپنے قبضہ میں لانے کی ترکیب کرنے لگا۔ تاکہ بادشاہ کے سرپرست اور اتالیق کی حیثیت سے اسے تمام امور سلطنت پر اختیار و اقتدار حاصل ہو جائے۔ چاند بی بی نے اس کے ارادوں کو محسوس کرکے حکم دیا کہ قلعہ میں رہنے کے بجائے شہر میں رہ کر حکومت کرے اور قلعہ کا دروازہ اس کے لئے بند کرا دیا۔ کچھ عرصہ کی خاموشی کے بعد ابہنگ خاں نے قلعہ پر یکایک حملہ کر دیا۔ ابراہیم عادل شاہ نے اس آپس کی خانہ جنگی کو دور کرنے کے لئے مصالحت کرانی چاہی، لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی۔ ابہنگ خاں قلعہ پر برابر حملے کرتا رہا اور خانخاناں کی دکن میں عدم موجودگی سے بیجا فائدہ اٹھا کر مغلوں کی ان حدود سلطنت پر قبضہ کر لیا[۲]۔

شہنشاہ اکبر احمد نگر فتح کرنے پر تلا ہوا تھا، اس نے شہزادہ دانیال اور خانخاناں کو احمد نگر روانہ کیا، کیونکہ شہزادہ مراد اس وقت مر چکا تھا۔ اور خود برہان پور کی طرف بڑھا[۳]۔

ابہنگ خاں نے مغلوں کی آمد کی خبر سن کر محاصرہ اٹھا لیا اور ان کے مقابلہ کے لئے بڑھا۔ شہزادہ دانیال نے جاسوسوں سے ابہنگ خاں کی نقل و حرکت کا حال معلوم کرکے اسے دام فریب میں رکھا۔ اس طرح سے دھوکا کھا جانے پر ابہنگ خاں جھنجھلایا اور اس نے اپنا بہت سا سامان آگ کی نذر کر دیا۔ پھر احمد نگر واپس آکر چاند بی بی کے پاس صلح کا پیغام بھیجا۔ چاند بی بی نے پیغام صلح کو نامنظور کرکے سخت غلطی کی، کیونکہ ابہنگ خاں جونار بھاگ گیا اور مغلوں کے لئے راستہ بالکل صاف ہو گیا۔ اپریل ۱۶۰۰ء میں مغلوں نے احمد نگر کا محاصرہ کرکے سرنگ لگانی شروع کر دی[۴]۔

---

[۱] فرشتہ جلد سوم صفحہ ۳۰۹-۳۰۷ دیکھو اکبر نامہ E. D. VI صفحہ ۹۶-۹۵ اور Smith صفحہ ۲۷۰

[۲] فرشتہ جلد سوم صفحہ ۳۱۰

[۳] اکبر نامہ E. D. VI صفحہ ۱۰۰-۹۹ جلد اول صفحہ ۳۲۶

[۴] فرشتہ جلد سوم صفحہ ۳۱۲-۳۱۱

چاند بی بی نے مشورہ کے لئے حامد خاں خواجہ سرا کو بلایا۔ یہ قلعہ کا سربرآوردہ افسر تھا اور اِس جنگ میں مر مٹنے کے لئے تیار تھا۔ چاند بی بی نے دیکھا کہ اس محاصرے کا مقابلہ ناممکن ہے، تو اُس نے مغلوں سے مصالحت کرنی چاہی[1] تاکہ وہ قلعہ سے محاصرہ اُٹھالیں اور چاند بی بی نوعمر بادشاہ کے ساتھ جونا چلی جائے۔ اس ارادہ سے باخبر ہوکر حامد خاں نے تمام شہر میں چاند بی بی کے مغلوں سے مِل جانے کی خبر مشہور کردی۔ ہر شخص ایک دوسرے سے سرگوشی کرنے لگا کہ چاند بی بی کے تمام سردار شہنشاہی فوج سے مِل گئے[2]۔ اس سے دکنی فوجوں میں شبہات پیدا ہوگئے۔ اور غصہ کی آگ بھڑکنے لگی کیونکہ حامد خاں نے عام رعایا اور تمام لوگوں کو بہت بُری طرح سے برانگیختہ کردیا تھا۔ لوگ غصہ کی حالت میں سخت ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے حامد خاں کی رہنمائی میں محل پر حملہ آور ہوئے۔ ملکہ کو دیوان عام میں نہ پاکر سب لوگ محل کے اندر جہاں ملکہ موجود تھی پہونچ گئے۔ اِس منظر کے دیکھتے ہی چاند بی بی اپنا انجام سمجھ گئی۔ اُس نے نہایت دلیری سے ان کا مقابلہ کیا اور اُن کی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا چاہا، لیکن جوشِ غضب میں لوگوں کی عقلوں پر پردے پڑگئے اور کسی نے اُس کی ایک نہ سُنی، برابر یورش کرتے رہے۔ حامد خاں نے ملکہ پر پہلا وار کیا[3] پھر وہ بہت جلد زخموں سے چُور ہوکر گر پڑی اور اُس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔

اس طرح چاند بی بی کی موت اُنھیں لوگوں کے ہاتھ ہوئی جن کی فلاح و بہبود کے لئے اُس نے ہر امکانی کوشش کی۔ اِس طرح سے ہندوستان کی اِس بہادر، دلیر اور شریف عورت کا خاتمہ ہوا۔

یہ واقعہ غالباً مئی ۱۶۰۰ء کا ہے، چار ماہ چار دن کے محاصرے کے بعد اختتام اگست میں احمد نگر فتح ہوکر دوسروں کے قبضے میں چلا گیا[4]۔



[1] ابوالفضل اس کی تائید کرتا ہے "چاند بی بی صلح رکھنا چاہتی تھی ....." اکبر نامہ E. D. VI ص ۱۰۰-۹۹

[2] اکبر نامہ E. D. VI ص ۱۰۱-۹۹

[3] فرشتہ جلد سوم ص ۳۱۲

[4] آئین جلد اول ص ۳۳۵ Smith ص ۳۴۷

دو پھول

(از پنڈت آنند نراین ملا، ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی)

صبح کو ایک ہی کیاری میں دو گلاب پھول رہے تھے
ایک ہی ڈالی کی پینگوں پر جھولا جھول رہے تھے
ایک ہی رات کے پردہ میں اُترا تھا ہرا دوپٹا
ایک ہی شبنم کی برکھا نے دھویا گورا پنڈا
کلی پنے سے بڑے ہوئے تھے دونوں سنگ ہی سنگ
ایک ہی سورج کی کرنوں نے دیا تھا روپ اور رنگ
ایک ہی مٹی اور پانی سے نازک جسم بنا تھا
ایک ہوا کی گود میں جیون کا سپنا دیکھا تھا
آئی ٹہلنے باغ میں اک چنچل مدھ ماتی نار
ایک کو اُس نے توڑا اور بالوں کا کیا سنگھار
ڈالی سے بھی سوا لگا کچھ سر پر پھول وہ پیارا
جیسے بادل چیر کے ہنس دے کوئی روشن تارا
جیسے کالی پلکوں پر آنسو کا موتی چمکے
جیسے پربت کی چوٹی پر برف کی چاندی دمکے
جیسے ساگر کے جل تھل پر کوئی ٹاپو اُبھرے
جیسے شیش پہ شنکر کے گنگا کی دھارا اُترے

۲

دوسرا پھول لگے لگے ڈالی ہی پر کمھلایا
[illegible]

گرم اور تیز ہوا کے جھونکوں کی وہ تاب نہ لایا
سوکھ کے آخر ڈالی پر سے ٹوٹ کے خاک پہ آیا

خاک میں مِل کر خاک ہوئیں وہ نازک پنکھڑیاں بھی
جن کو دیکھ کر جلتی تھیں اِندر اسبھا کی پریاں بھی

اور تو اور اُسی کیاری کی آنکھوں میں وہ کھٹکا
دُور اُسے لے جا کر مالی نے گھورے پر پٹکا

پھیر یہ کیسا بھاگ کا ہے، کیسی یہ جگ کی ریت
ایک نظر کا نُور بڑھائے، ایک جگر کی ٹیس

ایک کو اپنائے اور ایک کو آنکھ دکھائے باغ
ایک کو گھر دیا کہے اور ایک کو گُل کا داغ

ایک کا ہو ہر کنج میں چرچا، ایک کو جائیں بھول
ایک کِسی کے سر کا زیور، ایک کے سر پہ دھول

دو گلاب کے پھول

چادر کی بھیک

جوش ملیح آبادی

معاذ اللہ اِس شدت کی سردی — نہیں چڑھتا کسی صورت سے پارا
ترشح ہو رہا ہے ہلکا ہلکا — دھوئیں میں تیرتا گم ہے دریا کا کنارا
صدا یہ دے رہی ہے ایک بڑھیا — کہ بابا میں بہت ہوں بے سہارا
ہوائیں چل رہی ہیں ٹھنڈی ٹھنڈی — اُڑھا دو کوئی اِک چادر خدارا
مدد میں کرسکوں اے جوش کیونکر — کہ خود گردش میں ہے میرا ستارا

فقط ہلکی سی اِس بڑھیا کو چادر
خدایا! دادرا!! پروردگارا!!!

کلامِ حسرت

(حضرت مولانا حسرت موہانی)

سامنا اُن کے حسنِ طلعت کا
سبب اچھا ہے میری حیرت کا

ختم کرتے ہو کیوں عطا پہ جفا
کچھ تو موقع رہے شکایت کا

یاد اُس بے خبر کی پھر آئی
پھر اُٹھا دل میں درد شدّت کا

ہو نہ جائے ہجوم شوق میں گُم
خوفِ ناصح تری ملامت کا

ہو جو حاصل تری محبت میں
نام راحت ہے اُس مصیبت کا

کیا کریں ہے خلافِ رسمِ وفا
شکوہ اُس یار بے مروت کا

جان حسنِ کلام ہے لاریب
سخنِ دل شکار حسرت کا

مصیبت بھی راحت فضا ہو گئی ہے
تری آرزو رہنما ہو گئی ہے

یہ وہ راستا ہے دیارِ وفا کا
جہاں بادِ صرصر صبا ہو گئی ہے

مَیں درماندہ اُس بارگاہِ عطا کا
گنہگار ہوں اِک خطا ہو گئی ہے

ترے رتبہ دانِ محبت کی حالت
ترے شوق میں کیا سے کیا ہو گئی ہے

پہنچ جائیں گے انتہا کو بھی حسرت
جب اِس راہ کی ابتدا ہو گئی ہے

ترے غم کی ناشادیاں چاہتا ہوں
محبت کی بربادیاں چاہتا ہوں

مَیں اِس قید کی سرفرازی پہ نازاں
تمنّا کی آزادیاں چاہتا ہوں

مَیں ویرانۂ دل میں اُس نورِ جاں کے
تصوّر کی آبادیاں چاہتا ہوں

روٹھنے پر بھی مجھے بھول نہ جانے والے
اے بدورانِ سفر خواب میں آنے والے

لیکے آغوشِ محبت میں بہ اقرارِ خطا
ہم بھی ہیں آج اُنھیں رو رو کے رُلانیوالے

یہ بھی اِک چھیڑ تھی شاید پے تنبیہ وفا
ورنہ تم یوں تو نہ تھے میرے ستانے والے

نگہِ دوست ہے محجوب تو ہم بھی حسرت
لب تک اب شکوۂ حرماں نہیں لانیوالے

شاہجہاں پور کے ہندو شعرا

(۲)

(از حضرت کلیم اعظم گڈھی)

(۱۱) جوہر

آپ کا اسم مبارک منشی سیو رام تخلص جوہر ہے، مسرت کے شاگرد رشید، آپ ایک معزز کالیستھ گھرانے کے فرد تھے، آپ کا مکان اورنگ محلہ شاہجہانپور میں تھا۔ تصنیف اور تالیف کے بیحد شائق تھے حسب ذیل کتابیں آپ کی تصنیفات و تالیفات میں کہی جاتی ہیں، دلیل الترکیب، جوہر الترکیب املائے جوہری۔ جواہر التعلیم۔ جواہر الترکیب کی ابتدا اور خاتمہ پر کچھ اشعار ہیں انھیں میں سے نمونہ کلام پیش کیا جاتا ہے

بعد فن نحو خواں فن معانی و بیاں تا شوی بالغ بہر یک طرز لے عالی مقام
طالباں راحق زنظم کامیاب فیض کن تا دعائے شاں مرا از رحمت سازد بکام
سال ہجرت یک ہزار و دو صد افزوں سی و پنج عہد ظل اللہ اکبر شاہ کردم اختتام

(۱۲) ہری رام خورم

آپ کا ہری رام نام اور خورم تخلص تھا، محلہ گاڑی پورہ شاہجہانپور میں رہتے تھے۔ سرور کے شاگرد تھے آبائی پیشہ طبابت تھا اور یہی گزر اوقات کا ذریعہ تھا۔

(نمونۂ کلام)

الٰہی گوہر گوش جہاں کن داستانم را بہ بحر لفظ و معنی آشنا گرداں زبانم را

آں لب جاں بخش را آلودۂ صہبا مکن خون مشتاقان خود بر گردن مینا مکن

(۱۳) فرحت

آپ کا نام رائے کشن سہائے قوم کالیستھ محلہ حسین پورہ میں رہتے تھے، قدیمی وطن بدایوں تھا۔ آپ کے خاندانی لوگ اکثر جلیل القدر عہدے پر ممتاز ہوتے چلے آئے، چنانچہ ان کے والد رائے سنگھ ندہان جن کو مراد آباد، بریلی، شاہجہانپور کی تحصیلداری سپرد تھی، بعد وفات اُن کی جگہ پر اُن کے لڑکے کو تفویض ہوئی آپ نے محمدی اور بہرائچ کی ٹھیکہ داری بھی کی۔ یہ غلام حسین ایسے یگانۂ روزگار شاعر کے شاگرد تھے۔ آپ کی

تصانیف میں بہت سی کتابیں تھیں مگر کسی کا پتہ نہیں، قصہ لیلاوتی کو نظم کیا، ایک لغت نادر اور عجیب الفاظ پر مشتمل تیار کی جس کا نام تالیف فرحتی رکھا محاوراتِ عجیبہ کو اکٹھا کر کے ایک کتاب تالیف فرمائی اس کا نام رسالہ بدیع الانشار رکھا، افسانہ گل بکاؤلی کو مثنوی میر حسن کے طرز پر نظم کیا اور اس کا نام سوز عشق رکھا ایک دیوان اُردو اور فارسی کا مرتب کیا جس کا نام دیوان رعنا رکھا۔ ایک مختصر تاریخ سلاطین چغتائیہ سے لیکر انگریزی عہد تک کی لکھی، اس کا نام آئین انگریزی رکھا۔ غرض تصنیف و تالیف کا بے حد شوق تھا۔ خاندانی سلسلہ ابتک قائم ہے جو خوشحال بھی ہے۔ مگر سوائے آئین انگریزی کے اور کسی کا پتہ نہیں، اُسی سے اُن کے اُردو کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے :-

ہراک ذرہ اس سے ہوا تابدار	اسی سے یہ ذرہ ہوا آبدار
شفق کا بنا کر کے رنگِ عجیب	کیا دامنِ آسماں کے نصیب
ہراک شاخ گل اس گلستان کی	ہوئی ذکر خواں اس کے احسان کی
ولیکن بشر کی یہ طاقت کہاں	کہ کھولے وہ اس کی ثنا میں زباں
اسی رہ میں پائے خرد لنگ ہے	سخن کا یہاں قافیہ تنگ ہے
ملک ذکر میں اُس کے خاموش ہیں	فلک بھی تو از حد فراموش ہیں

یہ منزل تو فرحت سمجھ کر کے دور
درازی کو کوتاہ کر اب ضرور

(۱۴) حقیر

آپ کا اسم گرامی منشی سوہن لال حقیر تخلص عالی خاندان کالیستھ کے فرد محلہ مظفر گنج میں رہتے تھے اپنے دادا دولہ رائے عرف بابا امرداس جو ایک بزرگ صوفی تھے اُن کے ہم مشرب تھے فارسی میں دستگاہ کامل تھی۔ آپ جس طرح اچھی نظمیں لکھ لیتے تھے اُسی طرح نثر کا بھی ایک خاص رنگ تھا۔ عربی کی تعلیم مولوی غلام محی الدین خاں سے حاصل کی اور قرآن پاک کو باترجمہ و باتفسیر پڑھا چنانچہ مرتے دم تک تلاوت ناغہ نہ ہوئی۔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں تھے خود طبیعت ہی اُستاد تھی۔ صوفیانہ رنگ ورثہ میں ملا تھا، ایسی گودوں میں پلے تھے جہاں سوائے تصوف کے اور کسی چیز کا چرچا ہی نہیں تھا۔ چنانچہ ان کے والد بزرگوار ہزاری لال بھی ایک باکمال صوفی تھے۔ آپ کا انتقال ۱۹۱۷ء میں ہوا۔ آپ کا دیوان فارسی طبع ہو چکا ہے جو اول تا آخر صوفیانہ اشعار کا مجموعہ ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

رباعی

اے تو مجدسی میانِ وادِ طیں نام مرگ ار بشنوی باشی حزیں

مرگ روز عید و وصل است اے حقیر کوز قید آزاد سازد بالیقیں

آنانکہ خود نماز ادا روبرو کنند از آب چشم مردمک آسا وضو کنند
شب شد سحر حقیر چو در انتظار یار چوں صبح شد زباد صبا گفتگو کنند

رباعی

چیست ہستی بودن اندر ماو من ماو من را داں عدوے راہزن
چوں من و تو محو شد از دل حقیر رستگاری کت گردد بے سخن

حقیرم، خاکسارم، ریگ خشکم، لیک در معنی نیم مے کند تسنیم از موج سراب ما

ایک مکمل غزل ملاحظہ ہو:-

لذت بیخودی اندر دل ہشیار کجاست لن ترانی بہ لب یار ز انکار کجاست
رخ سوے خار مغیلاں کند ایں ناقہ و جرس نالہ از شور کہ ایں راہ رہ یار کجاست
بود اندر عدم ایں کون و مکاں بر چہ صفت غیر خود رفتہ دگر کاشف اسرار کجاست
ہر کہ شد محو بدیدار زباں گنگ شود قوت ناطقہ در نرگس بیمار کجاست
بے تصادم نجہد یک شرر از آہن و سنگ تا نہ کوبی در دل جلوۂ انوار کجاست
خستۂ خنجر و پیکان و سناں بہ شدنی است آنکہ در سینہ اگل می خلد از خار کجاست
ایں خمار از قدح پیر مغاں می خیزد کہ ز خمار بپرسند کہ خمار کجاست

الحذر بیجہ وحد ہر دو برون ست حقیر
غیر او را ہبر منزل دلدار کجاست

اُردو کا کلام باوجود تلاش نہ مل سکا، ایک شعر تاریخ صبیح میں نظر سے گزرا وہ یہ ہے۔

میں اپنے جُرم کے صدقے مراد بر آئی طلب کیا مجھے سرکار نے سزا کے لئے

(۱۵) جویا

منشی ہر نراین صاحب نام جویا تخلص شاہجہانپور وطن۔ صدر قانون گوئی کے عہدہ پر ممتاز تھے۔ حقیر کے فارسی دیوان کی تاریخ لکھی ہے، اسی سے اُن کے فارسی کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے، اور کچھ حالات معلوم نہیں ہوئے۔ قطعۂ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ حقیر کے شاگرد تھے:-

زباغِ ادم استادم شگفتہ گل معنی اسرارِ نہفتہ
فرورفتہ بہ بحر معنوی اوست دریکتائے معنی ہائے سُفتہ
چناں تو ضیح معنی کرد در وے کہ شد کشاف اسرار نہفتہ
بمنزل تا رسد جویا بآساں غبار و خار راہ اوم رُفتہ
بروے سال طبعش کلک جویا زباغ حمد گل بشگفت گفتہ

(دیگر)

نسخۂ بے مثال حمد وثنا پُرز توحید اوم سرتا پا
گلشن حمد تازہ وسیراب معنی و لفظ بود گل آسا
یعنی دیوانِ بے نظیر حقیر پاک از وصف خال وزلف دوتا
سالک طالبانِ حق صادق بہر شعر است رہبر یکتا
طبع گردید اندریں ایام روے بنمود ہمچو شمس سما
بہر تاریخ طبع گفت سروش بے سخن لانظیر گو جویا

موجودہ دور میں بھگوتی سہائے بیدار جن کی عمر تقریباً پچاس سال ہے، ایک معزز کایستھ خاندان کے فرد ہیں، آپ بہترین مقرر ہیں کونسل کے ممبر بھی رہ چکے ہیں۔ اُردو کا کلام پاکیزہ ہوتا ہے۔

رامیشور پرشاد عرف گوپالی بابو جوچ تخلص فرماتے ہیں اور ظریف لکھنوی کے شاگرد ہیں، عمر تقریباً چالیس سال ہے، کلام ظرافت کا بہترین نمونہ ہوتا ہے۔

مہاراج سنگھ صاحب خاکی آپ مختار عدالت ہیں، عمر تقریباً پچاس سال۔

شکتی پرشاد صاحب وثیقہ نویس عمر تقریباً ستر سال، فارسی کلام عمدہ ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ جو شعراء ہیں وہ ابھی نوخیز ہیں، مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں، رنگ کلام سے پتہ چلتا ہے کہ جلد ہی کامیاب شاعر ہو جائیں گے۔

یہاں کے مایۂ ناز شاعر جناب پنڈت جگموہن ناتھ رینہ ہیں جو صاحبِ دیوان ہیں۔

(۱۶) شوق

اسم گرامی پنڈت جگموہن ناتھ رینہ شوق تخلص، والد کا نام پنڈت وشیشور ناتھ رینہ کاشمیری الاصل ہیں ۱۸۶۳ء میں بمقام اندور پیدا ہوئے۔ آپ کے خاندان کا تعلق جاورہ ریاست سے تین پشت سے تھا۔ نواب غفور خاں صاحب مہاراجہ ہلکر کے سپہ سالار تھے، جب اُن کو اپنا علاقہ الگ ملا تو اُنھوں نے جاورہ کو اپنا

دارالحکومت بنایا اور شوق صاحب کے جدِ امجد پنڈت شیو ناتھ صاحب کو دیوانِ ریاست مقرر کیا۔
آپ کے دادا پنڈت ہرنراین صاحب اندور میں ایجنٹ گورنر جنرل سنٹرل انڈیا کے یہاں ریاست جاورہ کے وکیل تھے، آپ کے والد بھی دادا کے بعد اسی عہدہ پر فائز رہے۔
شوق صاحب بتلاش روزگار شمالی ہندوستان کی طرف تشریف لائے۔ سنہ ۱۸۹۰ء میں پراونشیل ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے۔ چنانچہ تیرہ ضلعوں میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ پر فائز رہ کر سنہ ۱۹۲۰ء میں پنشن لے کر اپنے لڑکے چندر موہن ناتھ کے یہاں چلے آئے اور شاہجہانپور میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔
آپ کو شاعری کا شوق ہوا تو ۱۸۸۴ء سے سنہ ۱۹۰۰ء تک امیر مینائی سے مشورۂ سخن کرتے رہے اس وقت کا کُل کلام دیمک کے مطالعہ میں چلا گیا۔ سنہ ۱۹۰۱ء سے سنہ ۱۹۱۵ء تک ملازمت کے تنگ ودو میں شاعری ترک رہی۔ سنہ ۱۹۱۶ء سے نوح ناروی کو کلام دکھانے لگے، اُن کے بعد تاباں بدایونی شاگرد منیر سے مشورۂ سخن کرتے ہیں۔
اتنے اُستادوں کی آنکھیں دیکھنے کے بعد کلام جس پایہ کا ہو سکتا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں نمونۂ کلام سے ناظرین خود فیصلہ کر لیں گے۔
باوجود پیرانہ سالی اس وقت آپ انجمن ترقی اردو شاہجہانپور کے صدر ہیں آپ کے دولت خانہ پر ماہانہ مشاعرہ ہوا کرتا ہے، جملہ انتظامات نہایت فراخ دلی سے فرماتے ہیں آپ کا دم یہاں غنیمت ہے نہایت خلیق اور منکسر المزاج آدمی ہیں۔ آپ کا ایک دیوان پیامِ شوق طبع ہو کر مقبولِ خلائق ہو چکا ہے۔

نمونۂ کلام۔ صوفیانہ کلام کا رنگ:۔

صفحۂ دل مرا آئینۂ رمزِ توحید ‏ ‏ رازِ کونین خلاصہ مرے افسانے کا
حریفِ جلوۂ کثرت نہ تھا گو پردۂ وحدت ‏ ‏ فریبِ حسن سے لازم تھا لیکن باخبر ہونا
وحدت و کثرت کے جلوے ہیں عیاں دل کے قریب ‏ ‏ ضو فشاں ہے نقشِ اصلی نقشِ باطل کے قریب
حدِ احساسِ گنہ پردۂ رحمت میں نہیں ‏ ‏ جو گناہوں میں مزا ہے وہ ندامت میں نہیں
ہر شئے میں تیرا نقشہ ہر گل میں تیرا جلوہ ‏ ‏ ان آنکھوں کے کھلتے ہی کیا کیا نظر آتا ہے
نابود نمودیں ہیں اے شوق زمانے کی ‏ ‏ جو کچھ نظر آتا ہے دھوکا نظر آتا ہے

سلاستِ زبان و روزمرہ ملاحظہ ہو:۔

کر کے قول و قرار کیا کہنا ‏ ‏ اور فراموش کار کیا کہنا
کام بگڑے تو ہی بناتا ہے ‏ ‏ اے مرے کردگار کیا کہنا

دن کو تارے دکھا دیئے تو نے | اے شبِ انتظار کیا کہنا
چار پھولوں کو نہ ترسائیے گا | قبر پر میری اگر آئیے گا
دیجئے مجھکو نہ گیسو کی قسم | کچھ کہوں گا تو بگڑ جائیے گا
پھر یہ بہکی ہوئی باتیں کیسی | کیا زباں دیکے بدل جائیے گا
تن بیجاں میں اب رہا کیا ہے | دیکھئے مرضیِ خدا کیا ہے

معاملہ بندی اور رندی وشوخی کا رنگ دیکھئے:۔

آنکھوں آنکھوں میں وہ کیا کچھ کہہ گئے | لب پہ آتے ہی گلا جاتا رہا
ناتوانی مجھے اب کوئی کہاں تک روئے | ضعف سے نالۂ بیتاب بھی لرزاں نکلا
ذرا بت خانہ ہو کر میں ابھی آتا ہوں اے ساقی | میرے حصے کی جو کچھ ہو وہ پیمانے میں کہ دینا
ازل سے پہلے گر حسنِ ازل ملتا تو میں کہتا | ذرا سی وحشتِ دل اور دیوانے میں رکھ دینا
دل کی بیتابی وحسرت کا کھنچا ہو نقشہ | رنگ اڑتا ہوا تصویر کا بہزاد رہے
کچھ باقی ہے آنکھوں میں سرورِ رنگیں | تو چاہے تو ساقی انھیں میخانہ بنا دے
وہ کون سی صورت تھی کیا تجھ سے کہیں اے دل | جس رخ سے اُسے دیکھا تصویر نظر آئی
خدائی کا ہے دعویٰ اِن بتوں کو دیکھئے کیا ہو | اُدھر ایک سجدہ آؤ پھر امتحاں کریں
خود ہوئے آکر اسیرِ دامِ عشق | دشمنِ جاں قوتِ پرواز ہے

۱۹۲۳ء کی ایک مکمل غزل ملاحظہ فرمائیے:۔

رنج و الم میں جوش تھا اشکوں کے تار کو | کیا روک لیتے گریۂ بے اختیار کو
حق نے دیا ہے اوج یہ مجھ خاکسار کو | رشکِ فلک بنا دیا مشتِ غبار کو
وہ آرہے ہیں دیکھنا ہے وقتِ امتحاں | گھبرا کے کھو نہ بیٹھنا صبر و قرار کو
ہے شوق دید صبر و تحمل سے کام اگر | بے پردہ خود نقاب کرے حسنِ یار کو
محشر میں ہے پکار تمھاری اُٹھو چلو | اے سونے والے قبر کے چھوڑو مزار کو
یادِ وطن کی طرح رہی بیکسی بھی ساتھ | چھوڑا نہ تا بہ گ غریب الدیار کو
چلنے لگے عدم سے تو کچھ آگیا خیال | لے آئے ساتھ ہستیِ ناپائیدار کو

دیکھیں نظر بھی پڑتی ہے اس پر کسی کی شوق
آئے ہیں لے کے ہم دلِ اُمیدوار کو

جذباتِ مدہوش

(از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش ایم-اے)

سوختۂ غم

کبھی وہ دن تھا بزمِ دل میں اپنے شمع جلتی تھی
عروسِ آرزو پہلو میں رہ رہ کر مچلتی تھی

ارے وہ عشق کی گرمی ارے وہ حسن کی تابش
کہ شرحِ آرزو کرتے زبانِ خامہ جلتی تھی

نہ اب وہ آرزو باقی نہ شمعِ انجمن باقی
دھواں بھی تو نہیں اٹھتا جہاں پر آگ جلتی تھی

کہاں وہ خاک و خاکستر میں گرمی لیکن اب بھی تو
نکلتی ہے وہ آہِ شعلہ افشاں جو نکلتی تھی

ہمارے عشق پر مدہوش آتی ہے مثل صادق
کہ بل رسّی میں رہ جائیں گے گو ہر چند جلتی ہے

گلکاریِ عشق

فلک پہ حسن کے ہے کس شفق کی تابانی
فروغِ حسن میں جس سے ہوئی فراوانی

وہ رنگ اس پہ جمایا جمانے والوں نے
خود اپنے خون سے ہولی رچانے والوں نے

وہی جو روئیں تو روتے ہیں خون کے آنسو
لہو کے گھونٹ جو پیتے ہیں تھوکتے ہیں لہو

وہ جو کئے گئے عاشق کے نام سے موسوم
وہ زندہ دل کہ جو جیتے ہی جی ہوئے مرحوم

انھیں نے حسن کی غمگینیاں مٹائی ہیں
انھیں نے حسن کی رنگینیاں بڑھائی ہیں

جگر کے خون سے اپنے بنا کے غازۂ حسن
فسردہ ہو کے نکھاری بہارِ تازۂ حسن

انھیں کے زمرہ میں مدہوش اک خریں میں ہوں
کہ بزمِ شوق کا اک حاشیہ نشیں میں ہوں

ثوابِ عشق

جبتک میں آگ خانۂ دل کو لگا نہ دوں
جبتک میں بوند بوند لہو کی جلا نہ دوں

جبتک ہر ایک ذرّۂ دل خاک ہو نہ جائے
جبتک وہ میرے حال پہ خود ہی ترس کھائے

اُس وقت تک وصال کی حسرت حرام ہے
ہر آرزو و شوق تمنائے خام ہے

چھلکا کرے یہ نازِ مئے عشوہ و ادا
مہکا نہ دوں میں اور تو پینے کا کیا مزا

دل کی ملا نہ دوں مئے احمر تو حق گواہ
اُس وقت تک شراب یہ پینی ہے اک گناہ

یہ بوالہوس بھی آج تو دامن رچائے ہیں
یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں آئے ہیں

وہ بھی کرم کے جوش میں کچھ دیکھتا نہیں
اندوہگیں ہے اور بھی اب عاشقِ حزیں

مدہوش کہہ رہا ہے، جھکا کر سرِ نیاز
ہاں اے حضور! عشق و ہوس میں ہو امتیاز

غمِ عشق

شیشۂ دل کو کسی سنگ سے ٹکراؤں کہیں
خود کو بھی پاؤں نہ اس طرح سے کھو جاؤں کہیں

ہیں غمِ عشق پہ چرکے غمِ دوراں کے لگے
اور چرکے نہ غمِ عشق کے اب کھاؤں کہیں

کھل گیا سارا بھرم عشق کی سرمستی کا
دل مگر کہتا ہے اب بھی اُسے بھرماؤں کہیں

حسن کا ساز تو ہوتا ہے بڑا خواب آور
اس کو اس ساز میں لے جا کے سلا آؤں کہیں

آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹی ہے شبِ غم کتنی
تھپکیاں اب بھی نہ دے حسن تو مر جاؤں کہیں

رشک آتا ہے مجھے اُن پہ جو ہیں اہلِ جمود
دل کو پھینک آؤں کہیں عشق کو ٹھکراؤں کہیں

سانس لیتا ہوں تو آتا ہے کلیجا منہ کو
ایسے جینے سے تو مدہوش میں مر جاؤں کہیں

بے زبانیِ عشق

عشق کی رَو میں کچھ اِس طرح سے بہہ جاتے ہیں
جو کہ کہنا نہ ہمیں چاہیئے کہہ جاتے ہیں

اور جب کہنے کی ہو بات تو اُن کے آگے
دل کو ہم تھام کے خاموش سے رہ جاتے ہیں

ہاں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ رُکتے رُکتے
حسن توفیق جو دیتا ہے تو کہہ جاتے ہیں

جس نے کی سب پہ گرانی تھی بقولِ شاعر
ناتواں عشق کے اُس بار کو سہہ جاتے ہیں

بات پردہ کی ہے جو حضرتِ مدہوش اُسے
پردۂ شعر میں کس لطف سے کہہ جاتے ہیں

امید و یاس

اُمید بن کے محبت میں نا خدا آئی
مگر کبھی تو نہ کمبخت پار اُتار آئی

کشاں کشاں لئے جاتی ہے پھر بٹھانے وہاں
جہاں سے یاس ہمیں بارہا اٹھا لائی

ہوائے کوچۂ جاناں نہ آئی راس اُسے ہزار بار ہمیں لے گئی نہ بر آئی
میں کیا کہوں کہ یہ ناداں کی دوستی کیا تھی جو راہِ دوست میں اِک زندگی گنوا آئی

خود اپنے درد میں عزلت نشین کیا مدہوش
جو کام آئی تو کچھ یاسِ بے نوا آئی

عالمِ سکوت

زبانِ شعر سے اب کس طرح نہیں کا شف کہ اپنے حال سے اب خود نہیں ہیں ہم واقف
کہیں خوشی نہیں حاصل ہمیں تو لغو ہے یہ کہیں ہمارا نہیں درد اُنھیں تو لغو ہے یہ
کہیں اگر کہ انھیں درد ہے تو یہ بھی غلط کہیں ہمارا ہی دل سرد ہے تو یہ بھی غلط
بجا ہے گریہ کہیں گرم جوشیاں بھی نہیں کہ مر رہے ہیں مگر کہتے الاماں بھی نہیں
تڑپ رہے ہیں مگر آہ کی نہیں طاقت فلک شگاف فغاں کی بھی پر ہمیں ہے سکت
غلط ہے گریہ کہیں آہ میں اثر ہی نہیں یہ واقعہ بھی ہے رونے کو اب جگر ہی نہیں
نہ اب تمنا ہے جینے کی کچھ نہ مرنے کی ادائے فرض میں کوشش ہے سانس بھرنے کی

نہ اعترافِ محبت انھیں نہ ہے انکار
نہ اضطراب ہے مدہوش ہم کو اب نہ قرار

کیفِ غم

مَیں اپنے ہی رَو میں بہا جا رہا ہوں حوادث سے کہہ دو کہ خود آ رہا ہوں
اُسے بے تکلف، تامّل، توقف، تو سوئے اجل خود بڑھا جا رہا ہوں
مصیبت کو ٹھکرا کے، لبیک کہہ کر بڑھا وا انہیں دل کو دیے جا رہا ہوں
شہیدِ وفا کہہ کے کس حوصلے سے مَیں بہکے ہوئے دل کو بہکا رہا ہوں
میں پتھر سے دل اپنا ٹکرا چکا ہوں میں پتھر سے دل اپنا ٹکرا رہا ہوں
خود اپنے ہی خونِ جگر سے بنا کر میں زخموں پہ مرہم لگاتا رہا ہوں
فریبِ وفا کے وہ کھائے ہیں دھوکے حسینوں سے بھی اب مَیں گھبرا رہا ہوں
مجھے حسن نے اتنا بھرما دیا ہے کہ میں خود بھی اب دل کو بھرما رہا ہوں
مٹانے کی کیجیے نہ زحمت گوارا کہ مَیں خود ہی مٹتا چلا جا رہا ہوں
نہ روکیں مجھے ہوشمندانِ عالم اگر سوئے صحرا چلا جا رہا ہوں

ہے کوشش کہ پیدا کروں روئے خنداں / مگر غم کی صورت بنا جا رہا ہوں
تماشا سمجھتا تھا میں دردِ دل کو / تماشا میں بنتا چلا جا رہا ہوں
بڑا غم ہے اس زندگی کی بھنور میں / بہت ڈوبتا اور اُبھرتا رہا ہوں
نہ اب ڈوب کر میں اُبھر پاؤں شاید / کہ اب ڈوبتا ہی چلا جا رہا ہوں
بنائے غمِ عشق تو کیا مٹاتا / میں اپنی ہی ہستی مٹاتا رہا ہوں
نہ گرنے دیا بارِ غم میں نے ہرگز / خود اپنا لہو میں گراتا رہا ہوں
غمِ عشق کا باربردار ہوں میں / میں ہی ناتواں بار اُٹھاتا رہا ہوں
فریبِ وفا مرتے مرتے بھی کھایا / وہ آئے ہیں اُس وقت جب جا رہا ہوں
بڑی کوششیں ہیں کہ ٹھہرا رہوں میں / مگر اب تو گرتا چلا جا رہا ہوں
میں کرتا ہوں جتنی ہی دل کی جمعیت / پریشان خاطر ہوا جا رہا ہوں
عزیزوں طبیبوں نے سمجھا نہ سمجھے / یہ میں جانتا ہوں کہ میں جا رہا ہوں
نہیں شعر خوانی یہ ہے دل کا رونا / اجی آپ سمجھے کہ میں گا رہا ہوں
یہی ضبط کے چند ٹکڑے تھے باقی / انھیں بھی میں کھوتا چلا جا رہا ہوں
مرے صبر کی دھجیاں ڈھونڈھ لاؤ / میں گھبرا گیا ہوں میں گھبرا رہا ہوں
قسم ہے وفا کی وفا تم نہ کرنا / یہی اک قسم میں دلاتا رہا ہوں
طرحدار مدہوش ہے عشق میرا / بڑی شان سے درد اُٹھاتا رہا ہوں

ناصح

شعر گوئی میں کروں ترک، یہ ارشاد ہوا / پرسشِ حال کو جب حضرتِ ناصح آئے
اُن کا کہنا تھا کہ یہ فن ہے تضیعِ اوقات / اُن کو سمجھائے تو کیا خاک کوئی سمجھائے
عشق وہ چیز ہے جس کا ہے سمجھنا دشوار / تاب کچھ لائے تو کچھ ہم سے نکتے لائے
عمر بھر ہم تو اسی درد کا رونا روئے / حسنِ ظن آپ کا یہ سمجھے کہ نغمے گائے
دردمندانِ محبت کا سمجھنا نہیں کھیل / تھا یہ دعوےٰ کہ میرا درد بٹانے آئے
شکر صد شکر مرے حال پہ چھوڑا مجھکو / دردِ سر دور ہوا بعد کو وہ بھی آئے
رازِ دل چاہا کہ کہہ جائیں سو کہتے نہ بنا / ولولے دل میں اُٹھے پر نہ زباں تک آئے
عشق اندھا ہی نہیں گنگ بھی ہے اے مدہوش / بات کہنے کو یہ توفیق کہاں سے لائے

ہندوستان کا قدیم علم صنعت

(از منشی جگیشور ناتھ ورما بیتاب بی اے ایل ایل بی)

قدیم سنسکرت ادب میں صنعت کے مختلف موضوعات پر بہت سی کتابیں لکھی گئی تھیں، لیکن ان کا بیشتر حصّہ غیر ملکی حملہ آوروں کی تباہ کاری اور زمانہ کی لااُبالیوں کی نذر ہو گیا۔ مگر چند تصانیف ابتک نیپال گجرات، اڑلیسہ اور ٹراونکور میں محفوظ رہ گئی ہیں۔ ان میں سے (۱) واستو ودیا (वास्तु वि‍द्या) (۲) میمتم (मयमतम्) (۳) منشیالے چندرکا (मनुष्यालयचन्द्रिका) (۴) شلپ رتنم اور (۵) سمرانگن سوتردھارم (समरांगन सूत्रधारम्) یہ پانچ کتابیں ٹراونکور سے شائع ہو چکی ہیں۔ اڑلیسہ کے پرانے قلمی نسخوں میں (۱) بھون پرویش (भुवन प्रवेश) (۲) شلپ سداپے (शिल्प सदाजप) اور (۳) شلپ شاستر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ نیپال سے ابھی تک صرف ایک کتاب پرتی مالکشنم (प्रतिमा लक्षणाम्) ہی شائع ہوئی ہے گجرات میں (۱) اپراجت (अपराजित) اور گرہ وستوسار (गृह वस्तु सार) کے علاوہ اور بھی کئی معرکۃ الآرا تصانیف موجود ہیں۔

پنڈت گوری شنکر ہیرا چند اوجھا نے اپنی (मध्य कालीन भारतीय संस्कृति) (از منہ وسطیٰ میں ہندی تمدن نامی شہرۂ آفاق تصنیف میں علم صنعت سے متعلق حسب ذیل کتابوں کا حوالہ دیا ہے

(۱) واستو سوکھیہ	(वास्तु सौख्य)	(۱۱) وشوکرمیہ	(विश्वकर्मीय)
(۲) اپراجت واستو شاستر	अपराजित वास्तु शास्त्र)	(۱۲) کوتک لکشن	
(۳) پرساد انوکیرتن	(प्रसादानु कीर्तन)	(۱۳) مورتی لکشن	
(۴) چکر شاستر		(۱۴) پرتیما درویا دیوچن	(प्रतिमा द्रव्यादिवचन)
(۵) چتر پٹ		(۱۵) سکلادھیکار	(…कलाधिकार)
(۶) جلارگل	(जलार्गल)	(۱۶) سارس سوتیہ	(सारस्वतीय)
(۷) پکشی منشیالے لکشن	(पक्षि मनुष्यालय लक्षण)	(۱۷) شلپ شاستر	
(۸) رتھ لکشن		(۱۸) وشوکرم پرکاش	(विश्वकर्म प्रकाश)
(۹) ومان ودیا	(विमान विद्या)	(۱۹) وشوکرمیہ شلپ	(विश्वकर्मीय शिल्प)
(۱۰) ومان لکشن	(विमान लक्षण)		

ویدوں کے زمانہ میں شلپ یا صنعت کے معنی گانے بجانے اور ناچنے کے تھے، لیکن والمیک کی رامائن میں شلپ (صنعت) اور کلا (فن) کا استعمال مختلف معنوں میں ہوا ہے۔ اس عہد کے صناع جیسا کہ والمیکی رامائن کے بال کانڈ اور ایودھیا کانڈ میں مذکور ہے یگیہ کی ویدی (چبوترہ) اور سڑکیں بنانے کا کام کرتے تھے۔ اس طرح بہت سے کاریگروں کا شمار صناعوں میں ہونے لگا۔ استہ ودیا کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ معمار، بڑھئی، بت ساز اور کمہار بھی اسی زمرہ میں شامل تھے۔

برہم ویورت پران (ब्रह्म वैवर्त पुराण) میں وشوکرما کے اُن نو لڑکوں کو بھی یہی نام دیے گئے ہیں۔ (۱) مالی (۲) آہن گر (۳) شنکھ کا کام کرنے والا (۴) نوربافت (۵) کمہار (۶) کسیرا۔ (۷) درودگر (۸) مصور، اور (۹) زرکار یا سنار۔

مہابھارت میں ایک ہزار صنعتوں کا ذکر آیا ہے، اور ان سب کی ابتدا وشوکرما سے مانی گئی ہے اگنی پران سے بھی مہابھارت کے اس قول کی تائید ہوتی ہے۔ بعض علماء کے نزدیک شلپ شاستر کے حسب ذیل دس شعبے ہیں:-

(۱) کاشتکاری یا कृषि शास्त्र
(۲) جل شاستر یا پانی کا علم مثلاً تیراکی وغیرہ
(۳) کھنی شاستر یا کان کنی
(۴) نوکا شاستر یا ناؤ وغیرہ کا بنانا۔
(۵) رتھ شاستر
(۶) نیتر شاستر یا آلات سازی
(۷) ومان شاستر یا ہوائی جہاز بنانا
(۸) واستو شاستر یا صنعت تعمیر
(۹) پراکار شاستر یا شبیہ سازی (प्राकारशास्त्र)
(۱۰) نگر رچنا شاستر یا شہر بسانا۔

متسیہ (मतस्य) پران میں واستو شاستر کے جن اٹھارہ مصنفین کے نام درج ہیں وہ یہ ہیں:-

(۱) بھرگو
(۲) اَتری (अत्रि)
(۳) وشسشٹ
(۴) وشوکرما
(۵) مئے (मय)
(۶) نارد
(۷) نگن جت (नग्न जित)
(۸) وشالاکش
(۹) پورندر
(۱۰) برہما
(۱۱) کمار
(۱۲) نندلیش
(۱۳) شونک
(۱۴) گرگ
(۱۵) واسدیو
(۱۶) انرودھ
(۱۷) شکر
(۱۸) برہسپتی

ان سب میں وشوکرما کا پایہ بہت بلند ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ پرانوں میں بار بار اس کا ذکر آتا ہے۔ لیکن یہ وہ وشوکرما نہیں ہے جس کے بارے میں بہت سی کہاوتیں مشہور ہیں۔ برہمنوں میں وشوکرما

سے خلاّقِ عالم مراد لی گئی ہے۔ مگر گپت خاندان کے عہدِ حکومت میں اسی نام کا شلپ شاستر کا ایک زبردست مصنّف بھی ہوا ہے جو اپنے وقت کا ایک لاثانی کاریگر تھا۔ غالباً اسی وجہ سے آج تک اُس کی پوجا ہوتی ہے اور ہر سال ہندو کاریگر و صنّاع وشوکرما کی پوجا کے دن اُس کے آگے سرِ نیاز خم کرتے ہیں۔

پرانوں سے پتہ چلتا ہے کہ وشوکرما پربھاس (प्रभास) کا لڑکا تھا اور محلات، باغات، زیورات، تالاب اور کنویں وغیرہ بنانے میں یدِطولیٰ رکھتا تھا۔ علمِ صنعت کی مان سار (मान सार) نامی مشہور کتاب میں لکھا ہے کہ خلاقِ عالم برہما کے چاروں منہ سے چار صنّاع پیدا ہوئے، ان میں سے پہلا وشوکرما تھا جو دیوتاؤں کا کاریگر تھا۔ ناٹیہ شاستر میں درج ہے کہ برہما جی نے وشوکرما سے ایک ناٹیہ شالا یا اسٹیج بنانے کی فرمائش کی اور اُس نے قلیل عرصے میں ایک عالی شان اسٹیج بنا کر کھڑا کر دیا۔ رامائن میں تحریر ہے کہ اسی وشوکرما نے راکششوں کے لئے سونے کی لنکا تعمیر کی تھی، اور اسی نے اگست، ستوریہ اور کبیر کے لئے محلات بنائے تھے نیز برہما جی کے ہوائی جہاز "پشپک" کی تعمیر بھی اسی کے ذہنِ رسا کا نتیجہ تھا۔ اسکند پران کے بیان کے مطابق اس نے ہمالیہ کے اشارہ پر ایک وسیع و عریض میٹنگ ہال تعمیر کیا تھا۔ اور اُسے دیوتاؤں، موروں، گھوڑوں اور ہرنوں کے منہ بولتے مجسموں سے آراستہ کیا تھا۔ اس سے ثابت ہے کہ گپتا عہد سے بہت پہلے اور رامائن کے واقعات ظہور پذیر ہونے سے قبل ایک اور کاریگر بھی ایسا ہوا ہے جس کا نام وشوکرما تھا۔

وشوکرما محض ایک کاریگر یا صنّاع ہی کی حیثیت سے مشہور نہیں، بلکہ علمِ صنعت کے مختلف موضوعات پر بہت سی اہم تصانیف کا مصنّف بھی مانا جاتا ہے۔ اس کی تصنیفات میں سے وشوکرم پرکاش (विश्वकर्म प्रकाश) اور وشوکرمی یم شلپ شاستر (विश्वकर्मीयम शिल्प शास्त्र) یہ دو کتابیں تو آج تک ملتی ہیں۔ وشوکرم پرکاش کے اختتام پر وشوکرما کو ہر فن مولا اور عالم متبحر بتا کر مہاتما کے مقدس خطاب سے یاد کیا گیا ہے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی وشوکرما ہے جس نے گپت راجاؤں کے عہدِ حکومت میں اپنے کمالات کا مظاہرہ کیا ہے۔

شلپ شاستر کے مطالعہ سے اہلِ ہند کی کاریگری کے اعلیٰ معیار پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ ہندی فن کار کے نزدیک دل کی دنیا کو اجاگر کرنا ہی حسن کاری کی بہترین دلیل ہے اور چونکہ دلی جذبات و احساسات بشرے ہی سے ظاہر ہوتے ہیں اس لئے اُس نے ہمیشہ اپنی تخلیق کے چہروں پر گہری نظر رکھنا ضروری سمجھا ہے اس اعتبار سے اس کی کوششیں جتنی حسین و لطیف ہیں اس کی مثال دنیا کے پردے پر ملنی مشکل ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے قدیم صنّاعوں نے خیالات کی بہتی ہوئی رَو کو بڑے حسن و خوبی کے ساتھ رنگ و سنگ کے حلقہ میں مقید کر لیا ہے۔

شکر نیتی (शुक्र नीति) میں لکھا ہے کہ ہر کامیاب مجسمہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ سکونِ قلب اور

نشاط روح کا محرک ہو، اور اس کے نظارہ سے یوگ بھگتی اور خود شناسی کی ترغیب ملتی ہو۔ چنانچہ گپت حکمرانوں کے عہد زریں کے حسین بُت اس نوع کی صناعی کے نادر نمونے ہیں۔

شنکر آچاریہ نے مورتیوں کی تین قسمیں گنائی ہیں :-

(۱) ساتوک یا سکون آفریں (۲) راجسیک یا شکیتہ، اور (۳) تامسیک یا اشتعال انگیز۔

ان میں پہلی قسم کی مورتیاں بہترین اور مقدس مانی گئی ہیں۔

ساتوک مورتیوں کا یوگ مُدرا (دھیان کی حالت) میں ہونا ضروری ہے، ان کی پیٹھ سیدھی ہونی چاہیئے ہاتھوں سے بے خوفی کا اظہار ہوتا ہو اور دیوتا پوجا کرتے دکھائے گئے ہوں۔ اس طرح کی مورتیوں کی خصوصیات یہ ہیں :-

(۱) یوگ مُدرا :- عالمِ محویت اور نگاہیں ناک کی نوک پر جمی ہوئی۔

(۲) سوئستھ :- سیدھی بیٹھی ہوئی

(۳) وَرابھے کر :- نڈرپن کا بردان دینے والے ہاتھ، اور

(۴) دیو بندر : پوجا کرنے والے دیوتاؤں کی موجودگی۔

مورتیوں کی خوبصورتی برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ صناع تناسب اعضا اور شاستروں میں بتائی ہوئی ناپ تول کا خیال رکھے۔ پرتما مان لکشن کے مطابق بھونڈی اور غیر متناسب مورتیاں ممنوع ہیں، اور تباہی و بربادی کا باعث سمجھی جاتی ہیں۔ شکرنیتی میں بھی ایسا ہی مذکور ہے۔ شنکھ، پدم، دھوج، وجر، چکر، سواستک، کنڈال، کلش، چندر، چھتر، شری وتس، انکش، ترشول، جوگی مالا اور وسودھا، دیوتاؤں کے مجسموں کا ضروری جزو ہیں۔ شاستروں کے نزدیک صناع بھی شاعر ہی کا ہم پلہ ہوتا ہے کیونکہ شعر کی روح بھی وہی رس ہے جو صناع کی تخلیق کی جان ہے۔

رباعیاتِ مدہوش

(۱)

فانی جہاں اے عکسِ فانی کیا ہے
شبنم کا فریب درفشانی کیا ہے
پھولوں کی ہنسی کا ثبات و بانی کیا ہے
پانی کا اُبال ہے جوانی کیا ہے

(۲)

شبنم کا ہے گریۂ نوحہ خوانی کیا ہے
فانی ہے جہاں تو یہ کہانی کیا ہے
اس زور سے سر پٹک کے رونے والے
مدہوش تری بھی سرگرانی کیا ہے

مدہوش

خلشِ غم

(از سید مقبول حسین احمد پوری، بی۔ اے، ایل ایل بی)

اے میرے غمِ پنہاں!
اِس دورِ حماقت میں تیری نہیں شنوائی
اِنسان کے دل میں ہے تجھ نے جگہ پائی
اے میرے غمِ پنہاں!

معلوم ہے یہ مجھکو،
ہیں آگ لگانے کی گلشن میں ترے گھاتیں
دن رات سُنا کرتا ہوں شعلہ نوا باتیں
معلوم ہے یہ مجھکو

یہ دل جو سلامت ہے،
یہ آگ ترے گلشن تک راہ نہ پائے گی
ہو کچھ بھی ترے دامن تک آنچ نہ آئے گی
یہ دل جو سلامت ہے

اے میرے حسیں مہماں!
دیکھوں تو کہاں تک ہے یہ شورشِ ویرانی
اشکوں کے تسلسل سے پہونچاؤنگا میں پانی
اے میرے حسیں مہماں!

مشکل ہے جلا پانا
یہ نخل پلا ہے جو آغوشِ محبت میں
مانا کہ بڑی تیزی ہے آگ کی خصلت میں
مشکل ہے جلا پانا

راتوں کو اکیلے میں
چشمک سے ستاروں کی کچھ نشہ جو میں پاؤنگا
یہ درد بھری باتیں تاروں کو سُناؤں گا
راتوں کو اکیلے میں

اِس طرح مرے ہمدم
معلوم خدا کو بھی ہو جائیں گی سب گھاتیں
جب گیت میں تاروں کے مِل جائینگی یہ باتیں

ا ر ا ط، ح ھ ے سہ ھ ا

اُس وقت کہیں گے سب
یا رب یہ نئی گردش، کیسی ہے ستاروں میں
کچھ بوئے خزاں آتی ہے اپنی بہاروں میں
اُس وقت کہیں گے سب

گھبرائیں نہ دل والے
گردش سے ستاروں کی، تقدیر کو بدلوں گا
گر بن نہ پڑا یہ بھی، تدبیر کو بدلوں گا
گھبرائیں نہ دل والے

نزدیک ہیں اب وہ دن
جب تیری جھلک پاؤنگا روح میں انساں کی
اُس وقت کہوں گا میں مشکل تری آساں کی
نزدیک ہیں اب وہ دن

ہمت کی ضرورت ہے،
دیکھوں تو کہاں تک سب شور مچاتے ہیں
عاشق ترے پتھر میں بھی آگ لگاتے ہیں
ہمت کی ضرورت ہے!

غزل

(سید مقبول حسین احمد پوری، بی۔اے)

غم نہیں اب جو نگاہوں میں وہ غمخوار نہیں
ایک حسرت ہے مگر اتنی دل آزار نہیں

دل ہوا شامِ غریبی سے کچھ ایسا مانوس
دُوریِ صبحِ وطن جی کو مرے بار نہیں

یا دِ احباب بھی یہ کہکے ہوئی رخصت بدوش
لیجیئے آپ سے اب کوئی سروکار نہیں

اُن گلوں پر مجھے رہ رہ کے ترس آتا ہے
جن کے پہلو میں تہِ برگ کوئی خار نہیں

ذرّے ذرّے کی زباں پر ہے محبت کا پیام
آپ کا دل ہی مگر محرمِ اسرار نہیں

آبروئے عشق کی پہلی سی کہاں اب اے دوست
ہو گئے سیکڑوں منصور کہیں دار نہیں

جن پہ پڑتی ہے وہی خوب سمجھ سکتے ہیں
جُز خدا کوئی مصیبت میں مددگار نہیں

دوڑ جاتی ہیں لبوں پر متبسم لہریں
کچھ اشارے ہیں کنائے ہیں یہ اشعار نہیں

ہیں کوئی حضرتِ مقبول بھی اُن لوگوں میں
جن میں گفتار ہی گفتار ہے کردار نہیں

نہر سوئز اور نپولین

(از مولانا محمد یعقوب خاں صاحب کلام بی۔اے)

آجکل جبکہ نہر سوئز پر قبضہ کرنے کے لئے محوری طاقتیں خصوصاً اطالیہ بیقرار ہو رہا ہے اور اسی وجہ سے مصر اور یونان میں خون کے دریا بہہ رہے ہیں، یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جو اہمیت اس وقت نہر سوئز کو حاصل ہے، وہی اہمیت اس کے محلِ وقوع کو اُس وقت بھی حاصل تھی جب موجودہ نہر عالمِ وجود میں بھی نہیں آئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فرانس و برطانیہ برسرِ جنگ تھے اور نپولین بوناپارٹ فرانس کا کمانڈر انچیف تھا۔ فرانس کا خاندان شاہی انقلاب سیاسی کی بھینٹ چڑھ چکا تھا۔ اور فرانس کی عنانِ حکومت ڈائرکٹروں کے ایک بورڈ یا مجلس کے ہاتھ میں تھی۔ اس وقت بھی انگلستان کو سمندروں پر پورا اقتدار حاصل تھا اور اس کے خلاف فرانسیسیوں کے جذبات نفرت و حقارت انتہائی جوش پر تھے، اور خود نپولین بوناپارٹ بھی انگلینڈ کی دشمنی میں سب سے آگے تھا۔

جب نپولین سرزمین اطالیہ کو پامال کر کے پیرس واپس آیا تو ڈائرکٹروں نے اُسے اُس فوج کا کمانڈر انچیف مقرر کر دیا جو فرانس کے مغربی سواحل پر انگلینڈ پر حملہ کرنے کی غرض سے جمع کی گئی تھی، لیکن نپولین ڈائرکٹروں سے بھی زیادہ ہوشیار تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ جب تک انگلستان کا سمندروں پر قبضہ ہے اس وقت تک اس کو کسی بیرونی دشمن کا کوئی خوف ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ یہ سوچ سمجھکر اس نے ڈائرکٹروں سے کہا سُنا اور ایک دوسری سپاہ کی کمان حاصل کر لی، جو مصر پر حملہ کر کے انگلستان کو نقصان پہونچانے والی تھی۔

اِن دنوں بھی مصر کو ہندوستان کا مغربی دروازہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ نپولین نے مصر پر حملہ کر کے اس کے ایک حصہ پر قبضہ کر لیا۔ اور دوسرے فرانسیسی جنرل دلیسا ے کو مصر کا بالائی حصّہ زیر کرنے کے لئے مقرر کر دیا لیکن ابھی اس کارنامہ کی تکمیل باقی رہ گئی تھی۔ کیونکہ جب تک خاکنائے سوئز پر قبضہ نہ کر لیا جائے اُس وقت تک بحیرۂ روم و بحیرۂ احمر کے درمیان آمد و رفت کا سلسلہ قائم نہیں ہو سکتا۔ کہتے ہیں کہ نپولین نے اکتوبر ۱۷۹۸ء ہی میں خاکنائے سوئز فتح کر کے بحیرۂ احمر کی بندرگاہوں تک پہونچنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ لیکن چند در چند وجوہ سے اِس کا یہ منصوبہ پُورا نہ ہو سکا

بہرحال کافی غور و خوض کے بعد نپولین نے خاکنائے سوئز پر قبضہ کرنے کا مکمل و مفصل نقشہ مرتب کر لیا اور جنرل بون (Bon) کو سات سو سپاہیوں کا دستہ، پچاس گھوڑے اور دو توپیں دیکر سوئز کی طرف پیش قدمی

کرنے پر مامور کیا۔ چنانچہ جنرل بون ۴۔ دسمبر ۱۷۹۹ء کو قاہرہ سے روانہ ہوکر، ۷۔ دسمبر کو منزلِ مقصود تک پہونچ گیا اور چونکہ اس فرانسیسی دستہ سے کسی نے مزاحمت نہیں کی اس لئے سویز پر آسانی سے قبضہ کرلیا گیا۔

۲۴۔ دسمبر کو خود نپولین بندرگاہ سویز کا معائنہ کرنے روانہ ہوا، اور اُس نے پایۂ تخت قاہرہ اور گردونواح کا چارج جنرل کلیبر کو دیدیا۔ اس سفر میں بہت سے ماہرین اور خاص خاص لوگ اُس کے ساتھ تھے۔ (جن میں ریاضی انجینری، کیمیا، طب وغیرہ ہر فن کے ماہر تھے) ان کے علاوہ بہت سے بااثر ترک بھی نپولین نے اپنے ساتھ لئے اور حفاظت کی غرض سے تین سو سوار دو سو پیادہ رہنما بھی پورے ساز و سامان کے ہمراہ تھا اور بہت سے تجارت پیشہ اور کاروباری لوگ بھی ساتھ تھے۔ سب سے زیادہ عجیب چیز جو اس کاروان کے ساتھ تھی وہ ایک گاڑی تھی جس میں چھ گھوڑے جوتے جاتے تھے، حالانکہ ریگستان میں اس کا کوئی موقعہ نہ تھا۔ اور نہ اس گاڑی سے کام لیا گیا کیونکہ نپولین ہمیشہ گھوڑے پر سوار ہوکر سفر کرتا تھا۔

اس شاندار قافلہ نے پہلی شب برکتہ الحاجی نامی جھیل کے کنارے لیسر کی، اور دوسری رات شجرۃ الحمراء تک پہونچ گئے کہتے ہیں کہ رات بھر اس قدر شدت کی سردی تھی کہ کسی کی پلک تک نہ جھپک سکی۔ بہت سے لوگوں نے شجرۃ الحمرا (سُرخ درخت) کو کاٹ کر جلانا چاہا، لیکن نپولین نے منع کردیا، کیونکہ اس علاقہ میں اس کے سوا دُور دُور تک کوئی درخت نہیں تھا۔ اور یہ درخت مسافروں کی رہنمائی کا کام دیتا تھا۔ اس جگہ بہت سے اونٹوں اور گھوڑوں کی ہڈیوں کے ڈھانچے بھی پڑے تھے۔ بعض ستم ظریفوں نے انھیں جمع کرکے آگ لگادی۔ لیکن جب ہڈیوں کے جلنے کی بُو سے دماغ پھٹنے لگا تو اپنی حرکت پر شرمندہ ہوئے اور آگ بجھا کر خیموں میں جا لیٹے۔ اور سردی میں کروٹیں لے لے کر رات کاٹی۔

ایک تاجر کو جو اس قافلہ میں تھا یہ بات دیکھکر سخت حیرت ہوئی کہ نپولین جو اتنا بڑا آدمی اور اتنا مشہور جنرل ہے، اپنے ساتھ صرف تین خدمتگار لایا ہے۔ جب اس شخص سے ضبط نہ ہوسکا تو اس نے نپولین کے ترجمان محمد آیاس سے کہا کہ "جناب! میں ایک معمولی سا دُکاندار ہوں مگر میرے ساتھ گیارہ نوکر ہیں، لیکن نپولین بوناپارٹ جو اتنا بڑا جنرل اور تمام مُلک کا مالک ہے صرف تین نوکر ساتھ رکھتا ہے۔ واقعی مصر کے سلاطین اتنی سادہ اور سخت زندگی بسر نہیں کرسکتے تھے۔ اور اسی وجہ سے وہ مغلوب ہوگئے"۔

دوسرے روز یعنی ۲۸۔ دسمبر کو یہ قافلہ صبح کو تین بجے بیدار رہا، نپولین بھی ابھی تک قافلہ کے ساتھ ساتھ سفر کرتا رہا تھا، لیکن وہ سویز پہونچنے کے لئے حد درجہ بیقرار ہورہا تھا، چنانچہ وہ چند رہناؤں کو ساتھ لیکر یلغار کرتا ہوا چل کھڑا ہوا۔ اور مارا مارا اُسی روز شام کو سویز پہونچ گیا، باقی قافلہ حسب معمول خراماں خراماں اگلے روز سویز پہونچا۔

نپولین کی عادت تھی کہ وہ کبھی آرام کی پروا نہ کرتا تھا، بلکہ ہمیشہ نئی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا، چنانچہ اگلے روز یعنی ۲۹۔ دسمبر کو ان فرانسیسی جہازوں کے کپتانوں کو جو اس وقت سوئز میں لنگر انداز تھے اور دوسرے معززین کو طلب کر کے ان سے تمام ضروری حالات معلوم کر لیئے اور بندر سوئز کی تجارتی اہمیت سے بھی بخوبی واقفیت حاصل کر لی۔

نپولین کے قیام مصر کے متعلق ایک عرب شیخ عبدالرحمٰن نامی نے بہت سے واقعات قلمبند کئے ہیں وہ نپولین اور اُس کے سپاہیوں کی سادہ اور سخت زندگی دیکھکر انگشت بدنداں تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنے روزنامچہ میں لکھا ہے کہ نپولین اپنے ساتھ کاغذ میں لپیٹ کر صرف تین چوزوں کے کباب لے گیا ہے، نہ اس شخص کے پاس کوئی خیمہ ہے نہ باورچی اور نہ بستر۔ اس کا ہر سپاہی اپنے ساتھ نوکِ سنگین پر صرف ایک ڈبل روٹی رکھتا ہے اور اسی میں سے ایک ٹکڑا کاٹ کر روز کھالیتا ہے۔ ان کے گلوں میں چھوٹی چھوٹی چرمی چھاگلیں پڑی رہتی ہیں، اور انھیں میں سے یہ لوگ پانی پیتے رہتے ہیں" بہرحال یہ واقعہ ہے کہ نپولین اور اس کے سپاہی بڑی سخت اور سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔

۲۶۔ دسمبر کا دن مقام "بیرالموسیٰ" کی زیارت کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ یہ جزیرہ نمائے سینا کی سڑک پر سوئز سے تین میل کے فاصلہ پر پانچ کنوئیں ہیں جو حضرت موسیٰ سے منسوب ہیں۔ اس سفر میں نپولین کے ساتھ اس کے تمام جنرل اور دوسرے فوجی افسران بھی تھے اور رسالہ کا بھی بہت بڑا حصہ ہمراہ تھا۔ اثنائے سفر میں بحیرۂ احمر کی ایک کھاڑی پڑتی تھی جسے کشتیوں میں پار کر کے دو بجے دن کو یہ لوگ منزل مقصود پر پہونچے۔ موسیٰ کے کنوؤں کی زیارت کرنے کے بعد بیر نباہ کی بھی زیارت کی گئی اور یہ پارٹی رات کو واپس آئی۔ واپسی کے وقت جوار بھاٹے کے اُترتے ہوئے پانی کی وجہ سے سخت پریشانی ہوئی، اور اسی کے ساتھ بعض لوگ راستہ بھول گئے اور ایک جگہ ایک دلدل میں پھنس گئے۔ جنرل کفاریلی کی جو اس فوجی دستہ کا کمان افسر تھا ایک ٹانگ نقلی تھی، کیونکہ اس کی اصلی ٹانگ دریائے رائن کی ایک جنگ کے نذر ہو گئی تھی۔ جب جنرل مذکور کا گھوڑا دلدل میں پھنس گیا تو وہ دھنستا چلا گیا اور قریب تھا کہ خود جنرل کفاریلی بھی دلدل میں پھنس جائے کہ اتنے میں ایک بہادر سپاہی نے اپنی جان پر کھیل کر جنرل کو موت کے منھ سے نکال لیا۔

دوسرے روز نپولین نے کاروباری لوگوں اور تاجروں سے صلاح مشورہ کیا۔ قلعہ بندیوں کی داغ بیل کے نقشوں کا بھی معائنہ کیا جو بندرگاہ سوئز کی حفاظت کے لئے تعمیر کیا جانا تجویز ہوئی تھیں۔

۳۰۔ دسمبر کو اتوار کے روز یہ مہم سوئز سے واپس ہوئی اور اُسی روز رات کو عادشردہ کے پڑاؤ تک پہونچ گئی لیکن سوئز سے واپس ہونے کے پہلے نپولین نے اپنے بعض جرنیلوں، رہنماؤں اور پروفیسروں کی

مدد سے قدیم نہر سوئز کا سُراغ لگانے کی کوشش کی۔ یہ قدیم نہر بحیرۂ احمر اور بحیرۂ روم کے درمیان نہیں تھی جیسے کہ اب ہے۔ بلکہ بحیرۂ احمر سے دریائے نیل کو ملاتی تھی۔ مثل مشہور ہے کہ "جو ینده یابنده" اس بارے میں نپولین کی کوشش کامیاب ہوئی اور اس کو پُرانی نہر کا سراغ مل گیا جو اب ریت سے اٹی ہوئی خشک پڑی تھی۔ چار میل تک انھوں نے اس قدیم نہر کو مٹی ہوئی سی حالت میں دیکھا، لیکن جوں جوں آگے بڑھتے گئے نہر کی حالت کسی قدر درست نظر آنے لگی، لیکن چار پانچ میل اور آگے بڑھے تو نہر کے نشانات بالکل غائب ہو گئے نپولین کو اس قدیم نہر سے اس قدر دلچسپی ہوگئی کہ وہ اس کے کھوج میں بڑھتا چلا گیا اور اپنے ہمراہیوں سے بھی چھوٹ گیا۔ اور صرف چند رفیقوں کے ساتھ ایک لامعلوم مقام میں کھڑا رہ گیا۔ لیکن تھوڑی ہی سی جدوجہد کے بعد اُسے راستہ مل گیا اور وہ اپنی جماعت کے ساتھ ۳۰۔ دسمبر کی شام کو خیر و عافیت کے ساتھ عادشرود پہونچ گیا۔ یہاں پہونچکر ہم کے دو حصّے ہوگئے، جن میں سے ایک سیدھا قاہرہ کی جانب اور دوسرا جس کے ساتھ خود نپولین تھا بلبیس کی طرف روانہ ہوا۔ ۳۱۔ دسمبر کی رات اثنا راہ میں بسر کی، اور یکم جنوری کی شب کو وہ بلبیس پہونچ گیا۔ جہاں جنرل رینئر (Rayner) مع اپنی فوج کے پہلے سے موجود تھا۔ لوروز کے دن تمام وقت نپولین نے قلعہ بندیوں کی دیکھ بھال میں صرف کیا جن کی تعمیر شروع ہوگئی تھی۔ فوج کا جائزہ لیا اور گرد و نواح کے مقامات کی بھی جانچ پڑتال کی اور اس کے بعد ۳۔ جنوری کو بلبیس سے روانہ ہو کر وہ ۶۔ جنوری کو پھر قاہرہ پہونچ گیا۔ یہاں سے اُس نے پروفیسروں اور انجنیروں کی ایک پارٹی اس غرض سے بھیجنے کا ارادہ کیا کہ جس قدیم نہر سوئز کا وہ سرسری معائنہ کرآیا ہے، اُس کی پوری طور پر پیمائش کریں اور یہ بھی دیکھیں کہ بحیرۂ روم اور بحیرۂ احمر کے پانی کی سطحوں میں کتنا فرق ہے۔

موسیو لیپیری اور موسیو جینیس (M. Lepere & M. Saint Genis) نامی دو مشہور فرانسیسی انجنیر اپنے ساتھ ایک فوجی دستہ لیکر جس کی کمان جنرل جیونو (Junot) کے ہاتھ میں تھی، قاہرہ سے روانہ ہوئے اور ۱۵۔ جنوری ۱۷۹۹ء کو سوئز پہونچ گئے۔ ضروری انتظامات کے بعد انھوں نے ۱۳۔ جنوری سے نہر سوئز کا سراغ لگانا شروع کر دیا اور تلاش و تجسس کے بعد قدیم نہر کا سراغ لگا لیا۔ کنارے کنارے پندرہ بیس میل تک چل کر نہر کی گہرائی چار میٹر سے سات میٹر تک (میٹر = ۳۹ء۳۷ انچ) اور چوڑائی پچیس سے تیس میٹر تک پائی گئی۔ لیکن کھاری جھیلوں تک پہونچکر نہر کے سب نشانات غائب ہو گئے تھے، اور جھیلوں کے اس پار اس کا کہیں نام و نشان بھی باقی نہ تھا۔ اس مہم میں سب سے بڑی دقت جو پیش آئی یہ تھی کہ لوگوں کو پینے کا پانی نہیں ملا۔ چنانچہ جب میٹھے پانی کا ذخیرہ ختم ہو گیا تو مہم کو مجبوراً واپس آنا پڑا۔ اثنا راہ میں عرب قزاقوں نے

لہ نہر سوئز کے راستہ میں چار جھیلیں پڑتی ہیں، تمساح، منزلہ اور دو کھاری جھیلیں جنھیں انگریزی میں Great & little Bitter lakes کہتے ہیں۔

ان پر چھاپہ مارا، مگر اس کا مقابلہ کیا گیا۔ اسی طرح یہ لوگ لڑتے بھڑتے ۱۷۔ فروری ۱۷۹۹ء کو قاہرہ پہونچے، اس کے بعد سروے کی تکمیل کے لئے مہم بھیجنے کا پھر ارادہ ہوا، لیکن اسی اثنا میں ملک شام کی مہم پیش آ گئی۔ جس کی وجہ سے یہ ارادہ ترک کرنا پڑا۔

نپولین کے بعد ستمبر ۱۷۹۹ء میں جنرل کلیبر نے تیسری اور نومبر میں چوتھی مہم بھیجی۔ موسیو لیپیرے انجینئر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ ۲۶۔ ستمبر کو قاہرہ سے روانہ ہوکر مصروف تحقیقات ہوا، اور اس نے معلوم کیا کہ بحیرۂ احمر کی سطح بحیرۂ روم کی سطح سے دس میٹر کے قریب بلند ہے۔ ۱۸۴۷ء میں موسیو تالابوت اور ۱۸۵۴ء میں موسیو فرڈیننڈ نے تحقیقات کی۔ ۱۸۵۹ء میں نہر کی کھدائی شروع ہوئی اور ۱۸۶۹ء میں موجودہ نہر سوئز تیار ہو گئی۔

گیتانجلی

(از پنڈت اندجیت شرما، ماچھرہ ضلع میرٹھ)

دی مجھے تو نے حیاتِ جاوداں　　تھی اسی میں مستتر مرضی تری

جسمِ خاکی کو بنا کر بار بار　　بخشتا رہتا ہے تازہ زندگی

گھومتا ہے وادی و کہسار میں　　ہاتھ میں چھوٹی سی لیکر بانسری

گونجتی ہے اس کے نغموں سے فضا　　دل لبھاتی ہیں نوائیں رس بھری

تیرے چھونے سے ملا لطفِ دوام　　قلب کو حاصل ہے روحانی خوشی

ہے مسرت خیز جذبہ کس قدر　　پا نہیں سکتا خوشی کی حد کوئی

نعمتیں ہیں تیری بےحد بےشمار　　بارشیں ہوتی ہیں جن کی ہر گھڑی

سیکڑوں پھر بھی گذر جاتے ہیں سال　　نعمتوں میں آ نہیں سکتی کمی

ہے مگر ان کے لئے خالی جگہ

ایک خواب

(از چودھری پربھان شنکر، ایم۔ اے۔ ایل ایل، بی)

کل جا رہا تھا خواب میں اُس سرزمین پر — آزادیوں کے حسن کی جو جلوہ گاہ تھی
میں انتہائے شوق میں مصروفِ سیر تھا — اتنے میں اِک فقیر نے گھبرا کے آہ کی

آواز اس طرح سے لبوں سے جدا ہوئی — دیتی ہوں جیسے خون رگیں اضطراب کی
اٹھتی ہے جیسے موج چٹانوں کو توڑ کر — جیسے تڑپ کے روح چلے انقلاب کی

مڑ کر نظر جو کی تو نہ مجھ سے رہا گیا — دامن فقیر کا درم و زر سے بھر دیا
لیکن یہ بات اُس کو گوارا نہ ہو سکی — کہنے لگا کہ "آپ کے احساں کا شکریا"

آزاد سرزمین کے فقیروں کو بھی جنھیں — ہر صبح و شام بھیک کے ٹکڑوں سے کام ہے
دکھ درد سہہ کے جان کا دینا بُرا نہیں — لیکن غلام قوم کا پیسہ حرام ہے

رُباعیات

جب درد سے ہمکنار ہو جاتا ہے — انساں ایماں شعار ہو جاتا ہے
آنکھیں کھلتی بھی ہیں تو ظالم اُس دن — جب تیر جگر کے پار ہو جاتا ہے

ایضاً

بد عہد کا اعتبار کرنا ہوگا — اس جبر کو اختیار کرنا ہوگا
مانا کہ حیات و موت یکساں ہیں مگر — کچھ دن ابھی انتظار کرنا ہوگا

سرفراز محل

(از شیخ تصدق حسین لکھنوی، بی۔ اے، ایل ایل۔ بی)

حسینی خانم نام، ملیح آباد کی رہنے والی تھیں، چہرہ کتابی رنگ سانولا نمکین۔ آنکھیں رسیلی اور بڑی بڑی، قد لانبا، جسم گداز اور ہاتھ پیر گول تھے۔ غازی الدین حیدر شاہ اودھ کی نظروں میں سما گئیں انھوں نے موصوفہ سے نکاح کر کے سرفراز محل کا خطاب دیکر عزت افزائی فرمائی۔

سرفراز محل ہنگامۂ غدر تک پنج محلہ واقع مچھی بھون میں رہتی تھیں، جب ۱۸۵۸ء میں مچھی بھون پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا تو شہر میں کرایہ کا مکان لیکر سکونت اختیار کی۔ اس کے بعد اکبری دروازہ کے قریب محمود نگر کی چڑھائی پر ایک رفیع الشان مکان بنوا کر وہیں بفراغت زندگی بسر کرنے لگیں۔

اُن کے کوئی اولاد نہ ہوئی، ۲۸۔ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو تقریبًا ستر برس کی عمر میں اپنے مکان مسکونہ میں انتقال کیا امام باڑہ نجف اشرف میں دفن ہوئیں، میر مونس نے چہلم کی مجلس پڑھی

امام باڑہ شاہ نجف میں داخل ہوتے وقت اُن کی قبر بائیں جانب گوشہ میں ملتی ہے جس پر لکڑی کا کٹہرا لگا ہوا ہے کہتے ہیں کہ اُن کے انتقال پر بعض لوگ اُن کے قیمتی جواہر اور دیگر بیش قیمت اشیا، کھانے کے بہانہ سے خوانوں میں ڈھو کر لے گئے۔

سرفراز محل کا وثیقہ شاہ غازی الدین حیدر نے بروئے عہد نامہ ۱۷۔ اگست ۱۸۲۶ء ایک ہزار روپیہ ماہوار مقرر کیا تھا، اُن کے ملازمین ومتوسلین کے لئے بھی چھ سو انتالیس (۶۳۹) روپیہ ماہوار وثیقہ کے علاوہ مقرر کئے تھے۔ وثیقہ کی ایک تہائی تین سو تینتیس روپیہ پانچ آنہ چار پائی (۳۳۳/۵/۴) کے لئے موصوفہ کو اختیار دیا تھا کہ جس کے حق میں چاہیں منتقل کر دیں۔ مگر اُن کی وفات پر باقی ماندہ دو ثلث میں سے نصف کربلائے معلّی اور نجف اشرف بھیجا جائیگا جس کا ثواب بادشاہ کو ہوگا۔ چنانچہ بتاریخ ۴۔ اپریل ۱۸۶۶ء بیگم نے بابت ایک ثلث ایک وصیت نامہ تحریر کر کے چیف کمشنر مسٹر آر۔ ایچ۔ ڈیوس (R.H.Davis) کو برائے تصدیق بھیج دیا۔ جس کی رُو سے صرف تئیس روپیہ پانچ آنہ چار پائی (۲۳/۵/۴) اپنی قبر کے مصارف کے لئے رکھے، باقی رقم وثیقہ مختلف اشخاص کے نام جاری کرنے کی ہدایت تھی جن میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے رقم وثیقہ بالمعاوضہ خریدی تھی۔ اِس وصیت نامہ میں جو بارہ (۱۲) اشخاص وثیقہ یا بندگان نامزد کئے گئے تھے اُن میں سے دو (۲) لاولد

وفات پاگئے لہذا بتاریخ ۱۴۔ جولائی ۱۸۶۷ء متوفیان کے بجائے دیگر اشخاص کے نام درج کرائے گئے، اور محمد امین خاں متولی کے دس روپیہ ماہوار اور ہادی علی خاں متولی کے پندرہ روپیہ ماہوار بموجب وصیت نامہ مقرر کئے۔ یہ دونوں متولیان حنفی المذہب تھے۔ بیگم بھی ابتدا میں سُنی المذہب تھیں مگر بعد میں بادشاہ کی صحبت میں امامیہ مذہب اختیار کر لیا تھا۔ سرفراز محل کے ایک بھائی نواب علی محمد خاں عرف لعل خاں تھے، جن کے تین بیٹے امجد علی خاں، اکبر علی خاں اور احمد علی خاں تھے۔ اکبر علی خاں کے بیٹے افسر علی خاں تھے جنھوں نے تھوڑا عرصہ گزرا انتقال کیا۔

بعد رحلت سرفراز محل جن اشخاص کے نام وثیقہ جاری ہوا اُن میں سے خاص خاص آدمیوں کے اسماء درج ذیل ہیں :-

منشی کالکا پرشاد خریدار وثیقہ ایکسو پانچ ۱۰۵ روپیہ　　داروغہ عاشق عسکری خریدار وثیقہ سینتالیس ۴۷ روپیہ

امجد علی خاں بھتیجہ سرفراز محل اکیس ۲۱ روپیہ　　اکبر علی خاں بھتیجہ سرفراز محل سترہ ۱۷ روپیہ ماہوار

میاں شوکت علی خاں ناظر ڈیوڑھی خود تیس ۳۰ روپیہ ماہوار

اس وثیقہ کی تقسیم میجر ہارس فورڈ (Major Horsford) افسر کچہری وثیقہ نے کی۔ املاک سرفراز محل واقع محمود نگر لکھنؤ کھُد کر بک چکی ہے، اب صرف تھوڑا سا حصّہ باقی رہ گیا ہے۔

سرفراز محل (ثانی)

یہ بیگم کسی بادشاہ کی بیوی نہ تھیں مگر چونکہ یہ خطاب بھی ایک تاجدار اودھ کا بخشا ہوا ہے اس لئے ان بیگم کا تذکرہ بھی مختصر الفاظ میں کیا جاتا ہے۔

بعد انتقال غازی الدین حیدر اُن کے فرزند دلبند شاہ نصیر الدین حیدر نے یہ خطاب اپنے وزیر اعظم نواب روشن الدولہ کی ایک بیوی کو دیا تھا۔ شروع زمانۂ وزارت میں شاہ موصوف روشن الدولہ پر بہت مہربان تھے، اکثر اُن کی کوٹھی میں تشریف لے جاتے تھے۔ روشن الدولہ باہر کی نشست اُن کے خلاف مزاج سمجھکر اُن کو زنانخانے میں لے جاتے تھے جہاں اربابِ نشاط کی صحبت گرم رہتی تھی اور روشن الدولہ کی بیوی بھی ہنسی مذاق، دلچسپ قصّوں اور گرما گرم فقروں سے بادشاہ کے دل کو بہلائے رہتی تھیں۔ ان مسماۃ کا نام حسینی اور دوسرا نام محبوبن تھا۔ پہلے طوائف کا پیشہ کرتی تھیں مگر روشن الدولہ نے ان کو گھر بٹھا لیا تھا۔ روشن الدولہ کے بیٹے مرزا محمد حسن خاں انھیں بی حسینی کے بطن سے تھے۔ بادشاہ نے خوش ہو کر بی حسینی کو سرفراز محل کا خطاب عطا فرمایا۔ اور اُن کے پسر محمد حسن خاں کو لشکر سلطانی کا جرنیل مقرر کیا۔ جرنیل کی شادی نواب معتمد الدولہ آغا میر کی کدو کاوش سے شہزادہ سلیمان شکوہ کی ایک بیٹی سے ہوئی، جن کی ایک دختر نواب،

سلطان رقیہ بیگم شاہ نصیر الدین حیدر کو پیشتر ہی سے منسوب تھیں، اس طور پر جرنیل محمد حسن خاں بادشاہ کے ہم زلف ہوگئے۔ گو شہزادہ سلیمان شکوہ کو یہ نسبت کسی طرح منظور نہ تھی مگر معتمد الدولہ کے دبدبہ اور جبروت سے بے بس ہوگئے۔ شروع زمانۂ حکومت حضرت محمد علی شاہ میں روشن الدولہ معزول ہوئے، اور اُن کی کل املاک محاسبہ میں ضبط کی گئی، جس پر کئی لاکھ روپیہ عملۂ شاہی کی نذر کرکے کانپور چلے گئے وہاں جرنیل باپ سے دس لاکھ روپے لیکر اُن سے جُدا ہوگئے۔ روشن الدولہ تو گھر سے خرچ کرتے کرتے بالکل تہیدست ہوگئے اور آخر میں تنگی ترشی سے زندگی بسر کرکے دنیا سے رخصت ہوگئے مگر جرنیل بہت چلن سے زندگی بسر کرتے رہے۔

انوارِ لطیف

(حضرت لطیف انور)

کسی کی ناشنوائی کا کیا ملال کہوں
فریب خوردۂ تاثیر نالۂ موزوں

خفا نہ ہو جو ترے غم کی داد دے نہ سکوں
شریکِ دل ہے بہر رنگ زندگی کا خوں

نہ مسکرا مرے دامانِ چاک پر اتنا
نہیں ہے فصلِ گل و لالہ تک نمودِ جنوں

وہی ہے کشمکشِ حُسن و عشق کا عالم
نہ کامیاب ہوا میری آرزو کا فسوں

اگرچہ شغلِ محبت ہے رنگ آمیزی
مرے خیال میں ہستی ہے ایک نقشِ زبوں

نگاہیں جم کے نہ رہ جائیں نیستی کی طرف
پیامِ زحمتِ ہستی ہوئی تلاشِ سکوں

خلوص ہی نہ ہو بُنیاد آدمیت کی
میں سوچتا ہوں زمانے میں ہو سکے گا یُوں

قریب ختم ہو بختی ہے راہِ بے منزل
دلِ فسردہ کو اندیشۂ ملال ہے کیوں؟

بُرا نہ مان تقاضائے ذوق ہے ساقی
کہ میکدے میں ابھی اور تشنہ کام رہوں

کسی نے داد نہ دی میرے ظرف کی انور
مگر یہ طعن، کہ بیگانۂ محبت ہوں!

سکونِ زیست

(از مسٹر یوسف ظفر۔ لاہور)

مذاقِ زیست سے عاری نہیں مری ہستی — غمِ جہاں میں بھی دل کا خیال رکھتا ہوں
میں شوخ و سرد ہوں سرما کی دوپہر کی طرح — غرورِ عشق و دلِ پائمال رکھتا ہوں
کیئے ہوئے ہوں محبّت کے ہاتھ پر بیعت — نظر میں دوست کا حسن و جمال رکھتا ہوں
سُنا بھی سکتا ہوں شعر و شراب کی باتیں — میں جانتا ہوں سخن کی مجال رکھتا ہوں

مذاقِ زیست کے باوصف بھی گدا ہوں میں
سکونِ زیست کو دستِ سوال رکھتا ہوں

سکونِ زیست میسّر ہو کس طرح مجھ کو — نہ جانے کیوں مری ہر شے بدلتی جاتی ہے
جو کل تلک تھی خیالوں کے جام و مینا میں — وہ آگ اب مرے سینے میں ڈھلتی جاتی ہے
بھلا رہا ہوں کسی کے فریبِ رنگیں کو — سمجھ رہا ہوں کہ حسرت نکلتی جاتی ہے
کمال ہے کہ بعنوانِ دشمنِ الفت — خود اپنے غم سے طبیعت بہلتی جاتی ہے

ستاتی جاتی ہے مجھکو اُدھر تری الفت
اِدھر حیات مری ہاتھ ملتی جاتی ہے

درست ہے کہ ترا اس میں کچھ قصور نہیں — عجب ہے کیا کہ تجھے میرا غم ستاتا ہو
تمام رات جھلکتے ہوں آنکھ میں آنسو — تمام رات تصوّر دیئے جلاتا ہو
عجب نہیں ہے کہ دیتا ہو جب کوئی دستک — معاً خیال مرا تیرے دل میں آتا ہو
سحر کو دیکھتی ہو جب اُٹھا کے آئینہ — تو تیرے سامنے اِک دوست مسکراتا ہو

مگر نہ جانے تجھے یہ خیال ہے کہ نہیں
کہ وہ بھی یونہی نہ فرقت کے دُکھ اُٹھاتا ہو

میں اب نہ آؤنگا در پر پکارنے تجھکو — مرے ندیم عبث میرا انتظار نہ کر
مٹا دے حرفِ غلط کی طرح مجھے دل سے — مرے خیال سے تو دل کو سوگوار نہ کر

سُنا نہ رات کو اپنا فسانۂ اُلفت ۔۔۔ سکوتِ شب کی نگاہوں میں مجھ کو خوار نہ کر
یہ جان میں ہی نہیں تیرے عشق کے قابل ۔۔۔ مرے گناہِ محبت کا اعتبار نہ کر

خزاں نصیب ہوں رہنے دے میری بجوئی
بہار تو ہی تو ہے، تو غمِ بہار نہ کر

تجھے بھلانے کو فطرت میں کھو گیا ہوں میں ۔۔۔ کسی طرح نہ ہو دل کو سکوں تو کیا حاصل
نظر میں ہونگے ستارے، نہ کہکشاں ہوگی ۔۔۔ اُداس چاند کو دیکھا کروں تو کیا حاصل
نہ دے شفق مجھے غم میں صلاحِ مایوسی ۔۔۔ کروں میں اُس کی طرح دل کا خوں تو کیا حاصل
زمانہ میری محبت پہ مسکراتا ہے ۔۔۔ میں دل کا راز اگر کھول دوں تو کیا حاصل

تو ہی بتا کہ یہ کب تک رہے گی بیتابی
تمام عمر جو بیکل رہوں تو کیا حاصل

سیرِ گل

(از شایق ہندو)

وہ پھر رہے ہیں باغ میں مثالِ موجِ رنگ و بو ۔۔۔ جلو میں غمزہ و ادا کا قافلہ لئے ہوئے
پیامِ جنگ دے رہی ہیں شوخیاں بہار کو ۔۔۔ گلِ ادا ہیں دعوتِ مقابلہ لئے ہوئے
قدم قدم پہ نقشِ پا نے جڑ دیئے ہیں آئینے ۔۔۔ روش روش ہے کہکشاں کا سلسلہ لئے ہوئے
نظر نظر ہے دے رہی ہزار درسِ معرفت ۔۔۔ ادا ادا ہے جنتِ مطالعہ لئے ہوئے
تمام گل ہیں منتظر نگاہِ انتخاب کے ۔۔۔ دلوں میں قربتِ گلو کا ولولہ لئے ہوئے

چمن کو لوٹنے چلے ہیں اس پہ یہ دلاوری
حنائے کف ہے ساتھ ساتھ مشعلہ لئے ہوئے



مَیں کیا ہوں؟

(از مولانا محمد یعقوب خاں کلام، بی۔ اے)

مَیں ازل کی ابتدا ہوں، مَیں ابد کی انتہا ہوں — جو خودی ہوئی تو بندہ، نہ خودی ہوئی خدا ہوں
مَیں دعاؤں کا اثر ہوں، میں دلوں کا مُدعا ہوں — جو غرض سے بے غرض ہوں، تو خدا ہی جانے کیا ہوں
مرا قطرہ لاکھ دریا، مرا ذرہ لاکھ صحرا — مرا قلب لاکھ دُنیا، میں وہ شانِ کبریا ہوں
مرا سر ہے میری مسجد، میرا دل ہے میرا مندر — مرے سجدوں میں خدا ہے، مَیں بُتِ خدا نما ہوں
یہ زمین و آسماں ہیں، میری پستی و بلندی — کبھی عرش پر مکیں ہوں، کبھی خاک پر گرا ہوں
کبھی خلقِ مصطفےٰ ہوں، کبھی زورِ مرتضےٰ ہوں — کبھی خاک و خوں میں کھیلوں، تو شہیدِ کربلا ہوں

ہے کلام جب سے حاصل مجھے بیعتِ مغانہ
کرے خم طواف جس کا میں وہ رندِ پارسا ہوں

۲

اگر داغِ دل کی تجلّی دکھادوں — نئے سے نیا طورِ سینا بنا دُوں
اگر مَیں کبھی آپ بیتی سُنا دوں — زمانے کو ماضی کے قصے بھلا دوں
اُٹھیں خاک سے میری منصور لاکھوں — جو تجھ پر فدا ہو کے خود کو مٹا دوں
علاجِ تپِ ہجر کر دے جو کوئی — دُعادوں، دُعادوں، میں دل سے دُعادوں
ذرا ناز سے آپ دو گام ہٹ لیں — ابھی چٹکیوں میں قیامت بلا دوں
جوانی سے اُلجھا ہے بچپن کسی کا — چل اے دل تجھے بھی تماشا دکھادوں

اشاروں میں بولی وہ چشمِ سخن گو
کلام آج کیا کوئی ساغر پلا دوں

تصحیح زمانہ جنوری ۱۹۲۱ء میں صفحہ ۵۳ پر مدہوش صاحب کی رُباعی غلط چھپ گئی ہے، اصل رباعی درج ذیل ہے ناظرین درست کرلیں:-

بیٹھے ہو اُداس اس اہل ظلمت صد حیف — ہوتے ہو نراس اہل ظلمت صد حیف
ظلمات کے آگے آبِ حیواں بھی ہے — ہو عاصیِ یاس اے اہل ظلمت صد حیف

تنقیدِ کتب

پیامِ شوق

نظامی پریس بدایوں نے پنڈت جگموہن ناتھ رینہ شوق پنشنر ڈپٹی کلکٹر کی غزلوں کا ایک دلپذیر مجموعہ شائع کیا ہے شروع میں حضرت نظامی بدایونی کا دیباچہ، پنڈت منوہر لال صاحب زتشی، ڈاکٹر سید محمد حفیظ اور پنڈت امرناتھ جھا وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی کی تنقیدیں بھی شامل ہیں۔ جن میں جناب شوق کے محاسنِ کلام پر مفصل بحث کی گئی ہے۔

جناب شوق کو حضرت امیر مینائی کی شاگردی کا فخر حاصل ہے، گو امیر کی وفات کے بعد آپ نے دیگر حضرات سے بھی مشورۂ سخن کیا۔ لیکن آپ نے زیادہ تر اثر امیر مینائی اور منیر شکوہ آبادی کا قبول کیا۔ بہر حال یہ مجموعۂ کلام نصف صدی سے زیادہ عرصہ کی مشقِ سخن کا نتیجہ ہے جس میں ہر قسم کے خوش بو اور رنگین گل و غنچے نظر آتے ہیں رکیک اور مبتذل باتوں سے شوق کا کلام بالکل پاک ہے۔ جناب شوق کی زبان بھی شستہ اور ٹکسالی ہے۔ پنڈت جی نے اصولِ فن کو بھی کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔

جہاں تک ہم نے جناب شوق کے اس مجموعۂ کلام کو نقادانہ نظر سے دیکھا ہے ہمیں جذبات عالیہ کی فراوانی نظر آئی، دو چار شعر ملاحظہ ہوں:-

ایک جویائے حق کے نزدیک دنیا کا ذرہ ذرہ معشوق حقیقی کا جلوہ گاہِ ناز ہوتا ہے، چنانچہ جناب شوق فرماتے ہیں:- کسی کا جلوہ گہِ ناز جب نظر آیا سرِ نیاز رہیں پر جھکا دیا میں نے

عاشق کا دل کبھی امیدوں اور تمناؤں کا گہوارہ ہوتا ہے اور کبھی یاس و حرماں کی جولانگاہ۔ شوق نے اسی بات کو کس قدر مؤثر پیرایہ میں بیان کیا ہے:-

یاس و حرمان و تمنا، حسرت و رنج و الم شوق سے سنیئے کہ سب کچھ دل کے افسانہ میں ہے

کعبہ و بتخانہ، سمجھنے والوں کے نزدیک اینٹ پتھر کے گھروں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے، یہی سمجھ کر شوق نے کہا ہے:- رہا جب مدتوں دیر و حرم میں سمجھ آئی کہ بہکایا گیا ہوں

اصلی چیز دھیان گیان ہے، اور گیان دھیان کا میخانہ وہ میخانہ ہے جس کے ایک ہی جرعہ میں سرشار ہو کر

انسان اس اعلیٰ مقام پر پہونچ جاتا ہے جہاں بس وہی وہ ہوتا ہے اور کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ یا جلوۂ حقیقت شوق کا شعر سنیئے :-

کہاں سے عوق، شوق پیدا ہوا ہے کہاں مجھکو کجا بتخانہ و کعبہ! کجا میخانہ و ساقی

اس شعر میں دیکھئے "تصویر" کا لفظ کس حسین پہلو سے استعمال کیا گیا ہے :-

وہ کون سی صورت تھی، کیا تجھ سے کہیں اے دل جس رخ سے اسے دیکھا تصویر نظر آئی

یہ شعر کتنا پُر از سوز و گداز ہے :-

علاجِ دردِ جگر چارہ ساز رہنے دے ذرا اسی میں ہے سوز و گداز رہنے دے

میر تقی میر کے رنگ میں کیا پیارا شعر کہا ہے :-

رفتہ رفتہ تا درِ جاناں بیٹھتے اُٹھتے یوں پہونچے ٹھوکریں کھاتے گرتے پڑتے، صبح سے تا شام چلے

بعض اشعار کی برجستگی ملاحظہ ہو :-

بتکدہ چھوڑنے والے تو نہ تھے خیر ملتی ہے تو جنت ہی سہی

جاتے کعبہ میں بت پرستی کو یہ بھی اک فرض تھا ادا کرتے

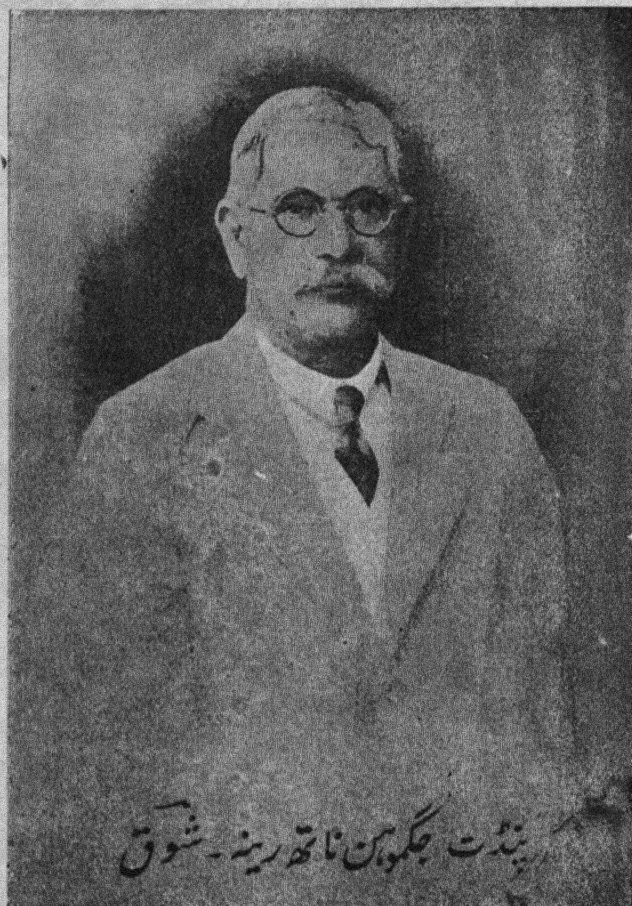
اس دیوان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر غزل کے ساتھ اس کا سنِ تصنیف بھی درج ہے اور جناب شوق کا فوٹو بھی دیدیا گیا ہے۔ قیمت سوا روپیہ، ملنے کا پتہ :- نظامی پریس بدایوں۔

URDU PROSE
Under the influence of Sir Sayyed.

اردو نثر پر سرسید کا اثر[1]

سلیس اردو کی نثرنگاری کے میدان میں سب سے پہلا قدم مرزا غالب نے اپنے خطوط میں اٹھایا تھا جس میں انھوں نے ایسا اسلوب بیان اختیار کیا گویا آمنے سامنے بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ اسی داغ بیل پر سرسید احمد خاں اور ان کے احباب مثلاً شبلی، حالی، نذیر احمد، محسن الملک، وقار الملک، ذکاء اللہ نے اردو نثر کو مستقل ادب کی صورت دیدی۔ اس کتاب میں جو انگریزی زبان میں ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ عبداللہ ایم۔ اے کے زور قلم کا نتیجہ ہے یہی بات دکھائی گئی ہے کہ اردو نثر نے کن کن اہل قلم کی امداد سے موجودہ صورت اختیار کی ہے۔ فاضل مصنف نے اردو لٹریچر کے ہر شعبہ پر نہایت قابلیت سے جداگانہ بحث کی ہے۔ شروع میں ڈاکٹر محمد اقبال پروفیسر پنجاب یونیورسٹی کا تمہیدی مضمون بھی خاص قابلیت سے لکھا گیا ہے۔ چھپائی، کاغذ، جلد سب قابل قدر ہے

[1] قیمت ساڑھے تین روپیہ، ملنے کا پتہ :- شیخ مبارک علی بک سیلر و پبلشر، اندرون لوہاری دروازہ لاہور



پنڈت جگموہن ناتھ رینہ - شوق

NIZAMI PRESS, BUDAUN.

مضامین محمد علی حصہ دوم[۱]

مولانا محمد علی جوہر مرحوم کے ادبی، تاریخی، سیاسی و اصلاحی مضامین کا ایک مجموعہ جامعۂ ملیہ دہلی کی کوششوں سے اس سے پہلے شائع ہو چکا ہے، جس پر زمانہ میں تنقید کی جا چکی ہے۔ اب پروفیسر محمد سرور صاحب نے مولانائے مرحوم کے ۴۳ مختلف ادبی، تاریخی، سیاسی و اصلاحی مضامین کا دوسرا حصّہ مرتب کیا ہے اس کا پہلا باب سب سے زیادہ اہم ہے جس میں تیرہ مضامین درج ہیں۔ ان مضامین میں ہندو مسلم مناقشات کے اسباب و محرکات پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ سیاسی مضامین اکثر ایسے ہیں جن میں کانگریس پر نکتہ چینی کی گئی ہے، دراصل یہ مضامین اس وقت کے ہیں جب مولانا مرحوم اور اُن کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی کانگریس سے کنارہ کشی اختیار کر چکے تھے۔ اسی وجہ سے بعض مضامین میں فرقہ وارانہ جذبات کا رنگ جھلکتا ہے۔ سات مضامین کا تعلق حجاز، افغانستان اور چین سے ہے۔ اور پانچ مضمون علامہ سر محمد اقبال مرحوم اور ان کی شاعری کے متعلق ہیں۔ ہر مضمون مولانا نے اپنے مخصوص انداز بیان میں لکھا ہے۔

ان تمام مضامین سے ہندوستان کی موجودہ سیاسیات پر بہت کافی عبور حاصل ہو سکتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ مولانا محمد علی کے خیالات میں وقتاً فوقتاً کیا کیا تغیر و تبدل ہوئے۔ اس طرح یہ مضامین نہ صرف موجودہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہیں بلکہ خود مولانا کے کیرکٹر کو بھی روشنی میں لاتے ہیں۔ لکھائی۔ چھپائی۔ کاغذ عمدہ۔ ضخامت ۴۸۳ صفحات

اسلامی نظام تعلیم[۲]

سید ریاست علی ندوی رفیق دار المصنفین نے اس کتاب میں فن تعلیم کے متعلق مختلف مسلمان علماء کے نظریئے اور متفرق خیالات اور اسلامی بزرگوں کے تعلیمی واقعات جمع کر دیئے ہیں جن سے ناظرین یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اسلامی عروج کے زمانہ میں مسلمانوں کی تعلیم کا نصب العین کیا تھا کس طرح اخلاق و سیرت کی تعمیر کی جاتی تھی، نصاب کیا تھا، درس کیونکر دیئے جاتے تھے، استادوں کے کیا فرائض تھے، اور انھوں نے اپنے وقت میں قدیم طریقۂ تعلیم کی خامیوں کی اصلاح کی کیا کیا کوششیں کی تھیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ اسلامی زمانہ کے اسکولوں وغیرہ پر بھی بہت کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ غرض اُردو زبان میں یہ اپنے طرز کی پہلی کتاب ہے جو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس دہلی کے موقعہ پر لکھی گئی تھی۔ لکھائی چھپائی کاغذ سب نفیس۔ ضخامت بڑی تقطیع کے ۱۶۷ صفحات

---

[۱] قیمت ڈھائی روپیہ ملنے کا پتہ :- مکتبۂ جامعۂ ملیہ دہلی، نئی دہلی، لکھنؤ۔ لاہور۔ بمبئی۔ [۲] ملنے کا پتہ دار المصنفین اعظم گڈھ

شمس المعارف حصہ چہارم[1]

مولوی منظور الحق صاحب کلیم بی بی پور ضلع اعظم گڑھ نے اس کتاب میں بڑی تلاش و تجسس سے اپنے پیر و مرشد حضرت مولٰنا شاہ محمد سلیمان صاحب پھلواری شریف کے خطوط فراہم کرکے یکجا کر دیئے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ اس کتاب کا چوتھا حصہ ہے خطوط کیا ہیں تصوف کے نکات اور رُشد و ہدایت کے رموز کا خزانہ ہیں۔ سالکین راہِ طریقت کو اس کتاب میں بہت سے قابل قدر نکتے ملیں گے۔ چھوٹی تقطیع کے ۲۲۲ صفحات اسکی ضخامت ہے۔

حسین ابن علی[2]

اس کتاب میں حضرت نگہت شاہجہانپوری نے کربلا کے تاریخی واقعات مختلف مستند حوالوں سے درج کئے ہیں۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں حضرت امام حسین کی سیرت پر بھی اُصولی حیثیت سے بحث کی گئی ہے۔ چونکہ کتاب کا اسلوب بیان فلسفیانہ ہے اس لئے اس کی زبان بھی اسی رنگ کی ہے۔ بہرحال اہل ذوق اس سے بہت کچھ اخلاقی باتیں حاصل کر سکتے ہیں۔

زباندانی[3]

آجکل کوشش یہ ہو رہی ہے کہ اُردو زبان کو فروغ دیکر اس کو ہندوستان کی ایک مشترکہ زبان قرار دیا جائے۔ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اُردو زبان اب بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ لیکن یو۔ پی۔ کے علاوہ دوسرے صوبوں کی زبان اور محاورے مختلف ہیں۔ اس افراط و تفریط کو دُور کرنے اور اُردو کو ہندوستان کی مشترکہ زبان بنانے کے لئے مولوی فضل الٰہی صاحب عارف نے یہ کتاب لکھکر اس بات کی کوشش کی ہے کہ تمام ہندوستانیوں کو اگر اہل زبان نہیں تو "زباندان" تو بنا ہی دیا جائے اس کتاب میں تین باب ہیں، جن میں پہلا اور تیسرا باب خاص طور سے قابل مطالعہ ہے پہلے باب میں اُردو گرامر کے چند ضروری قاعدے دربارۂ جمع، تذکیر و تانیث، تلفظ، املا وغیرہ بتائے گئے ہیں، دوسرے باب میں مختلف قسم کے اسماء سے بحث کی گئی ہے، اور چیزوں کے ناموں کی فہرست دی گئی ہے۔ تیسرے باب میں اچھی اُردو کے نمونے دکھائے گئے ہیں۔ عورتوں کی زبان کی مثالیں بھی دی ہیں، اور اُردو میں جو نئے لفظ داخل ہوگئے ہیں اُن سے بھی بحث کی گئی ہے، جو الفاظ انگریزی زبان سے آئے ہیں انھیں انگریزی میں لکھکر سامنے ترجمہ لکھکر تشریح بھی کر دی گئی ہے۔ غرض یہ کتاب طالب علموں، نوخیز ادیبوں اور یو۔ پی سے باہر کے باشندوں کے لئے بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ لکھائی چھپائی۔ کاغذ عمدہ ضخامت ۲۰۰ صفحات

---

[1] قیمت ایکروپیہ۔ ملنے کا پتہ۔ ماسٹر عبد السلام عثمانی دیوریا۔ گورکھپور۔ یا مولوی منظور الحق کلیم ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول شاہجہانپور

[2] ضخامت پانچ جزو۔ قیمت آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ: شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز۔ کشمیری بازار لاہور۔

[3] [illegible] دروازہ لاہور۔

آسان اُردو

انجمن ترقی اُردو حیدرآباد دکن نے ناخواندہ بالغوں کو صاف اور سلیس اُردو سکھانے کے لئے چھوٹی چھوٹی دلچسپ اور سبق آموز کتابوں کا ایک سلسلہ شائع کیا ہے۔ چنانچہ "آسان اُردو" اس سلسلہ کی پہلی کتاب ہے۔ جس میں عربی، فارسی یا سنسکرت کے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ کے استعمال سے قطعی پرہیز کیا گیا ہے۔ مختلف دلچسپ اور سبق آموز موضوعات پر مضامین لکھے گئے ہیں۔ تاریخی حصہ میں مشہور بزرگوں کی سوانح عمریاں ہیں جیسے اتا تک، تلسی داس، خواجہ غریب نواز وغیرہ۔ سماجی حصہ میں دلچسپ اصلاحی کہانیاں ہیں۔ علمی حصہ میں چھوٹے چھوٹے سائنٹیفک مضامین ہیں، جیسے بجلی، لاسلکی، ریل گاڑی وغیرہ چوتھے حصہ میں مشہور اُردو شاعروں کی نظمیں، غزلیں اور رباعیاں درج ہیں۔ غرض کتاب محنت سے مرتب کی گئی ہے۔ اس کا حجم چھوٹی تقطیع کے ۱۶۱ صفحات۔ قیمت آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ۔ معتمد صاحب انجمن ترقی اُردو۔ بجارہ روڈ حیدرآباد دکن۔

فہم انسانی

یہ کتاب انگلستان کے نامور فلسفی ڈیوڈ ہیوم کی مشہور و معروف کتاب Human Understanding کا ترجمہ ہے۔ مولوی عبدالباری پروفیسر جامعہ عثمانیہ نے ترجمہ اس خوبی سے کیا ہے کہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ ایک طبعزاد تصنیف معلوم ہوتا ہے۔ مولوی صاحب نے شروع میں ہیوم کی سوانح عمری بھی دیدی ہے اور اس کے فلسفہ پر مفصل بحث کرکے یہ بھی دکھا دیا ہے کہ اس کا ماحصل کیا ہے۔ کتاب پڑھنے کے قابل ہے۔ ترجمہ میں اگر کوئی نقص ہے تو یہ کہ اسمیں اکثر ثقیل اصطلاحیں جیسے التصاق۔ عوامل۔ معلولات، بستقیم الخطین، وغیرہ) استعمال کی گئی ہیں۔ اسلئے عبارت اکثر دقیق ہوگئی ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ ہے۔ ضخامت بڑی تقطیع کے تقریباً دو سو صفحات۔ ملنے کا پتہ دار المصنفین اعظم گڈھ۔

سرودِ جاوید

اُردو زبان میں پنڈت دیا شنکر نسیم کی "گلزار نسیم" اور میر حسن دہلوی کی "سحر البیان" اپنا جواب نہیں رکھتیں صنائع بدائع شعری اور حسن اختصار میں جس طرح "گلزار نسیم" پر آج تک کوئی اردو مثنوی سبقت نہیں لے جاسکی اسی طرح سلاست بیان اور منظر کشی میں مثنوی "سحر البیان" اپنی نظیر آپ ہے۔ یہ کتاب بھی مثنوی سحر البیان کا ایک تازہ ایڈیشن ہے جسے مولوی محمد شمس الحسن صاحب شمس قریشی بریلوی نے بڑی محنت کے ساتھ ایڈیٹ کرکے "سرود جاوید" کے نام سے شائع کیا ہے۔ شروع میں شمس صاحب نے ایک بسیط مقدمہ لکھکر مثنوی پر مفصل تنقید کی ہے، اور محاسن کے ساتھ ساتھ معائب پر بھی روشنی ڈال کر فن تنقید کا حق

ادا کیا ہے۔ مقدمہ میں اُردو مثنوی کی تدریجی ترقی پر بھی قابل قدر بحث کی گئی ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ معمولی حجم ۴۴ صفحات، قیمت ایک روپیہ بارہ آنے (ملنے کا پتہ:- اورنٹیل بک ڈپو۔ بریلی)

عصرِ نو

یہ مولوی محمد صادق صاحب ضیا اکبرآبادی کی ایک مسلسل اور سبق آموز نظم ہے، جس میں موجودہ زمانہ کی تمام خصوصیات پر عمدگی کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، اور لطف یہ ہے کہ کسی شعر میں محاسن فن کا دامن نہیں چھوڑا گیا ہے۔ غرض یہ نظم قابل تعریف اور خیالات بہت بلند و پاکیزہ ہیں۔

شروع میں مسٹر انور مختار بی۔اے، ایل ایل، بی نے تقریباً ایک جزو کا مقدمہ لکھکر اس کے محاسن پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ اوسط۔ ضخامت تین جزو قیمت تین آنہ ملنے کا پتہ منیجر رسالہ شاعر آگرہ

سلسلۂ تعلیم و ترقی کی کتابیں

پچھلے دنوں مختلف صوبوں کی کانگریسی وزارتوں نے ہندوستان سے بے علمی و جہالت دُور کرنے کی جو مبارک کوشش شروع کی تھی، اُس کے ضمن میں جامعہ ملیہ دہلی نے سہل و سلیس ہندوستانی زبان میں دلچسپ اور مفید عام کتابوں کا ایک سلسلہ شائع کیا ہے جس میں دو ڈھائی درجن کتابیں ہیں۔ یہ کتابیں ہمارے پاس بھی ریویو کے لئے آئی ہیں اور ہم ان کو سرسری نظر سے دیکھکر اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ ملک سے ناخواندگی دُور کرنے میں یہ کتابیں واقعی مفید ثابت ہونگی۔ کیونکہ ایک تو ان کی زبان بہت سلیس ہے، دوسرے ان میں پڑھنے والوں کی تدریجی تعلیم کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ مثلاً اُردو قاعدہ کو مبتدیوں کے لئے تین حصوں میں تقسیم کرکے صاحبزادہ محمد سعید الظفر صاحب سابق وزیر تعلیم ریاست بھوپال نے اس عمدگی سے مرتب کیا ہے کہ ایک اَن پڑھ شخص کو بہت جلد اُردو لکھنا پڑھنا آسکتا ہے، اور اگر کوئی شخص محبت اور توجہ کے ساتھ یہ تینوں قاعدے پڑھکر ان کے ہدایات پر عمل کرے تو تقریباً ایک مہینہ میں اُردو لکھنے پڑھنے کے لایق ہو جائیگا۔ اس کے بعد آسان زبان میں چھوٹی چھوٹی دلچسپ اور سبق آموز قصے کہانیوں کی کتابیں ہیں۔ چوتھے حصّے میں محمد صاحب کی مختصر سوانح عمری ہے۔ پانچویں میں آسان قومی نظمیں ہیں اسی طرح کسی میں میونسپلٹی کا ذکر کیا گیا ہے۔ کسی میں خط و کتابت کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ چند میں رہنمایان اسلام کی سوانحعمریاں درج ہیں۔ اور چند میں فسانۂ عجائب، چہار درویش وغیرہ جیسے مشہور قصوں کے خلاصے پیش کئے گئے ہیں۔ ایک چھوٹی سی کتاب میں ضلع کے انتظامات سمجھائے گئے ہیں۔ اور ہندوستان کا مختصر جغرافیہ بھی بتایا گیا ہے اسی سلسلہ میں ایشیا یورپ اور دنیا کے عمدہ نقشے بھی چھاپے گئے ہیں جسمیں جغرافیہ سے متعلق تمام ضروری باتیں بتا دیگئی ہیں۔ ان سب باتوں کے لکھنے میں اختصار سے کام لیا گیا ہے چنانچہ کسی کتاب کی ضخامت ڈیڑھ جزسے زیادہ نہیں ہونے پائی۔ ہمارے نزدیک یہ چھوٹی چھوٹی کتابیں بہت مفید اور پُر از معلومات ہیں جن سے بچے اور بالغ اَن پڑھ دونوں فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ انکی لکھائی چھپائی اور کاغذ بھی عمدہ ہے۔ ہر کتاب کی قیمت صرف ایک آنہ ہے۔ ملنے کا پتہ:- مکتبۂ جامعۂ ملیہ۔ دہلی، لاہور، لکھنؤ، بمبئی۔

رفتار زمانہ

(یورپ)

جنگ یورپ کے شعلے چاروں طرف بھڑک رہے ہیں، یورپ میں تو لڑائی کی تباہ کاریاں ہو ہی رہی ہیں پچھلے دو مہینوں سے افریقہ کے مختلف اطالوی مقبوضات میں بھی خوب گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے۔ برطانیہ کی فوجیں بہادری کی داد دے رہی ہیں اور اٹلی پر ضرب پر ضرب لگا رہی ہیں۔ مشرق قریب کے حالات بھی تشویش انگیز ہو رہے ہیں اور امریکہ میں بھی جنگ کی صدائیں گونجنے لگی ہیں۔ یوں تو امریکہ ابھی تک میدان جنگ سے الگ تھلگ ہی ہے لیکن وہ برطانیہ اور یونان کی براہ راست مدد کر رہا ہے، اس لئے اسکو بھی بالواسطہ جنگ میں شریک سمجھنا چاہیئے۔ خصوصاً اب جب اس نے برطانیہ کو ہر قسم کی مدد دینے کا تہیہ کر لیا ہے۔

یورپ میں اس وقت تین جگہ جنگ ہو رہی ہے، برطانیہ و جرمنی کے درمیان ہوائی و بحری جنگ جاری ہے بحیرۂ روم میں بھی ہوائی و بحری لڑائیاں ہو رہی ہیں، تیسرے البانیہ میں اٹلی اور برطانیہ و یونان کے مابین معرکے ہو رہے ہیں اور عنقریب ان کا دائرہ وسیع ہو کر بلقانی ریاستوں میں ایک چوتھا میدان جنگ قائم ہونیوالا ہے برطانیہ و جرمنی میں خشکی کی لڑائیاں نہیں ہیں لیکن فریقین وقتاً فوقتاً ایک دوسرے پر حملے کرتے رہتے ہیں فرانسیسی ساحل سے جرمنی کی دور مار توپیں انگلینڈ پر اور انگلینڈ کے ساحلی توپخانے فرانس و بلجیم کے جرمن علاقوں میں گولہ باری کرتے رہتے ہیں۔ ہوائی حملے ایک دوسرے پر سختی سے جاری ہیں۔ مگر جرمن ہوائی حملوں کی اب پہلی سی شدت نہیں رہی۔ چنانچہ پچھلے پانچ ماہ کے ہوائی حملوں کے نقصانات کی تفصیل یہ ہے:-

نام ماہ	کل حادثات	مقتولین کی تعداد
ستمبر ۱۹۴۰ء	۱۷۵۶۹	۶۹۵۴
اکتوبر ۱۹۴۰ء	۱۵۰۲۹	۶۳۳۴
نومبر ۱۹۴۰ء	۱۱۵۴۲	۴۵۸۸
دسمبر ۱۹۴۰ء	۸۸۳۷	۳۴۹۳
جنوری ۱۹۴۱ء	۳۵۱۴	۱۵۰۲

ہوائی حملوں کے شروع ہونے پر اوّل دو مہینوں کے نقصانات میں مقتولین کا اوسط ۷ ہزار سالانہ تھا مگر مندرجہ بالا پانچ مہینوں کا اوسط بیس ہزار سال کا رہا۔ البتہ اس دوران میں ویلز اور اسکاٹ لینڈ کے بعض

مقامات پر بھی حملے ہوئے ہیں۔

برطانوی ہوائی جہازوں نے جرمنی، بلجیم، ہالینڈ اور فرانس کے جرمن علاقوں میں فوجی اہمیت کے بہت سے مقامات مثلاً بندرگاہوں، کارخانوں، ریلوے اسٹیشنوں کو سخت نقصان پہونچایا ہے۔ چنانچہ جرمنی میں برطانیہ کے ہوائی جہازوں کا خوف پیدا ہو گیا ہے اور وہاں ان حملوں کے خلاف حفاظتی کارروائیاں اختیار کی گئی ہیں۔ انگلستان کے نقصانات کے متعلق جرمن ریڈیو میں بہت ہی مبالغہ آمیز بیانات شائع ہوتے ہیں لیکن جہاں تک اہل برطانیہ کی ہمت اور حوصلہ اور برٹش گورنمنٹ کی اولوالعزمی کا تعلق ہے، ان نقصانات کا اثر چنداں محسوس نہیں ہو رہا ہے۔ سب سے زیادہ نقصان شہر لندن کا ہوا ہے لیکن عوام لندن پہلے سے بھی زیادہ فتح حاصل کرنے کے درپے ہیں۔ اور تمام برطانیہ پورے جوش و سرگرمی کے ساتھ آخر تک لڑنے پر مستعد ہے۔

بحری جنگ کی حالت اس سے مختلف ہے، کیونکہ اس وقت تک جرمنی کے پاس کوئی جنگی بیڑہ نہیں ہے اور برطانیہ کا بحری بیڑہ بدستور سمندروں پر قابض ہے، اور جو برطانوی جہاز برطانیہ کو آتے یا برطانیہ سے جاتے ہیں ان کے کاروانوں کی حفاظت کر رہا ہے۔ مگر جرمنی ہوائی جہازوں اور آبدوز کشتیوں سے کام لے رہا ہے اور کبھی اس کے "پاکٹ جنگی جہاز" بھی کھلے سمندروں میں اتحادی جہازوں پر گولہ باری کرکے یا تارپیڈو مار کر نقصان پہونچا دیتے ہیں۔ یہ نقصانات حال میں کسی قدر زیادہ ہوئے ہیں لیکن ان نقصانات کی ہمت و استقلال کے ساتھ تلافی کی جا رہی ہے۔ امریکہ مدد دے رہا ہے اور[1] انگلستان میں بھی رات دن نئے جہاز بن رہے ہیں۔ دشمن کے جہاز بھی انگلستان کے ہاتھ آتے رہتے ہیں۔ بہرحال اس وقت تک فریقین کے جتنے جہاز سمندر کی تہہ میں پہونچ گئے ہیں اُن کا وزن لکھو کھا ٹن تک پہونچتا ہے۔

بحیرۂ روم میں برطانوی بیڑے کو نقصان پہونچانے اور برطانوی جہازوں کی آمد و رفت روکنے کیلئے جرمنی نے اطالوی جزیرۂ سسلی میں اپنا ہوائی اڈہ قائم کر لیا ہے، جہاں سے جرمن ہوائی جہازوں نے برطانوی جہازوں کے ایک کاروان پر جو جنگی جہازوں کی حفاظت میں جا رہا تھا حملہ کیا۔ اور چند جہازوں کو جن میں ایک جنگی جہاز اور ایک طیارہ بردار جہاز ساؤتھیمپٹن نامی تھا غرق کر دیا۔ مگر باربردار جہازوں کے قافلہ کو برطانوی جہازوں نے بچا لیا، اور وہ مع تمام ضروری اور بیش قیمت سامان کے یونانی بندرگاہوں میں خیر و عافیت کے ساتھ پہونچ گئے

اس وقت جنوب مشرقی یورپ میں جنگ کا ایک نیا محاذ پیدا ہونے کا پورا سامان ہو گیا ہے۔ رومانیہ میں تو ہٹلر نے اپنا قبضہ کر ہی رکھا ہے اور اسکی فوج بھی وہاں بہت کافی تعداد میں موجود ہے۔ مگر اس وقت اس نے

[1] اس سال امریکہ میں برطانیہ کے لئے چار سو اسّی جنگی جہاز تیار ہو رہے ہیں۔

اس نے بلغاریہ پر اپنا اقتدار پورے طور پر قائم کرلیا ہے چنانچہ ابھی تک بلغاریہ کی سرحد پر جرمن فوجیں جمع تھیں مگر ہفتہ عشرہ سے برابر یہ خبریں آرہی ہیں کہ جرمن کثیر تعداد میں بلغاریہ میں داخل ہوگئی ہیں۔ اور اب یوگوسلاویہ کو بھی جس پر جرمن نظام قبول کرنے کے لئے مجبور کیا جارہا ہے۔ یوگوسلاویہ کی سرحد ایک طرف جرمنی اور دوسری طرف البانیہ میں اٹلی سے ملی ہوئی ہے جس کی وجہ سے وہ دونوں طرف سے محوری طاقتوں کی گرفت میں پھنسا ہوا ہے۔ پچھلے دنوں ہٹلر نے یوگوسلاویہ کے وزیر اعظم اور وزیر خارجیہ کو جرمنی میں طلب کرکے اس بات پر زور ڈالا تھا کہ وہ یورپ میں نیا نظام قائم کرنے میں جرمنی کا ساتھ دے۔ اور وہ علاقے جو ۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد ہنگری اور بلغاریہ سے چھین کر اسے دیدیئے گئے تھے ان دونوں ملکوں کو واپس کردے اور ان کے عوض اسکو شہر سقوطری مع مفصلات (جس کے اہل ماننٹی نیگرو عرصے سے خواہشمند ہیں) اور البانیہ میں جھیل اور حیندہ کا علاقہ جس میں شہر کورٹزا وغیرہ شامل ہیں اور جو فی الحال یونانیوں کے قبضہ میں ہیں دیدیئے جائیں گے اور اسے بندرگاہ سالونیکا استعمال کرنیکا اختیار بھی رہے گا۔ ان وعدوں کا کیا حشر ہوگا یہ تو آئندہ واقعات ہی تبلائیں گے لیکن اسوقت بلقانی ریاستوں کی بے بسی ظاہر ہے تاہم اسوقت تک ترکی مضبوطی سے برطانیہ کا ساتھ دے رہا ہے اور یگوسلاویہ نے بھی پانچ لاکھ نئی فوج تیار کرلی ہے ترکی کا خیال ہے کہ یگوسلاویہ اسی کے ساتھ رہیگا لیکن اسوقت بلغاریہ میں جرمنی کا جو فوجی اجتماع ہے اسکا منزل مقصود یونان ہی ہے پہلے یہ خیال تھا کہ روس بلغاریہ کو جرمنی کے اثر میں آنے نہ دیگا لیکن اس نے عجیب پیچیدہ رویہ اختیار کر رکھا ہے اور اس کی پالیسی ایک ناقابل حل معمہ بن گئی ہے[1] ترکی کے متعلق بھی یہی خیال تھا کہ وہ بلغاریہ میں جرمن فوجوں کا داخل ہونا پسند نہ کریگا۔ لیکن پچھلے دنوں ترکی اور بلغاریہ کے درمیان ایک غیر جارحانہ معاہدہ ہوچکا ہے جسکی رو سے فریقین نے ایک دوسرے پر کسی حالت میں حملہ نہ کرنیکا قول و قرار کرلئے ہیں اس کے مو لے معنے یہی ہو سکتے ہیں کہ ترکی یونان کے لئے جنگ میں شامل ہو کر اپنی جان جوکھوں میں نہ ڈالے گا اور اس وقت تک لڑائی سے بچتا رہیگا جب تک خود اُس کے حدود پر حملہ نہ ہو لیکن اس معاہدہ کے باوجود ترکی کی طرف سے بار بار اس بات کا اعلان ہوا ہے کہ برطانیہ کے ساتھ وہ اپنے دوستانہ معاہدہ پر مضبوطی سے قائم ہے گا۔

برطانیہ کے وزیر خارجہ مسٹر ایڈن اور برطانوی فوج کے افسر اعلیٰ سر جان ڈِل ۱۷۔ فروری کو انقرہ جاکر دو گھنٹہ تک پریسیڈنٹ ٹرکی سے آئندہ انتظامات کے متعلق مفصل بات چیت کرچکے ہیں اور یہ خبر اطمینان بخش ہے کہ تمام مسئلے فریقین نے اتفاق رائے سے باہم طے کرلئے ہیں جہانتک بلغاریہ کا تعلق ہے برطانیہ نے اس سے سیاسی تعلقات منقطع کرلئے ہیں اور صوفیہ کا برطانوی سفارت خانہ بھی بند ہوچکا ہے۔ لندن میں بلغاریہ کے سفیر نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دیدیا ہے جسکے معنی یہ ہیں کہ اُس نے اپنی گورنمنٹ کی موجودہ پالیسی پسند نہیں کی بہرحال اب رومانیہ اور بلغاریہ دونوں برطانیہ کے لئے دشمن ملک ہیں۔

البانیہ میں یونان اور اٹلی میں برابر لڑائی جاری ہے اور اٹلی کو ہر جگہ شکست ہو رہی ہے، حتیٰ کہ البانیہ کے ایک تہائی حصہ پر یونانی قبضہ ہوگیا ہے۔ ایک طرف بندرگاہ ویلونا اور دوسری طرف دراز و بھی خطرے میں پڑگئے ہیں۔

---

[1] اسکے بعد روس نے بلغاریہ میں جرمن فوجوں کے داخلہ [illegible]

اگر یونانیوں کا ان دونوں بندرگاہوں پر قبضہ ہوگیا تو گویا تمام البانیہ اٹلی کے ہاتھ سے نکل جائیگا۔ مسولینی نے اپنی پچھلی تقریر میں اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اٹلی آٹھ ماہ سے نہیں بلکہ پچھلے چھ سال سے لڑ رہا ہے اسی وجہ سے اسے اس جنگ میں پوری ہمت اور طاقت سے لڑنے کے باوجود نقصان اٹھانا پڑا ہے اب تک صرف البانیہ میں اٹلی کے ایک لاکھ ۴۲ ہزار آدمی ضائع ہو چکے ہیں، جن میں سے ہزارہا مارے گئے، ہزارہا زخمی ہوئے اور ہزارہا لاپتہ ہیں۔ ان میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو یونانیوں نے قید کر لیئے ہیں۔ اب خبر ہے کہ ہٹلر اپنی پوری طاقت سے یونان پر حملہ کرنے والا ہے۔ وہ اپنی تازہ ترین تقریر میں بھی کہہ چکا ہے کہ اس وقت وہ اٹلی کی مدد میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے گا۔ موسم بھی تبدیل ہو رہا ہے اور بارش اور برفباری ختم ہو گئی ہے چنانچہ تازہ دم جرمن فوجیں یونان میں گھمسان کی لڑائی کرنے والی ہیں۔

افریقہ افریقہ میں چار جگہ لڑائی ہو رہی ہے۔ لیبیا، ارٹیریا، حبش، شرقی افریقہ۔ شروع شروع میں اٹلی کو کچھ فتوحات حاصل ہوئیں۔ چنانچہ ایک طرف تو اٹلی کی فوج لیبیا سے چلکر تقریباً ستر اسی میل تک مصر میں داخل ہو گئی دوسری طرف اس نے ارٹیریا سے بڑھکر سوڈان پر حملہ کیا اور کسلا وہ لے لیا اور برطانوی صومال پر حملہ کرکے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس کے علاوہ حبش کی طرف سے کینیا پر حملہ کرکے مویالہ اور گرد و پیش کا علاقہ بھی اٹلی نے لے لیا تھا۔ لیکن جب آسٹریلیا۔ جنوبی افریقہ۔ نیوزیلینڈ اور ہندوستان سے برٹش فوجیں پورے ساز و سامان کے ساتھ کثیر تعداد میں پہونچ گئیں تو لڑائی کا پانسہ ایک دم سے پلٹ گیا۔ اور برٹش فوج نے جو اب تک محض مدافعت کر رہی تھی طاقتور حملے کرنے شروع کر دیئے اور چند ہی روز میں دشمن کو نہ صرف اپنے علاقوں سے نکال باہر کر دیا بلکہ دشمن کا کثیر علاقہ بھی فتح کر لیا۔ کتنی تیزی سے یہ فتوحات حاصل ہوئیں اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۱۔ دسمبر کو سیدی برانی فتح ہوا جہاں سے بھاگ کر اطالوی فوجوں نے سولم میں مورچے جمائے۔ مگر برٹش فوج نے یہاں بھی دشمن کے پاؤں جمنے نہ دیئے اور ۱۶۔ دسمبر ۱۹۴۰ء کو یہ مقام چھین لیا جس سے مصر کی سرزمین دشمن کے قدموں سے پاک ہو گئی۔ سولم کے بعد پیش قدمی کرکے برطانوی فوجوں نے سرحدی قلعہ قبازو فتح کر لیا جس سے گویا جنگ دشمن کے علاقہ میں پہونچ گئی۔ قبازو فتح کرنے کے دو ہفتے بعد ۵۔ جنوری ۱۹۴۱ء کو باردیہ فتح ہوا۔ اس کے بعد ۲۲۔ جنوری کو طبروق ۳۰ جنوری کو درنہ اور ۳۔ فروری کو بندرگاہ اپولونیہ فتح ہوا۔ اس کے بعد بارقہ کا نمبر آیا اور ۶۔ فروری کو بنغازی فتح ہو جانے سے لیبیا کا پورا صوبہ سائرینائیکا برطانیہ کے قبضہ میں آگیا۔ اب لیبیا میں صرف ایک اہم مقام طرابلس باقی رہ گیا ہے جو غالباً جلد ہی برطانیہ کے ہاتھ آجائے گا۔ ان فتوحات سے برطانوی فوجوں کے حوصلے بڑھ گئے اور اطالوی فوجوں کی ہمتیں ٹوٹ گئیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جوں جوں برطانوی فوجوں کا دباؤ پڑتا گیا اطالوی فوجیں سوڈان کے مقبوضہ مقامات کو خالی کرکے حبش و ارٹیریا

کی طرف فرار ہونے لگیں۔ اب یہ حال ہے کہ سوڈان سے سیکڑوں میل کے فاصلہ پر اطالوی فوجوں سے اریٹریا
اور حبش میں مقابلہ ہو رہا ہے اور اطالوی فوجیں ایک برابر ہتھیار ڈالتی چلی جاتی ہیں سومالیہ کے گرد و نواح کا علاقہ
دوبارہ فتح کر لیا گیا ہے اور اطالوی صومال میں برطانوی فوجیں شہر پر شہر فتح کرتی چلی گئی ہیں۔ یہاں تک کہ اس
وقت اطالوی صومال کے دارالحکومت مغادیشیو پر بھی برطانوی جھنڈا لہرا رہا ہے۔ ان لڑائیوں میں اٹلی کے
بڑے بڑے فوجی دستے صاف ہو گئے، چنانچہ خود مسولینی نے اپنی تازہ تقریر میں ان نقصانات کو تسلیم کیا ہے
اس وقت تک اٹلی کے ایک لاکھ سے زائد سپاہی برٹش فوج کے ہاتھوں قید ہو چکے ہیں، جن میں سے
ہزارہا آدمی ہندوستان بھی بھیجے گئے ہیں۔

حبش کے سابق شہنشاہ بھی اپنے ملک میں داخل ہو گئے ہیں اور اُن کے بہت سے ساتھی اور جاں باز
وطن پرست حبشی اُن کے ساتھ اٹلی سے برسر جنگ ہیں، انھیں بھی برطانیہ کی مدد سے جگہ جگہ فتوحات ہو رہی
ہیں۔ افریقہ میں اٹلی کی فوج کچھ ایسی گھر گئی ہے کہ اب اُسے نہ مدد پہونچ سکتی ہے نہ رسد۔ اس کا نتیجہ تو یہی
ہونا چاہیئے کہ افریقہ میں اٹلی کی سلطنت بالکل ہی ختم ہو جائے اس وقت اُسے اگر کچھ اُمید ہو سکتی ہے تو جرمنی سے
چنانچہ حال میں ہٹلر اور مسولینی سے ملاقات ہو چکی ہے اور ہٹلر نے دوستی کا حق ادا کرنے کا اعلان کیا ہے
اس نے عنقریب ہی انگلستان پر حملہ کی بھی دھمکی دی ہے اور ڈبکنی کشتیوں سے اسکی بحری طاقت کو ضرب
کاری لگانے کا دعویٰ کیا ہے۔ اس کی کوشش ہے کہ ایک طرف فرانس و اسپین کی مدد سے وہ برطانیہ کی
سمندری طاقت کو زک پہونچائے دوسری طرف امریکہ کی امداد میں فرق ڈالے۔ ادھر انگلستان کے لئے
مشرق اقصیٰ میں مزید مشکلات پیدا کرنے کی غرض سے جرمنی جاپان کو لڑائی میں گھسیٹ رہا ہے۔ جاپان
کی نیت تو ہالینڈ اور فرانس کی شکست ہی کے بعد سے بگڑ چکی تھی چنانچہ اس نے کسی نہ کسی بہانہ سے ہند چینی
اور ہالینڈ کے جزائر شرق الہند پر قبضہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ نانکن میں ایک نام نہاد "قومی حکومت" قائم کرکے اس نے
جنوب کی طرف اپنی فوجیں بڑھانا شروع کر دیں، اور اسی اثنا میں چین کے جزیرہ ہینان پر قبضہ کر لیا جو ہند چینی سے
بہت قریب ہے۔ اور ہند چینی کی گورنمنٹ کو اس بہانہ سے دھمکانا شروع کر دیا کہ ہند چینی کے راستہ سے
چیانگ کائی شیک کو مدد پہونچتی ہے۔ ہند چینی کی اب وہ پوزیشن نہیں رہی کہ جاپان کا مقابلہ کرسکے۔ جرمنی نے
بھی فرانسیسی حکومت کو دبا کر جاپان کو ہند چینی کی ریاست ٹانکن میں فوجیں اُتارنے، بحری اور ہوائی اڈے
قائم کرنے اور بندرگاہوں اور ریلوے سے کام لینے کی رعایتیں دلا دیں۔ اُدھر جاپان نے سیام کو بھڑکا کر
ہند چینی سے لڑا دیا اور جب بعض مقامات میں سیام کو کامیابی ہوئی تو جاپان نے التوائے جنگ کی تحریک
پیش کرکے صلح کی تجویز پیش کی جسے فریقین نے منظور کر لیا۔ اس شاطرانہ چال سے جاپان نے مشرقی ایشیا میں

اپنی بالادستی قبول کرالی۔　　اس وقت ہند چینی اور سیام کے نمایندوں کے درمیان ٹوکیو میں کانفرنس ہو رہی ہے سیام نے جاپان کی تجویز کردہ سب شرطیں مان لیں، لیکن ہند چینی کو بعض باتوں کے متعلق عذر ہے جس پر جاپان زبردستی سے کام لینے کی دھمکی دے رہا ہے۔ اس وقت لاکھوں جاپانی سپاہ ہند چینی اور اس کے آس پاس جمع ہے اور جاپانی جنگی بیڑہ　ہند چینی اور سیام کے سمندروں میں گشت کر رہا ہے۔ اس فوجی نقل و حرکت سے سنگاپور وجزائر فلیپائن، برطانوی وامریکن مقبوضات کو بھی خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس لئے امریکہ اور برطانیہ کو بحرالکاہل میں بہت سی تازہ دم فوج اور سامان جنگ بھیجکر اپنی طاقت بڑھانا پڑی۔ آسٹریلیا کی فوج بھی ملایا کے مختلف مقامات میں تعینات ہو گئی ہے اور امریکن جنگی بیڑہ　بحرالکاہل میں آ گیا ہے۔ یہ بھی خبر ہے کہ کئی سو امریکن اور برطانوی ہوائی جہاز سنگاپور پہونچ گئے ہیں بہر حال مشرقی ایشیا میں بھی جنگ کے شعلے بھڑک جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے سنگاپور کے قریب سمندری جنگ کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں اور کسی دن کسی بات پر یہاں بھی جنگ چھڑ جانے کا پورا سامان اکٹھا ہو گیا ہے۔ درحقیقت برٹش گورنمنٹ نے مسٹر چرچل اور مسٹر ایڈن کی رہنمائی میں جاپان کی ریشہ دوانیوں کا پوری طرح مقابلہ کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ اس نے عرصہ تک جاپان کے ساتھ جو نرمی کی پالیسی برتی اس کا نتیجہ کچھ اچھا نہیں نکلا۔ مگر اب جبکہ برطانوی وزرا نے اپنی سلطنت کے مفاد کی حفاظت کرنیکا قطعی ارادہ کر لیا ہے جاپان کشمکش و پیچ میں پڑ گیا ہے۔ جاپانی وزرار نے حال میں امریکہ کے وسوسوں کو بھی باطل قرار دیا اور وزیر خارجہ نے فریقین جنگ کے درمیان صلح کرانے کی آمادگی ظاہر کی حالانکہ　جب برطانیہ کی طرف سے اس کو کورا جواب مل گیا اور ہٹلر نے بھی اس تجویز کو ناپسند کیا تو وزیر موصوف نے اپنے بیان کی تاویلیں کرنا شروع کر دیں۔ ان تاویلات کے مطابق جاپان نے اہل امریکہ و برطانیہ کو جو مشرق بعید کے متعلق تردد کا اظہار کرتے ہیں، صرف اس بات کی یاد دہانی کی ہے کہ اس وقت نہ صرف مشرق بعید میں ہلچل ہے بلکہ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی خونریز لڑائی ہو رہی ہے۔"

مختلف محاذ جنگ پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد سب سے ضروری سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سال ۱۹۴۱ء میں جنگ کا کیا نقشہ رہیگا۔ یوں تو ہٹلر برابر دھمکیاں دیئے جا رہا ہے اور اس میں شک نہیں ہے کہ اس کو عنقریب ہی کچھ نہ کچھ کارنمایاں دکھانا چاہیئے لیکن یہ بات بھی روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ برطانیہ کی حالت اس وقت جون ۱۹۴۰ء اور اکتوبر اور نومبر اور دسمبر ۱۹۴۰ء سے　کہیں زیادہ مضبوط ہے اور امریکہ　بھی اس وقت برطانیہ کو ہر ممکن امداد دینے کو کمربستہ ہو گیا ہے۔ اس وقت ستر فیصدی سے زیادہ باشندگان امریکہ اس بات پر تلے نظر آتے ہیں کہ جس طرح سے　ہو سکے ہٹلر کو برطانیہ پر غالب آنے کا موقع نہ دیا جائے امریکن سینٹ

کے سامنے ان دنوں جنگی جہاز اور دیگر سامان انگلستان کو مستعار دینے کی جو تجویز پیش تھی وہ بہت کچھ بحث و مباحثہ کے بعد بھاری کثرت رائے سے پاس ہو گئی ہے اور اب جلد ہی پریسیڈنٹ روزولٹ کو اسکے متعلق ضروری قانونی اختیارات مل جائیں گے۔ امریکہ میں رات دن بڑے زور شور جنگی سامان تیار ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس وقت پہلے سے چوگنے تگنے مزدور کام کر رہے ہیں اور عنقریب ہی لاکھوں آدمی اور کام کرنے لگیں گے اب سب باتوں سے ظاہر ہے کہ ہٹلر کی دھمکیوں کے باوجود حالات برطانیہ کے موافق ہیں۔ ۱۹۴۱ء میں دونوں ملکوں کی طاقتوں کا موازنہ کرتے ہوئے "یارک شائر پوسٹ" کے جنگی نامہ نگار نے ذیل کی باتوں کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:-

اس وقت تک جرمنی کی بحری طاقت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے، مگر برطانیہ کی سمندری طاقت بہت بڑھ گئی ہے، اور تمام سمندری راستوں سے برطانوی جہاز برابر آ جا رہے ہیں

اس سال سامان رسد کے متعلق بھی برطانیہ کو کوئی تشویش نہیں ہے۔ اٹلی مشرقی بحیرۂ روم سے بالکل بیدخل ہو گیا ہے۔ خود برطانیہ میں برٹش فوج کی طاقت پہلے سے دوچند ہو گئی ہے اور برطانیہ کے سمندری اڈے اپنی جگہ پر برابر قائم ہیں مگر دشمن کے پچاس فیصدی سمندری اڈے تباہ و برباد ہو چکے ہیں، ہوائی طاقت بھی پہلے سے دوگنی ہو گئی ہے۔ برطانوی ناکہ بندی اپنی جگہ پر قائم ہے۔ اور گو ہٹلر اور مسولینی دونوں عرصۂ دراز تک لڑائی جاری رہنے کا دعوی کر رہے ہیں لیکن جہاں تک حالات سے معلوم ہو رہا ہے عجب نہیں کہ اس سال (۱۹۴۱ء) کے آخر تک ان دونوں کو تیل و پٹرول کی بہم رسانی میں زیادہ کمی محسوس ہونے لگے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بلغاریہ کو بالکل دبا دینے کے بعد جرمنی یونان کو صلح کرنے پر مجبور کرے لیکن امید ہے کہ اتنی فتوحات حاصل کرنے کے بعد یونان خودکشی کے لئے تیار نہ ہوگا۔ ترکی اور برطانیہ کا کامل سمجھوتہ ہو چکا ہے اور ان سطروں کے لکھتے وقت جو خبریں آئی ہیں اُن سے یہی پایا جاتا ہے کہ عصمت پاشا اور مسٹر ایڈن وزیر خارجہ برطانیہ نے تمام مسائل پر اتفاق رائے کے ساتھ غور کر کے آیندہ واقعات کے مقابلہ کی تیاریاں کر لی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ابھی تک جرمن فوجوں کو شکست سے سامنا نہیں ہوا ہے لیکن جب تک برطانیہ کے دم میں دم ہے اس کے مقاصد پورے ہوتے نظر نہیں آتے۔

ہندوستان

ہندوستان کے حالات ہماری نظر میں بد سے بدتر ہوتے جاتے ہیں۔ پچھلے دو ماہ کے دوران میں بھی صاحب وزیر ہند کی کئی تقریریں ہوئیں۔ پارلیمنٹ میں بھی مختلف موقعوں پر سوال جواب ہوتے رہتے ہیں۔ مگر ان سب میں مسٹر ایمری ایک ہی راگ الاپتے ہیں اور ہندوستان کے اندرونی اختلافات کا ذکر کر کے بار بار ۸ اگست و ۲۰ نومبر ۱۹۴۰ء کے اعلانات کا حوالہ دیتے رہتے ہیں گویا یہ اعلانات برطانیہ کی طرف سے ہندوستان کے متعلق آخری الفاظ ہیں جنہیں ایک لفظ یا ایک نقطہ کی کمی بیشی نہیں ہو سکتی

مسٹر ممدوح نے اس بارے میں جو پوزیشن اختیار کر لی ہے اس سے ملک میں عام بے اطمینانی پھیلی ہوئی ہے کیونکہ رسمی باتوں کے علاوہ انھوں نے ابھی تک ہندوستانی جذبات کے ساتھ اپنی عملی ہمدردی کا کسی موقعہ پر کوئی ثبوت نہیں دیا ہے۔ حال میں انھوں نے افریقہ کی فتوحات میں ہندوستانی سپاہیوں کی بہادری اور دلاوری کی بڑی تعریف کی ہے اسی کے ساتھ اگر وہ اپنے ہموطنوں سے ہندوستانیوں کے ساتھ موجودہ سے بہتر سلوک کرنے کی بھی اپیل کرتے یا دوران جنگ ان کو انگریز سپاہیوں کے برابر تنخواہ و الاؤنس دینے کی راہ نکالتے تو اہل ہند انکی قدردانی کے واقعی تہ دل سے شکرگذار ہوتے۔ ہم انکی تقریروں کو رسمی اس لحاظ سے کہتے ہیں کہ ۲۰ فروری کو جب ایک ممبر پارلیمنٹ نے اُن سے یہ کہا کہ پنجابی سپاہیوں کی بہادری اور صوبہ پنجاب کی وفاداری کے لحاظ سے کم از کم پنجاب کو حکومت کا حق دیدیا جائے تو مسٹر امری نے اس کا یہ جواب دیا کہ پنجاب کو حکومت خود اختیاری حاصل ہے۔ ایک اور تقریر کے دوران میں ملک کے مختلف اجزا اور صوبوں کی آبادی کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے نادانستہ طور پر ایک طرف کسی قدر مبالغہ آمیز اور دوسری طرف واقعی تعداد سے تخفیف کر کے جو تعداد بتائی اس سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ عموماً انکی تقریریں پروپیگنڈا کی حیثیت رکھتی ہیں جنکا مقصد یہاں کی گتھیاں سلجھانا نہیں بلکہ انگلستان اور دیگر ملکوں میں ہندوستانی مسئلہ کے حل کی ساری ذمہ داری اہل ہند و ہندوستانیوں کے سر تھوپنا ہے یہی وجہ ہے کہ انکے طرز عمل سے کوئی طبقہ خوش اور مطمئن نہیں ہے چنانچہ مسٹر چندا ورکر موجودہ پریذیڈنٹ نیشنل لبرل فیڈریشن نے ۹ فروری کو مدراس کے ایک جلسہ عام میں اپنی تقریر کے دوران میں کہا کہ وہ ان لوگوں کی نکتہ چینی نہیں کر سکتے ہیں جو مسٹر امری کی نسبت یہ کہتے ہیں کہ وہ ہندوستان کے ساتھ سچائی نہیں برت رہے ہیں۔ مسٹر چندا ورکر اور لبرل خیالات کے سب اصحاب اس جنگ میں برطانیہ کے پورے حامی و مددگار ہیں

نوآبادیوں کے طرز حکومت کا بار بار ذکر بھی اب پرانی بات ہو گئی۔ اسی لئے اس جلسہ میں رائٹ آنریبل مسٹر سری نواس شاستری نے یہ کہنا ضروری سمجھا کہ ہندوستان کو پرانے قسم کا ڈومینین اسٹیٹس درکار نہیں ہے بلکہ اسکی وہی حیثیت تسلیم ہونا چاہیئے جو جنگ کے بعد کناڈا افریقہ اور آئرلینڈ کو حاصل ہو۔ یہ ایک خاص نکتہ ہے جو مدبران ملک کو خاص طور پر اپنے نگاہ کے سامنے رکھنا چاہیئے مگر مصیبت یہ ہے کہ اسوقت ایک طرف مہاتما گاندھی عدم تشدد کے اصول پر حد سے زیادہ زور دے رہے ہیں دوسری طرف مسٹر جناح پاکستان کے سامنے کسی بات کو خاطر میں نہیں لا رہے ہیں مہاتما جی کی ہدایت کے بموجب انفرادی سول نافرمانی کی اسکیم اپنی پوری رفتار سے جاری ہے اور اس وقت ہزارہا آدمی جنگ کے خلاف معمولی نعرے لگانے پر گرفتار ہو کر جیل جا رہے ہیں۔ انمیں پانچ صوبوں کے وزیر اعظم اور انکے بائیس تیئیس ساتھی وزیروں کے علاوہ ملک کے بعض بڑے بڑے لیڈران بھی شامل ہیں۔ مسٹر جناح کئی کانفرنسوں میں پاکستان پر زوردار تقریریں کر چکے ہیں۔ اگر انکی بات قول فیصل سمجھی جائے تو مسلمانوں کی زندگی اسی پر منحصر ہے کہ ملک کے دو ٹکڑے کر دئیے جائیں حال میں انھوں نے لاہور کے کئی جلسوں میں اسی قسم کی تقریریں کی ہیں اسکے برعکس مسٹر شیام پرشاد مکرجی پریذیڈنٹ ہندو مہاسبھا کہتے ہیں کہ جبتک ہندوؤں کے دم میں دم ہے ملک کے دو علیحدہ علیحدہ ٹکڑے ہونے نہ پائیں گے مقبول سر سکندر حیات اس قسم کے خیالات عوام ملک کی زندگی کو زہریلا بنا رہے ہیں لیکن یہ بات ضرور قابل اطمینان ہے کہ شیعہ، مومن اور احراری جماعتیں پاکستان کی طرفدار نہیں ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اس سے بالآخر انکی تکلیفیں گھٹنے کے بجائے الٹی بڑھ جائینگی۔ مگر آئندہ کچھ ہو اسوقت لیڈروں کی باہمی مخالفت سے ملکی فضا بہت مکدر ہو گئی ہے چنانچہ سندھ کی حکومت میں مولانا آزاد نے ہندو مسلمانوں کا جو سمجھوتہ کرایا تھا مسٹر جناح نے اسکو کالعدم کر دیا اور اس دفعہ مردم شماری میں ہر طرف عجب طوفان بدتمیزی برپا رہا۔

عرض حال پچھلے حادثہ میں جن مہربانوں نے میرے ساتھ اظہار ہمدردی کیا ہے انکا شکریہ میں فرداً فرداً علیحدہ خطوط میں ادا کر رہا ہوں۔ میرے ذاتی حالات ابھی تک پورے طور پر معمول پر نہیں آئے ہیں اور شاید اب مشکل ہی سے وہ اطمینان قلب نصیب ہو جو میرے تقویت کا باعث تھا۔ بہرحال صبر و شکر کے سوائے چارہ نہیں۔ ان دنوں زمانہ کی اشاعت میں خلاف توقع جو بے ترتیبی ہو رہی ہے اسکے لئے بھی خواستگار معافی ہوں۔ (ایڈیٹر)

The ZAMANA. MARCH. 1941 Regd. No. A147

زمانہ

مرتبہ دیانرائن نگم، بی۔ اے،

جلد ۷۶	مارچ سنہ ۱۹۴۱ء	نمبر ۳

فہرست

قیمت سالانہ پانچ روپیہ

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

(نمونہ سات آنے)

یادگار حالی

مشہور رسالہ زمانہ کا دسمبر ۱۹۳۵ء نمبر شمس العلماء مولانا حالی کی صد سالہ سالگرہ کی یاد میں حالی نمبر کی حیثیت سے کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے جسمیں مولانا کے سوانحی حالات کے علاوہ ان کی نظم اور نثر پر متعدد تنقیدی مضامین درج ہیں۔ موجودہ زمانہ کے کئی نامور شاعروں اور انشا پردازوں نے اس کے لئے خاص مضامین لکھے ہیں جشن پانی پت کا بھی مفصل تذکرہ ہے کئی عکسی تصاویر بھی زیب رسالہ ہیں۔ غرض ہر حیثیت سے یہ پرچہ قابل قدر یادگار حالی نمبر کہلانے کا مستحق ہے۔

حجم ۱۰۴ صفحات قیمت ۱۲ ار علاوہ محصول

میری کہانی

پنڈت جواہر لال نہرو کی آپ بیتی کا ترجمہ نہایت سلیس اور شگفتہ زبان اور اصل انگریزی کی طرح زور بیان ہندوستان کی موجودہ سیاسی تاریخ پر ایک بے نظیر کتاب ہے جسمیں نوجوانوں کے قائد اعظم نے ہماری تحریکوں اور ہمارے رہنماؤں کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے کتاب کی ضخامت تقریباً گیارہ سو صفحات قیمت چار روپیہ للعہ

مالیات عامہ

مصنفہ جے۔ سی۔ کماریا ایم۔ اے بی۔ ایل۔ سی۔ ترجمہ مولوی قاضی محمد حسین صاحب ہندوستان کے موجودہ اقتصادی حالات پر مالیات عامہ نے جو کچھ اثر کیا ہے اسکا بیان اور ہمارے افلاس کے اسباب پر ایک دردناک تبصرہ۔ ان مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے یہ کتاب بڑی مفید ہے قیمت عہ

ملنے کا پتہ:۔ زمانہ بک ایجنسی کانپور

ہندوستان کا دل اُس کے دیہات میں ہے

اس دل کی دھڑکنیں

نوجوان جذباتی شاعر اور افسانہ نگار

احمد ندیم قاسمی کی شعری تصنیف

چوپال

میں دیکھئے۔ یہ چودہ افسانوں کا مجموعہ پنجابی دیہاتوں کے مناظر اور دیہاتیوں کی روحوں کی تصویروں کا البم ہے۔ جس کے متعلق مشاہیر کی آراء ملاحظہ فرمائیے۔

عبد المجید سالک۔ ندیم جو کچھ لکھتا ہے اپنے براہ راست مشاہدہ اور احساس سے لکھتا ہے اسکی نظر فطرت انسانی کی گہرائیوں کو بالکل بے نقاب دیکھتی ہے۔ اور وہ ہو بہو اُن کی عکاسی کر دیتا ہے۔ میرے نزدیک ندیم آئندہ دور کا بہترین شاعر اور افسانہ نگار ہے۔

امتیاز علی تاج۔ ندیم خود دیہات سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ کسی خارجی نقطہ نظر سے دیہات کو نہیں دیکھتا۔ بلکہ نہایت بے تکلفی سے دیہات کو دیہات کے نقطہ نظر سے منکشف کرتا ہے۔ اُردو ادب مستقبل کے ایک بڑے مصنف سے روشناس ہو رہا ہے۔

اختر شیرانی۔ ندیم کے تمام افسانے طبعزاد ہوتے ہیں اور اچھے بھی اُنہیں دیہاتی معاشرت کا خاص تجربہ ہے۔ اور یہ تجربہ اُن کے افسانوں کے حق میں معاون خاص ثابت ہو رہا ہے۔

کرشن چندر ایم۔ اے۔ آج سے آپ ہندوستان بھر کے افسانہ نگاروں کی صف اول میں ہیں۔ آپکے افسانے آرٹ اور رومان کا حسین ترین امتزاج ہیں۔

سعادت حسن ۔ اس قسم کے جذبات میں ڈوبے ہوئے افسانے اُردو میں بہت کم شائع ہوتے ہیں۔ آپکے ہاتھ plastic ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ افسانوں کے موضوع کو آپ نے صرف محسوس ہی نہیں کیا بلکہ چھو کر بھی دیکھا ہے۔ یہ خصوصیت ہمارے ملک کے افسانہ نگاروں کو نصیب نہیں۔

کتابت دیدہ زیب۔ چھپائی عمدہ۔ کاغذ نفیس

مجلد قیمت عہ

ملنے کا پتہ:۔ دار الاشاعت پنجاب لاہور

تصحیح

زمانہ بابتہ فروری ۱۹۳۸ء صفحہ ۱۰۰ پر کتاب Urdu Prose under the Influence of Sir Sayyad کے ملنے کا پتہ غلط چھپ گیا ہے۔ یہ کتاب محمد اشرف صاحب بک سیلر کشمیری بازار لاہور سے مل سکتی ہے۔

زمانہ

جلد ۷۶ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء نمبر ۳

اُردو ہندی کا قضیہ

(از خان بہادر مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی بی۔اے، او۔بی۔ای، وزیر ریاست کشمیر)

مرزا عظیم بیگ چغتائی بی۔اے، آیل ایل۔بی۔ نے اپنے ایک مضمون میں جو دسمبر سنہ ۴۰ء کے "زمانہ" میں "صحتِ الفاظ" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، مجھے مخاطب کیا ہے اور چند اُمور کی بابت جن کا تعلق زبان سے ہے استفسار کیا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ عربی اور فارسی الفاظ کی صحت اور اُن کے اعراب کا تعین ہمیں اُنھیں زبانوں کے اُصول کے مطابق کرنا چاہیئے، خود ہمیں تغیر و تبدل کا اختیار نہیں ہے۔

میں مرزا صاحب موصوف اور دیگر حضرات کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ میری یہ عرضداشت عام نہیں تھی بلکہ شعر و شاعری سے متعلق تھی جس میں ایک صاحب نے "ضرورت شعری" کا عذر پیش کیا تھا اور اس کی بنا پر خَیَام (ے بلا تشدید) اور تجزیّہ (ے مشدد) کو صحیح قرار دیا تھا اور جواز میں تنور کی مثال پیش کی تھی جو دراصل بتشدید نون ہے مگر عام طور پر اہل ایران بلا تشدید استعمال کرتے ہیں میری گزارش یہ تھی کہ فارسی یا عربی میں چند الفاظ کی بنا پر جو مستثنیات کا حکم رکھتے ہیں یہ امر بیجا نہیں کہ ہم اُن الفاظ کو نمونہ بنا کر ہر لفظ میں توڑ مروڑ شروع کر دیں۔

اول تو میری بحث شعر و شاعری (وہ بھی غزل) کی زبان تک محدود تھی، دوم جو کچھ میں نے عرض کیا تھا وہ فارسی زبان میں دخل در معقولات کے خلاف تھا، اس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ الفاظ زیر بحث اضافت کے ساتھ لائے گئے تھے، یعنی (مرزا صاحب کا تلازمہ قائم رکھتے ہوئے) فارسی

ہائیکورٹ کی مہر ثبت تھی۔ "تجزیۂ بہار" "بسمل خیام"

جہاں تک اُردو زبان کا تعلق ہے انشاؔ کا قول آج بھی ماننے کے قابل ہے کہ کسی زبان کا لفظ ہو جس ہیئت، جس تلفظ اور جس لہجے کے ساتھ اُردو میں داخل ہو گیا اُسی طرح درست ہے مثلاً "گرَم گرَم روٹی لاؤ" گرَم کی ر جو ساکن تھی متحرک ہو گئی، اس کے خلاف بولئے تو مُلّائیت کا الزام عائد ہو۔ مگر "دلِ گرْم" میں اگر وہی ر متحرک بولئے تو نرے جاہل سمجھے جائیے۔ ایسے الفاظ کی ایک طویل فہرست مرتب ہو سکتی ہے جو شکل، معنی یا تلفظ کے اعتبار سے عربی، فارسی یا ترکی میں کچھ تھے اور اُردو میں کچھ ہو گئے۔ مثلاً مجاز۔ عرصہ۔ خاطر۔ صحنک۔ مشروع۔ تنزیب۔ گلبدن تمش۔ بیگم۔ کچھ اکتوبر۔ اپریل۔ مئی۔ لالٹین۔ کارتوس^{لہ} وغیرہ ہی پر موقوف نہیں۔ اسی طرح ہندو بھائیوں کی یہ شکایت غلط ہے کہ مسلمانوں نے ہندی اور سنسکرت کے الفاظ کو مسخ کیا ہے اور عربی و فارسی زبانوں کے الفاظ پر یہ عمل نہیں کیا۔ آتش نے المضاعف کو المضاف بنا دیا اور نہ معلوم کتنی مثالیں ملیں گی۔

دراصل یہی سلوک ہندی والے عربی اور فارسی الفاظ سے کرتے رہے ہیں، اب منھ میں گھنگنیاں بھر لی ہیں: چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

(۱) مَیں تو تورے دامنواں (دامن) لاگی مہاراج
رام جھروکے بیٹھکے سب کا مُجرا لیت
جیسی جس کی چاکری ویسا اُسکو دیت

(مُجرا اور چاکری کا بدل ہندی میں نہیں تھا لہٰذا وہ الفاظ بجنسہ لے لئے)

(۲) نَرَم کلیاں (نَرْم کلائیاں)

(۳) شام گھونگھٹ پٹ کھولے جوراجوری (زورا زوری)

(۴) باجو بند (بازو بند) کُھل کُھل جائے۔

(۵) اُردو میں "ننگا مادر زاد" تھا، ہندی میں "مادر جاد" مفلس ہو گیا۔

جناب مرزا صاحب اگر اس روشنی میں اپنے ہندو احباب کے اعتراضات پر غور فرمائیں گے تو وہ بالکل بے بنیاد ثابت ہونگے۔ اگر یہ حضرات ہندی یا سنسکرت بولنا چاہتے ہیں تو شوق سے وچار۔ دلیش۔ وِواہ۔ وغیرہ بولیں۔ اُردو میں یہ الفاظ سوچ بچار (خالی بچار نہیں) دیس۔ بیاہ

لہ مرزا صاحب موصوف نے کارتوس کو کارٹرج کا مہنّد قرار دیا ہے حالانکہ یہ فرانسیسی لفظ کارٹوش کا مہنّد ہے۔ آثر

وغیرہ ہیں۔ گرام گاؤں۔ جل پانی۔ پربت پہاڑ۔ سب ہندی ہیں، مگر اُردو نے گرام۔ جل، پربت کو چھوڑ دیا اور اُن کے مرادفات کو لے لیا، سوائے چند مخصوص حالتوں کے۔

آخر میں مرزا صاحب موصوف نے اُردو، ہندی، اور ہندوستانی کا سوال بھی چھیڑا ہے میری رائے ہمیشہ سے یہ ہے کہ زبانیں دو ہی ہیں اُردو اور ہندی، ہندوستانی کوئی الگ زبان نہیں بلکہ ایک زمانے میں اُردو ہی کو ہندوستانی کہتے تھے۔ کچھ لوگوں نے اُردو اور ہندی کو سموکر ایک تیسری زبان بنانے کی کوشش کی ہے جو آدھا تیتر آدھا بٹیر کی مصداق ہے، اس کی ایک اچھی مثال مرزا صاحب کے دوست کا وہ خط ہے جو اُنھوں نے اپنے مضمون میں نقل کیا ہے۔ اس میں ایک طرف تو نیائے۔ سنگ۔ پرنتو۔ پکش۔ شبد۔ نیم اور پالن ہیں جن کی اُردو میں گنجائش نہیں اور دوسری طرف خوب۔ حال۔ حفاظت۔ اصل اور درستی ہیں جو ہندی سے میل نہیں کھاتے حالانکہ اِسی عبارت کو ہندی الفاظ قائم رکھتے ہوئے اور جو عربی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں نکالکر بھی سلیس اُردو میں لکھ سکتے ہیں، مثلاً:-

(نام نہاد ہندوستانی)	(اُردو)
خوب نیائے کرتے ہو	اچھی اُلٹی گنگا بہائی
سنگ لائے	ساتھ لائے
پرنتو	پر (لیکن) پھر بھی
پکش کی	پرکھ لی
حال تک	اب تک
درستی کرلی	ٹھیک کر لیا
حفاظت رکھی ہے	دیکھ بھال رکھی ہے
اُسی نیم کا پالن کرتے ہیں	اُسی ڈھرے پر چلتے ہیں۔

اُردو ہندی سے نکلی ہے اور وہی اُردو دلکش ہوگی جس میں فارسی اور عربی الفاظ کا میل کم ہو اُسی کے ساتھ اس میں اور دوسری زبانوں کے الفاظ قبول کرنے کی بھی صلاحیت ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہئیے کہ اُردو نے اپنا ایک مزاج قائم کر لیا ہے اور جب تک وہ ترکیب پیدا نہ ہوگی زبان مزا نہ دے گی۔

اُردو کے لئے عربی اور فارسی سے کہیں بڑھ چڑھکر ہندی جاننا ضروری ہے، مگر بدقسمتی سے سیاسی کشاکش نے اُردو ہندی کا جھگڑا کھڑا کر دیا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ دونوں زبانیں خراب ہو رہی ہیں۔

میرے نزدیک ہر ہندوستانی کا فرض ہونا چاہیئے کہ دونوں زبانیں سیکھے اور اُن کے ادب سے واقف ہو، ممکن ہے کہ اس طرح وہ سادہ اور عام فہم زبان وجود میں آئے جس کے لئے ہم آپ کوشاں ہیں اور جس کو سارے ہندوستان کی متفقہ زبان بنانا چاہتے ہیں۔ مگر بُرا ہو تعصب اور خودغرضی کا کہ ایک گروہ نے پہلے سے یہ جی میں ٹھان لی ہے کہ یہ زبان اُردو ہوگی جس میں بڑا حصہ عربی اور فارسی الفاظ کا ہوگا، اور دوسرے نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ ہندی ہوگی مگر سیاسی مصالح کی بنا پر نام ہندوستانی تجویز کیا ہے، کیونکہ خالص ہندی میں یہ دم نہیں اور ہندوستانی کے پردے میں فارسی اور عربی کے الفاظ خارج کرکے سنسکرت کے الفاظ داخل کئے جاسکتے ہیں۔ اصل لڑائی دو کلچروں یا تہذیبوں کا سوتیا ڈاہ ہے جو ایک دوسرے کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتیں۔ ایک مرجائے تو دوسرے کے کلیجے میں ٹھنڈک پڑے، چاہے کانی ہی ہوکے کیوں نہ جیئے۔

بحث کا ایک اور پہلو بھی ہے، میرے لڑکپن تک لکھنؤ میں اُردو کا کوئی شاعر مستند نہیں مانا جاتا تھا اگر ہندی میں بھی موزوں نہ کرسکے۔ بچّوں کو پہیلیاں اور مکرنیاں بجھائی جاتی تھیں جو عموماً ہندی میں ہوتی تھیں۔ عورتوں کو بلا مبالغہ ہزاروں کہاوتیں ہندی کی یاد ہوتی تھیں۔ بچے سُنتے تھے اور خود بخود ہندی سے آشنا ہو جاتے تھے۔

انگریزی تعلیم کا چرچا شروع ہوا، وہ صحبتیں افسانہ ہوگئیں اور زبان سے بیگانگی برتی جانے لگی حتی کہ سوچتے بھی انگریزی میں تھے۔ زمانے نے پھر پلٹا کھایا۔ اب جو اپنی زبان کی طرف متوجہ ہوئے تو بالکل کورے تھے! خانہ پُری کو انگریزی کے بے تکے ترجمے کئے یا مصری اخباروں سے فارسی اور عربی کے جُملے مستعار لیئے۔ اُردو ہندی کا قضیہ اس جہالت کا (جس کو خود فریبی نے فارسی دانی کا ذوق سمجھا) پردہ پوش ہوگیا۔ غالب پرستی کا رواج بھی اسی بنا پر ہوا۔ کیونکہ خالص ٹکسالی زبان پر عبور ہونا اور اُس کی نزاکتیں سمجھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ یہ آہی نہیں سکتی جب تک اُن لوگوں کی آغوش میں تربیت نہ پائی ہو جن کے نام پر زبان کا سکہ چلتا ہے۔

بالکل یہی حشر ہندی کا ہندوؤں کے ہاتھوں ہوا، اس کی بھی گھلاوٹ اور شیرینی تشریف لے گئی اور اُنکی جگہ بھدے اور بجھبر سنسکرت شبدوں نے لیلی، جن کا ماخذ کوئی نہ کوئی انگریزی سنسکرت ڈکشنری ہوتی ہے۔

آئیے ہم سب ہندوستانی اُردو اور ہندی دونوں زبانیں پڑھیں اور اپنے بچوں کو پڑھوائیں، دونوں زبانوں کو اپنی زبان سمجھیں اور ایک دوسرے کا گلا گھونٹنے کے بجائے دونوں کو اپنی اپنی جگہ مالا مال کرنے کی کوشش کریں۔ ہمارے بزرگ یہی کرتے رہے اور اسی نے ان دونوں زبانوں کو اتنا دلکش بنادیا تھا مگر اب کیا حالت ہے؟ گریبان میں منہ ڈالکر اپنے دل سے پوچھیے۔

بسنت

(سیّد محمود محمور رضوی اکبرآبادی، بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی)

بہارِ نو کی آمد کی چلو تیاریاں دیکھیں — نئی رت کی زمانے پر مسرّت باریاں دیکھیں
چلو نیرنگِ قدرت کی طرب آثاریاں دیکھیں — پھر اس عالم میں اپنی روح کی بیداریاں دیکھیں
دلِ مسرور میں اک موج سی اٹھتی ہے تھم تھم کر
چلو رنج و تعب قرباں کردیں لطفِ موسم پر

اسی موسم کا ہے عالم میں سامانِ پذیرائی — کہ ذرّے ذرّے سے پیدا ہے درسِ ناشکیبائی
سنبھل اے دل کہ پھر برپا ہوا طوفان برنائی — تکلف برطرف جوشِ جنوں لے تیری بن آئی
مرا چاکِ گریباں تیرا ممنونِ صد احساں ہے
خوشا یہ دن کہ تو ہے اور دامانِ بہاراں ہے

چمن میں رنگ و بو کی انبساط افزائیاں دیکھو — گلوں کی نکہتیں سونگھو چمن آرائیاں دیکھو
شبابِ نورسیدہ کی نئی انگڑائیاں دیکھو — بسنتی ساریوں میں حسن کی رعنائیاں دیکھو
زمستاں نے چھپا رکھے تھے جلوے کامرانی کے
بہار آئی تو چونکے نیند سے فتنے جوانی کے

قیامت ہے گلابی سردیوں کا دل فزا موسم — دلوں میں جوش اٹھتا ہے کبھی بیجا، کبھی پیہم
ادھر وہ چاند سا مکھڑا، جوانی کا ادھر عالم — وہ دزدیدہ نظر کی ہر بہانے پرسشِ کم کم
بسنتی ناز اگر ایسی لگاوٹ سے لبھائے گا
تو میرا حوصلہ بھی بڑھ کے تارے توڑ لائے گا

ہوا میں امتزاجِ کیف و بوئے روحِ مینا ہے — نوید اے مے گساری ہر نفس لبریزِ صہبا ہے
دلوں میں شدّتِ جوشِ طرب سے حشر برپا ہے — لنڈھاؤ، چور ہو، بہکو، الاپو، سب گوارا ہے
نکالو ولولے جی بھر کے موسم کی اجازت ہے
جو جھجکے کافرِ نعمت نہیں مردودِ فطرت ہے

فضا معمورِ نکہت ہے نفس میں نشہ ہے شامل نہیں شورش خرد کی بیخودی کی راہ میں حائل
بدن کا آج ایک ایک رونگٹا ہے رقص پر مائل رہے قابو طبیعت پر یہ مشکل ہے بہت مشکل

وفورِ کیف سے ہر ولولہ شاداب ہوتا ہے
ہوا چھو کر نکلتی ہے تو دل بیتاب ہوتا ہے

مزاج شوق گرمایا دلوں میں تقویت آئی رگوں میں خون دوڑا آرزو پر تازگی چھائی
نویدِ زندگی کیسا نشاطِ زندگی لائی کہ فرطِ زندگی سے خود تماشا ہے تماشائی

زمیں والے بہک کر حریت کی گت بجاتے ہیں
اسی سازِ طرب سے عرش والے سُر ملاتے ہیں

نیا انداز ہے قدرت کے لطفِ بے محابا میں بپا ہے بزمِ عشرت جلوت چشم تماشا میں
لبِ ساحل بسنتی عکس لہراتا ہے دریا میں زمیں نے پھاگ کھیلا ہے چمن میں دشت و صحرا میں

نگاہیں لوٹ ہیں رُت کی جوانی کی گھلاوٹ پر
نئی سرسوں کے دھانی بن بسنتی مسکراہٹ پر

متاعِ ہوش بیچو، عقل کھو دو، وار دو تن من یہ موقع ہے بہارِ فتنہ گر کا لوٹ لو جوبن
نہ آئے گی نظر پھر سال بھر یہ حیلہ جو پُرفن جوانی کا بہانہ ہے، مچل کر تھام لو دامن

غنیمت ہے اسی حیلے کوئی حسرت نکل جاتی
دل آجائے تو آجائے جوانی پھر نہیں آتی

زمیں پر مسکراہٹ سی ہے سبزے کی لطافت سے نگاہیں کھلکھلا اٹھتی ہیں سرسوں کی طراوت سے
بہا جاتا ہے دل گویا لپٹ کر موجِ نکہت سے شعورِ زندگانی چونک اٹھا ہے جوشِ وحشت سے

پیامِ زیست لائی ہے جنوں کی کار فرمائی
نئے انداز سے میرے وطن میں یہ بہار آئی

شاعر

انسان و خداوند کے مابین ہے شاعر اک جنس درخشندہ و پائندہ و بیدار
ملتی ہے ازل سے جسے احساس کی دولت فطرت جسے کرتی ہے عطا جذبۂ خود دار

جبریل کی پرواز، پیمبر کی رسائی
قرآن کی عظمت، دلِ فرعون کا انکار

(بشیر) رسا عثمانی

اُردو زبان اور صحّتِ الفاظ

(از منشی شیام موہن لال صاحب جگر بریلوی ، بی۔ اے)

جب اُردو کا خاکہ تیار ہوا اور روز بروز اُس کی دلفریباں طبیعتوں کو اپنی طرف مائل کرنے لگیں تو اُس کی ادبی حیثیت کی بھی بنائیں قائم ہو چلیں۔ کئی ابتدائی دَور گذر جانے کے بعد اُردو کے ایسے ایسے شیدائی پیدا ہوئے جنھوں نے ایک طرف اس کے خدوخال کو سنوارا اور رنگ وروپ کو نکھارا اور دوسری طرف اس میں وہ وہ باب کھولے جو رفتہ رفتہ وسیع میدانوں میں تبدیل ہو گئے۔ سودا۔ میر۔ آنندرام مخلص سرب سُکھ دیوانہ وغیرہم وہ بزرگ تھے جنھوں نے اُردو کی دلآویزیوں میں چار چاند لگا دیے۔ اور اُس کی محبت کو دُور دُور تک عام کردیا۔ ان کے بعد آنے والوں نے انھیں سے اپنے چراغ جلائے اور اردو کی خدمت کے لئے اپنی زندگیاں وقف کردیں۔ اس تمام خدمت گزاری وسرگرمی کے طفیل مذاق میں صحت اور صفائی بھی پیدا ہوتی گئی جو تمام تر فارسی کا قالب بنکر ادبی معیار کے نام سے مشہور ہو گئی۔ متقدمین نے جو ذخیرۂ تصنیفات ترکہ میں چھوڑا اُس میں اُن کے جانشینوں کو ایک بڑا انبار سقیم وغیر معتدل نظر آیا اس انبار میں کچھ قدیم الفاظ اور ترکیبیں تھیں اور کچھ معنوی بے عنوانیاں، ان لوگوں نے اس کی اصلاح شروع کی، صدہا ہندی الفاظ کو داخل متروکات کیا۔ جس پر کچھ زمانہ ہوا اِسی رسالہ میں کچھ عرض کر چکا ہوں یہاں صرف اتنا عرض کردینا مناسب مقام ہے کہ بہت سے متروکات ابتک اساتذہ استعمال کرتے چلے آتے ہیں۔ اِس لئے کہ اول تو ان الفاظ نے اپنا خاص محل ومصرف پیدا کرلیا ہے دوسرے کسی لفظ یا ترکیب کا بہت دنوں تک استعمال نہ ہونا یا کسی خاص شخص کا اُسے متروک کردینا اُس کے ترک کی کافی وجہ نہیں۔ بہت سے الفاظ کو غیر معتبر اور غلط بتایا گیا لیکن یہ سب بظاہر اُردو سے وابستگی کا نتیجہ تھا سیاسی، تمدنی، یا مذہبی اغراض ومقاصد پر مبنی نہ تھا بلکہ اس زبان میں ابھی یہ صلاحیت واہمیت ہی پیدا نہ ہوئی تھی، کہ اس کو کسی قومی یا سیاسی ادارے کی حیثیت سے دیکھا جاتا۔ یہ تمامتر کوشش وکاوش اس لئے تھی کہ بھاشا اور عربی فارسی کی قیدوں سے آزاد ہو کر اُردو اپنی علحدہ ہستی قائم کرلے اس مقصد کے لئے اُردو جس زبان سے مراد تھی وہ سید انشا کی ذیل کی عبارت سے کافی طور پر متحقق

و متعین ہو جاتی ہے:-

"مخفی نماند کہ ہر لفظے کہ در اُردو مشہور شد عربی باشد یا فارسی یا ترکی یا سُریانی یا پنجابی یا پوربی از روئے اصل غلط باشد یا صحیح آں لفظ لفظ اُردو ست اگر موافق اصل مستعمل است ہم صحیح و اگر خلاف اصل است ہم صحیح، صحت و غلطی آں موقوف بر استعمال نہ پذیرفتن در اُردو است۔ زیرا کہ ہرچہ خلاف اُردو است غلط است گو در اصل صحیح باشد و ہرچہ موافق اُردو است صحیح باشد گو در اصل صحت نداشتہ باشد"[1]

اُردو الفاظ کی یہی خصوصیت اس زبان کو ایک طرف عربی فارسی سے اور دوسری طرف بھاشا سے ممیز کرتی ہے۔ اور اس کو ایک مستقل زبان کی نوعیت عطا کرتی ہے۔ عربی فارسی کے بے شمار الفاظ ایسے ہیں جو اُردو میں آکر اپنی ماخذ زبانوں سے بالکل مختلف مفہوم ادا کرتے ہیں، اسی طرح ان دونوں زبانوں کے باہمی امتزاج سے، نیز ہندی اور عربی فارسی کے پیوند سے صدہا الفاظ ایسے وضع ہو کر رائج ہو گئے جو اپنی اصل زبانوں سے بالکل انوکھی چیز ہیں، اور اُن کے صرفی و نحوی قواعد سے آزاد، جیسے جمعدار کہ اصل میں جامہ دار تھا، یا افراتفری کہ اصل میں افراط و تفریط تھا، یا ہندی میں بیکل۔ چلمن۔ لہو وغیرہ، ایسے بدلے کہ اب اُن کی اصل کا پتہ لگانا بھی دشوار ہے۔ اس عمل کے لئے نہ کوئی خاص قاعدہ مقرر تھا نہ ہو سکتا ہے۔ درحقیقت زبان کے بنانے والے جمہور ہوتے ہیں جو اپنی طبعی مناسبت اور لب و لہجہ کی سہولت کے لحاظ سے موقع و محل کے مطابق الفاظ تلاش کرتے ہیں۔ اگر مروجہ لفظوں نے اُن کی ضرورت پوری نہ کی تو وہ انھیں میں سے کسی کو توڑ مروڑ کر ایک نیا لفظ ڈھال لیتے ہیں، یا کوئی بالکل نیا لفظ گڑھ لیتے ہیں جس کی مثال آگے آئیگی۔ شاعر اور ادیب اس ذخیرے کو سانچے میں ڈھالتے اور مستقل حیثیت دیتے ہیں، اس کا تجزیہ کر کے اصول و قواعد مرتب کرتے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ پہلے قواعد و ضوابط منضبط ہو جائیں اُس کے بعد اُن کے مطابق زبان گڑھی جائے۔ ابتدا میں اسی قسم کے سیکڑوں لفظوں اور ترکیبوں نے اُردو کے ذاتی وجود کی بنائیں قائم کیں اور اُس کی انفرادی زندگی کے قیام و ارتقا میں امداد دی۔ جب زباندان ظہور میں آئے انھوں نے اس تمام ذخیرے کو ایک خاص معیار پر جانچا اور پرکھا۔ اور اس معیار کے اجزا کو قواعد فن یا اصول فصاحت و بلاغت کا نام دیا۔ یہ تمام سرمایہ اس کسوٹی پر پورا نہیں اُتر سکتا تھا اس لئے بہت سا حصہ متروکات کی ذیل میں آگیا اور بہت سا مستعملات میں رہا۔ آخر الذکر حصہ میں سے چند ایسے الفاظ پیش کرتا ہوں جنکی

---

[1] دریائے لطافت صفحہ ۲۴۱

ساخت میں دو زبانیں شامل ہیں:-

گلچھرے۔ گلچلا۔ جیب کترہ۔ گلے باز۔ شوربے چٹ۔ منہ زور۔ جوشیلا۔ دل لگی۔ اگن بوٹ۔ ڈھلمل یقین۔ ایماندار۔ لمبردار۔ درشنی جوان۔ گھر گدا۔ ڈنڈا کش۔ کاپی نگار۔ چھاپہ خانہ۔ ڈولی بردار۔ سمجھ دار۔ چوکیدار۔ تھانہ دار۔ گاڑی بان۔ رتھ بان۔ بوباس غل غپاڑہ جگت باز۔ پنشندار۔ چٹھی رساں۔ چھت گیری۔ جگت استاد۔ وغیرہ وغیرہ۔ جگت استاد کے اُصول پر امیر مینائی نے "جگت آشنا" لکھا۔

ان لفظوں نے اُردو کی مستقل ہستی ہی قائم نہیں کی بلکہ ان میں جو اشتقاقی و اختراعی اصول جاری و ساری ہیں اُن سے اُس کی ترقی کا میدان بہت وسیع ہو گیا، اور یہی ان الفاظ کی سب سے بڑی خصوصیت و غایت ہے۔ اگر ان اصولوں کی پیروی سلیقہ اور تمیز کے ساتھ کی جائے تو اُردو ادبی تفریح کی چہار دیواری سے نکل کر واقعی ایک قومی زبان بن جائے اور اس کی ترقی کی راہ میں کوئی رکاوٹ حایل نہ ہو۔ بعض ادیبوں کو اس کا احساس ہے، لیکن اکثریت اُن حضرات کی ہے جنھوں نے زبان کے اشتقاقی و اختراعی راستوں کو بند کر کے اُصول و قواعد کو اس قدر تنگ اور محدود کر دیا ہے کہ زبان کے بنیادی سرمایہ میں اضافہ ہونا تو درکنار خود وہ سرمایہ ہی نابود ہوتا چلا جاتا ہے، اور اس سختی سے زبان کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ وہ جنس جو ایک زمانہ میں نہایت پسندیدہ اور ہر دلعزیز تھی اب قابل نفرت ہو گئی۔ جب زبان سے وہ ذخیرہ نکل گیا جس پر اُس کی مستقل حیات و بقا کا دار و مدار تھا تو یہ کمی اور کمزوری پورا کرنے کے لئے عربی فارسی کی عجیب الخلقت ترکیبیں جا و بیجا طور پر ٹھونسی جانے لگیں۔ لیکن زبان کے وارث یعنی جمہور کے قوائے ذہنی کب ان شکنجوں میں جکڑے جا سکتے تھے اور کب ان کی طبیعتیں نفسیاتی اُصول کے خلاف "مقیاس الحرارت" "قرطاس ابیض" "مقاطعۂ جوعی" "طیارہ" وغیرہ کی متحمل ہو سکتی تھیں۔ وہ تو برابر تھرمامیٹر، وہائٹ پیپر، بھوک ہڑتال اور ہوائی جہاز ہی بولتے اور لکھتے ہیں اور بولتے اور لکھتے رہیں گے۔ پھر اگر اُردو لکھنؤ کے گلی کوچوں دلی کی گلیوں، یا چند علماء کی درسگاہوں یا شاعروں اور ادیبوں[1] کے حلقۂ تلمذ، یا ارباب فن کے ایوان ادب تک ہی محدود رہتی یا صرف پامال و ہوسکارانہ حسن و عشق کی داستان سرائی تک اس کا عمل و تصرف رہتا یا محض تفنن و تفریح ہی کا مشغلہ بنی رہتی تو ضرور یہ پابندیاں جو اُصول و فن کے نام سے عائد کی جاتی ہیں نبھ سکتی تھیں۔ مگر زمانہ نے کروٹ لی اور ایسی کروٹ لی

[1] مرقع ادب صفحہ ۳۲

کہ ساری دنیا کی کایا پلٹ ہوگئی۔ ایسا انقلاب آیا کہ زمین و آسمان بدل گئے۔ معجزات سائینس نے تمام عالم کو حیرت میں ڈال دیا۔ دنیا کے کاروبار، مقاصد و مشاغل میں بھی عظیم تغیر پیدا کردیا۔ نئی نئی ایجادات و اختراعات نے انسانی لبستی میں چکا چوند کردی۔ ہر مقام کے سیاسی و معاشرتی نصب العین میں بھی حیرت انگیز تغیرات رونما ہوئے۔ ضعیف اور بے لبس ہندوستان اس عالمگیر اور طوفانی ہنگامہ سے کب بچ سکتا تھا۔ اس پاک سرزمین کا وہ معصوم باشندہ بھی جو کسی زمانے میں عبادت و گوشہ نشینی کو معراج حیات و مقصود زندگی جانتا تھا اپنے پرانے معتقدات سے بغاوت کر اٹھا، اور زمانہ کے متواتر تلخ تجربوں نے اس پر ثابت کردیا کہ خلوت پسندی و تنہا نشینی کی میعاد ختم ہوگئی۔ اس کی زندگی اب تمام دنیا کی مجموعی زندگی کا مستقل جزو بنکر ہی قائم رہ سکتی ہے اور دنیا کی مجموعی زندگی ہزاروں قسم کی سرگرمیوں پر مشتمل ہے، ان تمام سرگرمیوں میں نہ سہی چند در چند ایسی ضرور ہیں جن میں استقلال و خلوص کے ساتھ حصہ لئے بغیر ہندیوں کو چارہ نہیں۔ ایسی زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے لازم ہے کہ زبان کو بھی لامحدود وسعت دی جائے، اس لئے کہ کوئی قوم اپنی مکمل زبان کے بغیر ترقی نہیں کرسکتی۔ یہاں کسی ایک زبان کا مقتضیات وقت کے مطابق مکمل ہونا درکنار ابھی یہی نہیں معلوم ہے کہ کونسی زبان اس سخت کشمکش اور آزمایش کے وقت ہمارا ساتھ دے سکے گی۔ بہرحال کوئی زبان بھی ہو زمانے کے ساتھ ساتھ اُسے چلنا پڑیگا اور انگریزی سے بھی اُسے مدد لینا ہوگی۔ جمہور اپنی روز افزوں ضرورتوں کے مطابق ہر صنعت و حرفت فن اور مشغلہ میں صدہا الفاظ مروجہ زبانوں سے گڑھتے چلے جاتے ہیں جن کا سکہ بازاروں، کارخانوں ملوں، کلبوں، تفریح گاہوں اور اخباروں میں رواں ہے۔ مثال کے طور پر ایک لفظ "رتیائی" پیش کرتا ہوں جو کانپور کے ملوں میں کام کرنے والوں نے Night shift کے لئے گڑھا اور خوب گڑھا ہے۔ اسی قبیل سے "ہوائی جہاز" بھی ہے اور چھپر دانی بھی۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ رتیائی سے بہتر Night shift کے لئے کوئی دوسرا لفظ عربی فارسی کے قاعدوں سے وضع نہیں کیا جاسکتا اگر اس میں شک ہو تو کسی عربی فارسی کے عالم کا امتحان لے لیا جائے۔

کسی زمانے میں اساتذہ اپنے خلوت خانوں میں بیٹھے بیٹھے زبان پر احکام صادر کیا کرتے تھے اُن کے شاگرد اور شاگردوں کے شاگرد ان احکام کی پابندی پر جان دیتے تھے۔ اُس وقت اردو کی غرض و غایت ایک تفریحی مشغلے سے زیادہ نہ تھی، اب ملک کو ایسی زبان کی ضرورت ہے جو اس سرزمین کی گوناگوں خصوصیتوں کو محفوظ و قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ زمانے کے مطابق ہر قسم کی

ترقی کا آسان وسیلہ بن سکے۔ ظاہر ہے کہ وہ قانون زبان جو خلوت خانوں میں بیٹھکر مرتّب کیا گیا تھا اس قسم کی زبان کا ساتھ نہیں دے سکتا، اور تنگ اور سخت بندشوں میں رہ کر کوئی زبان وہ خدمت انجام نہیں دے سکتی جس کی اب ہمارے ملک کو ضرورت ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کا اب یہ فرض ہے کہ زبان کی جکڑبندیوں کو ڈھیلا کریں، نئے الفاظ اور ترکیبوں کا جو سرمایہ داخل ہورہا ہے اُس کو قومی ضروریات کا مفید ثمرہ اور ارتقائے قومی کا لسانی وسیلہ سمجھیں، ادب میں اُس کی صحیح جگہ متعین کریں، ادب و شعر کو جمہور کی عام بول چال اور گھریلو زندگیوں کے مطابق بناکر ہر دلعزیز بنائیں جس سے شعر و ادب عوام کی رہنے بسنے کی سب حالتوں کی اصلاح کا ذریعہ بن سکیں، اُن کی سماجی دلچسپیوں کو بہتر بنا سکیں، ان میں کشمکش حیات کے مردانہ مقابلہ کی قوت پیدا کریں۔ زندگی کے مقاصد سے خبردار بنائیں، مختصر یہ کہ جو تمام ملکی و قومی زندگی کو بہ حیثیت مجموعی بلند کر کے مضبوط ہموار اور پاکیزہ بنائیں۔ یہ تمام مقاصد آسان اور گھریلو زبان کے بغیر پورے نہیں ہوسکتے، اور یقیناً اس زبان سے یہ مہم سر نہیں ہوسکتی جو بات بات پر زبان کاٹے اور قدم قدم پر بیڑیاں ڈالے اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ اگر ہر شخص کی بولی زبان میں داخل کرلی جائے تو زبان چوں چوں کا مُربّہ بن کر رہ جائے۔ اس کا سب سے پہلا جواب یہ ہے کہ اُردو متعدد زبانوں کا مرکب ہونے کے باعث چوں چوں کا مربّہ تو ہے ہی بنکر کیا رہ جائیگی۔ دوسرے یہ کہ ہم کو ضرورت ایسی ہی زبان کی ہے جو تمام بولیوں کی قایم مقام ہو اور جو دیہاتوں میں بسنے والے کسانوں کے لئے بہ نسبت شہریوں کے زیادہ سودمند ہو۔ چند شہر والے اپنے مرقّع کمروں میں آرام سے بیٹھکر غالب، آتش، داغ وغیرہم کے دیوانوں کا لطف حاصل کیا کریں لیکن عوام کو اس سے کیا فائدہ ہے۔

اِن تمام باتوں کے باوصف میرا یہ بھی مطلب نہیں کہ خواہ مخواہ ہر غلط سلط لفظ کو جو عوام میں رائج ہو زبان کا معتبر جزو مان لیا جائے، یا ادب کی حدود ہی مٹادی جائیں، صرف ضرورت یہ ہے کہ ان حدود کو وسیع کردیا جائے جو بہت سے پُرانے قواعد توڑے بغیر ناممکن ہے۔ لیکن ہو یہ رہا ہے کہ ہمارے اربابِ فن بہت سے پُرانے سکّوں کو جو صدیوں سے رائج ہیں نام نہاد قواعد و ضوابط کی گرفت میں لاکر زبان کے خزانے سے خارج کررہے ہیں اور عجیب عجیب ہیئت کی ترکیبیں اُن کی جگہ لے رہی ہیں جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا۔ یہ کیوں ہورہا ہے اس پر مفصل بحث ہندی، اُردو ہندوستانی کے عنوان سے اِسی رسالہ میں اپریل ۱۹۳۵ء میں کی جاچکی ہے۔ آگے چلکر کچھ ایسے الفاظ پیش کئے جاتے ہیں جو متقدمین کے عہد سے اب تک زبان کا ٹکسالی سکّہ بنے ہوئے ہیں،

مگر عربی فارسی کے دلدادہ صرف ونحو کے قواعد یا لغت کے ماتحت ان کو اُردو سے خارج کر دینے پر مُصر ہیں، اور چاہتے ہیں کہ یہ زبان ہماری مرضی کے مطابق رواج پائے، یہ ممکن ہے یا نہیں، ملکی ضروریات ثابت کر رہی ہیں۔ بہر حال یہ ظاہر ہے کہ ان ضوابط و قواعد نے ان اساتذہ فن کے ہاتھ میں ایک ایسا آلہ ضرور دیدیا ہے جسے وہ معیار کے نام سے استعمال کر کے دور دُور تک اپنا رُعب بٹھائے ہوئے ہیں اور جس تصنیف اور مصنف کو چاہتے ہیں مجروح و مضروب کر دیتے ہیں۔

قانونِ قدرت کی راہیں انسانی تصرفات سے باہر ہیں، اور جب کسی سرزمین میں انقلاب آتا ہے تو وہاں کی قوم نیا جنم لیتی ہے، پُرانے اداروں میں تبدیلی ہو جاتی ہے اور زبان بھی پُرانی بندشوں سے آزاد ہو جاتی ہے، اور نئی نئی ضروریات، نئے نئے مشاغل و مقاصد کے پُورا کرنے کے لئے نیا چولا بدلنا شروع کر دیتی ہے۔ اس بارے میں اجارہ دارانِ فن کے لئے ایران کی مثال بہت سبق آموز ہے ایران میں آجکل جو زبان رائج ہے اُس کو وہاں کی پُرانی زبان سے کوئی علاقہ نہیں۔ اگر اب سے پچاس برس ہی پہلے کے ادبا و شعراء وہاں آج نمودار ہو جائیں تو نہ اُن کی بولی کوئی سمجھے نہ وہ کسی کی اب جو زبان وہاں رائج ہے اُس میں ہزارہا لفظ ایسے ہیں جو اپنے پُرانے لغوی یا اصطلاحی معنی کی حدود سے آزاد ہو کر نئے نئے مطالب و مفہوم ادا کر رہے ہیں اور ہزاروں لفظ نئے ایسے وضع ہو گئے ہیں جو نہ پُرانے لغات میں ملتے ہیں نہ پُرانی صرف و نحو کے قاعدوں میں آتے ہیں۔ ان سب کو جدید فارسی کا نام دیا جاتا ہے۔ خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا اب میں وہ الفاظ پیش کرتا ہوں جو اب تک شاعروں اور انشا پردازوں کا دستور العمل بنے ہوئے ہیں اور جن کا قلع قمع کر دینے کے لئے اہل فن ہر وقت شمشیر بکف بیٹھے رہتے ہیں۔ ان الفاظ کو دو ذیلوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(۱) وہ الفاظ جو عربی فارسی میں کچھ معنی رکھتے ہیں اور اُردو میں کچھ اور، لیکن اب ان کا استعمال عربی یا فارسی معنی کے خلاف غلط بتایا جاتا ہے۔

(۲) وہ الفاظ اور ترکیبیں جو اپنی ساخت میں غلط بتائی جاتی ہیں۔

۱۔ وہ الفاظ جو عربی فارسی میں کچھ معنی رکھتے ہیں اور اُردو میں کچھ اور، لیکن اب ان کا استعمال عربی یا فارسی معنی کے خلاف غلط بتایا جاتا ہے:-

لفظ	عربی یا فارسی معنی	اُردو معنی	سند
دِقت	باریکی	مشکل	"یہاں سے اُس نے مصر کا رُخ کیا ..... جو بے دقت اُسکے قبضہ میں آگیا" (محمد حسین آزاد۔ سکندر اعظم) ع "بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس" اکبر الہ آبادی

لفظ	عربی یا فارسی معنی	اردو معنی	سند
			اُن میں اور شعر میں حدِ فاصل قائم کرنا مشکل ہے، زیادہ دقت اس لئے ہوتی ہے۔" (شعر العجم حصہ ۴)
اوقات	جمع وقت	حیثیت	"میں تو غریب آدمی ہوں ٹکے کی اوقات" (جام سرشار ۲۹۱)
عرصہ	میدان	مدت	"اور عرصۂ دراز کے بعد ان کی زبان کو ادبی شان نصیب ہوئی" (تنقیدات عبد الحق ۲) کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے (غالب) ع توان بہ عرصۂ چل روز یا دو ماہ رسید (نعمت خاں عالی)
سرپرست	خادم	مربّی	"یہ بھی تجویز ہے کہ اس انجمن کی سرپرستی میں ایک رسالہ اُردوئے معلیٰ کے نام سے جاری کیا جائے" (تنقیدات عبد الحق) "اور کتاب کو اُردو کے سب سے بڑے سرپرست اعلیٰ حضرت... کی طرف نسبت دیکر نظام اُردو کے نام سے موسوم کردیا۔" نظام اُردو صفحہ ب از آرزو لکھنوی
معانی	صیغہ اسم فاعل بمعنی عفو کنندہ	چھما	"طمع کے بعد معانی مانگنا یہ اور ستم ہے" نوٹ:۔ قابل معانی اور طالب معانی عام طور پر رائج ہیں۔
فرصت	نوبت	آرام پانا	"ہر خط میں آلام و امراض گوناگوں کا رونا اور قلتِ فرصت کا رونا ہے" (تنقیدات عبد الحق) "فرصتِ ناز بھی پہروں نہیں ملتی افسوس وہ ہے مصروف ستمہائے فراواں کرکے (داغ)
مضطر	بے اختیار، بیچارہ	بے قرار	"اُس کی چتون پھرتے ہی محفل میں، ہلچل پڑ گئی مضطرب کو مضطرب مضطر کو مضطر لے چلا (داغ) ع۔ ساتھ اپنے اُنھیں لے کے گئی بانوئے مضطر" (انیس) مضطر ہوں چین آئے پہ آتا نہیں مجھے رونے میں منہ تیرا نظر آتا نہیں مجھے (انیس) ع۔ دیکھتے جاؤ ہمارے دلِ مضطر کے مزے (داغ)
فضا	فراخی زمین و کشادگی صحن	بہار۔ حالت	اک داغ رہ گیا ہے سو وہ بھی مٹا مٹا دل میں بہارِ عشق کی اب وہ فضا نہیں (داغ) ع سُنا جو کرتے تھے وہ باغ پُر فضا ہے یہ (چکبست) ع۔ ازل میں تھی جو فضا اُس کا یادگار ہے یہ (چکبست) "شاید آپ کو میں نے لفظ فضا کی تحقیق لکھدی تھی، اگر اُردو کے معنی لئے جائیں تو بہار کے ہو سکتے ہیں" شوق قدوائی مرقع ادب صفحہ ۹۱

لفظ	عربی یا فارسی معنی	اُردو معنی	سند
محرم	واقف کار	انگیا	کسی کی محرمِ آبِ رواں کی یاد آئی حباب کے جو برابر کبھی حباب آیا
مشکور	شکر کیا گیا بستودہ	شکر کرنیوالا	ایک نے مجمعِ سادات میں بڑھکر یہ کہا گرچہ اِس لطف کے مشکور ہیں ہم خاک نشیں (شبلی) " نہ یہ کہ سارا پنجاب خاص اُردو کی واقفیت کے لئے ان کا مشکور ہو۔" (منشورات از کیفی دہلوی) ع نہ ہو مشکور کیوں ہر بندہ لطفِ کبریائی کا (ذکی تلمیذ غالب) " مدت کے بعد نامہ سعادت آیا ممنون و مشکور کیا" (امیر مینائی مرقع ادب صہ ۱۲)
منّت	احسان کردن	خوشامد	اُس نے مانی نہ کوئی میری بات منتیں کر کے بات بھی کھوئی (داغ)
تکلیف	کار فرمودن	دُکھ	شبِ فراق کی تکلیف سے یقین آیا مقابل اس کے جہنم میں عیش ہوتا ہے (داغ)
خاطر	دل	آؤبھگت مدارات	" وہ جوہری بچہ ڈٹا ہوا ہے اور بڑی خاطریں ہو رہی ہیں" (جام سرشار صہ ۳۶) " اُن کی خاطر داری اور دلجوئی میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا۔" (محمد حسین آزاد۔ سکندر اعظم) ع "نانا کی طرح خاطرِ اُمت تھی زیادہ" (انیس)
مرتبہ	درجہ و رتبہ	بار۔ دفعہ	اُردو میں اس کا استعمال دفعہ کے معنی میں عام ہے اور اب فارسی میں بھی اس معنی میں عام ہو گیا ہے۔ جیسے ذیل میں " از انجملہ نہ سال و ہشت ماہ مرتبۂ اول حکومت نمود و بعد ازاں پانزدہ سال در کابل و قندھار مرتبۂ ثانی ...." (از زینت الزماں ذکر جلوس ہمایوں)
غصہ	اندوہ	غیظ۔ کرودھ	قلزم کے بدن میں لگ گئی آگ منہ پر غصہ سے آ گئے جھاگ (منشی جوالا پرشاد برق) غم و غصہ و رنج و اندوہ و حرماں ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے (آتش)
روزگار	زمانہ	روزی	" ایک لڑکی جو بھتیجے کی گود میں، ابھی تک کوئی صورت روزگار نہیں اور نہ کہیں سے اُمید ہے۔" (شریف زادہ از مرزا رسوا لکھنوی)

میں نے صرف چند الفاظ مثال کے طور پر پیش کئے ہیں اور جن مقامات پر خط کھینچ دیئے ہیں اُن سے یہ بھی ثابت ہے کہ یہ اور اسی قبیل کے دیگر الفاظ اپنے اُردو مفہوم میں صرف مفرد استعمال نہیں ہوتے بلکہ تراکیب فارسی کے ساتھ بھی ان کا استعمال جائز ہے۔

۲۔ وہ الفاظ اور ترکیبیں جو اپنی ساخت میں غلط بنائی جاتی ہیں۔

لفظ	کیفیت	سند
مُنشّی	نشہ سے بنایا گیا بمعنی نشہ کرنے والی چیز	"مس کو کسی مُنشّی دوا سے بیہوش کر کے بھگالے گیا" (جام سرشار ص ۲۴۹)
نشیلی	نشہ سے رسیلی کے انداز پر بنایا گیا	ع۔ یوں نشیلی ایسی متوالی نہیں (داغ)
زہریلی	زہر سے رسیلی کے انداز پر بنایا گیا	"معشوق کی آنکھ کو زہریلی شعرائے فارس نے بھی کہا ہے" (شوق قدوائی مرقع ادب ص ۸۵)
عادی	عادت سے بنایا گیا	ع ہم جو عادی ہو گئے دشنام کے (داغ) ع قفس میں بند ہیں جو آشیاں کے تھے عادی (چکبست) تیغ ابرو کی زباں عادی ہوئی بات سیدھی بھی جو کی ٹیڑھی ہوئی (خواجہ وزیر)
سوائے	اصل لفظ سوا ہے	"سوائے وہی ڈینگ اور کوئی بات نہیں" (جام سرشار ص ۵۲) کہا ہے کس نے کہ غالب برا نہیں لیکن سوائے اسکے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیئے (غالب) "اُن سب نسخوں میں سوائے ایک کے یہ شعر یوں لکھا ہے" (تنقیدات عبدالحق ص ۲)
بہتات	عربی فارسی میں کوئی لفظ نہیں	دل ہمارا مورد آفات ہے رنج کی بہتات ہی بہتات ہے (داغ) گونا گوں تتلیوں کی بہتات کب ہوتی ہے جب ہو خوب برسات (صفی لکھنوی)
بدحواسی	فارسی میں بے حواسی مستعمل ہے	کیا کہوں وجہ بدحواسی کی ہوش پرّاں ہیں رنگ محفل سے (داغ) ع سمجھ لیا ہے ستمگر نے بدحواس مجھے (داغ) بجائے مے دیا پانی کا اک گلاس مجھے سمجھ لیا مرے ساقی نے بدحواس مجھے (سرور جہان آبادی)

لفظ	کیفیت	سند
		"شیریں کہ ان کی بدحواسی اور غم و غصہ اور رنگ چہرہ کے پرواز پر بغور نظر ڈال رہی تھی" (جام سرشار صـ۱۴۱-۱۴۰)
تلاشی متلاشی	ترکی لفظ تلاش سے بنے ہیں	نکلا ہے تلاشی سے فقط اِک درم داغ یار دل کو مرے دل پہ ہزاروں کا بھرم تھا (داغ) ع جلوت میں یوں ہے وہ کہ تلاشی ہے چشمِ شوق (داغ) شب کو خیال رہتا ہے اِک رشکِ حور کا ظلمت میں دل مرا متلاشی ہے نور کا (آتش)
بادشاہت	یہ لفظ جاہت کے طریقہ پر بنا ہے	"یہ بہار دیکھ کر اپنے رفقا سے مخاطب ہوا اور کہنے لگا کہ معلوم ہوتا ہے کہ ایشیا میں اسی عیش و عشرت کا نام بادشاہت ہے" (محمد حسین آزاد۔ سکندرِ اعظم)
رہائش	فارسی حاصل مصدروں کے انداز پر رہنا سے بنا۔	انشا کی دریائے لطافت میں صـ۱۳۱ پر اور رسالہ صبح اُمید میں جس کے ایڈیٹر حضرت چکبست تھے صفحہ ۱۳ و ۱۴۳ پر استعمال ہوا ہے۔
قدیمی	اصل لفظ قدیم ہے	"میں ہوں آپ کا قدیمی دعاگو" (امیر فقیر مرقع ادب صـ۲۴)
صافی	اصل لفظ صاف ہے	آسودہ باد خاطرِ غالب کہ خوئے اوست آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را (غالب) آبِ صافی بنکے شکل ابرِ تر ہے برستا قطرہ قطرہ خاک پر
بہبودی	اصل لفظ بہبود ہے	"لیکن زبان کی بہبودی اُن کی یا کسی کی خوشنودی پر فوقیت چاہتی ہے۔" منشورات از کیفی دہلوی صـ۲۷)
شروعات	شروع سے بنایا گیا	"یہاں سے اُردو کی تنسیق و تنظیم شروع ہوئی جو اُنیسویں صدی عیسوی کی شروعات تک برابر جاری رہی" (منشورات از کیفی دہلوی صـ۲۶)
تبادلہ	عربی فارسی میں کوئی لفظ نہیں	"تبادلۂ خیالات کے بعد اُنھوں نے مجھی کو اس کام کیلئے تجویز کیا" (نظام اُردو از آرزو لکھنوی صـ خ) (نوٹ۔ یہاں تبادلہ ترکیب اضافی کے ساتھ ہے۔)
سکرر	مکرر کی مثال پر بنایا گیا	"نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ایک قافیہ کو مکرر سکرر باندھنا پڑتا ہے" (شعر الہند صـ۲۰۹ از عبدالسلام ندوی)
بلا	بے اور لا دونوں بمعنی نہیں ہیں اور دونوں دو زبانوں کے جزو ہیں اسلئے بلا غلط کہا جاتا ہے	"اُردو کی اصل وہی زبان مانی جا سکتی ہے جس کے الفاظ سے بلا شرکت غیرے کوئی ایسا جملہ بن جائے جسے اُردو کہہ سکیں (نظام اُردو از آرزو لکھنوی صـ۵)

لفظ	کیفیت	سند
		ع "بلا وقت میں بن جاؤں تری سانس" (اکبر الہ آبادی)
لاچار	لا عربی اور چار فارسی۔ اسلئے غلط کہا جاتا ہے۔	قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا ذوق ع۔ اک فقط رنگ پہ قابو نہیں لاچاری ہے (چکبست)
ازحد	بمعنی از حد زیاد	"اس رنگ کو لیلے کے باپ نے گوارا نہ کیا قیس کو ازحد رنج ہوا" (شریف زادہ مرزا رسوا ص۵۹) بہت نادم خجل ازحد نہایت منفعل ہو گے اگر منہ ڈال کر دیکھو گے تم اپنے گریباں میں حکیم محمد انور گرچہ ازحد ہوں گنہگار مسلمان تو ہوں پیچھے پیچھے مرے دوزخ میں بھی جنت آئی (داغ)
بُو باس	ایک لفظ فارسی ایک ہندی	بو باس غیر ہے تیرے پھولوں کے ہار میں (داغ) (نوٹ۔ اضافت کے ساتھ بو باس ہے)
پھبتی نما	ایک لفظ ہندی ایک فارسی	"جدید لیکن پھبتی نما تشبیہیں بھی اس رنگ کا ایک لازمی جزو ہیں" (شعر الہند ص۳۰۲)
سمجھدار	"	"سمجھدار آدمی سے زیادہ کہنا دیوانہ پن ہے" (منثورات از کیفی دہلوی ص۲۲۶)
تابعدار	تابع کے ساتھ دار زائد ہے	ع غمخوار باپوں کی رہیں ماؤں کی تابعدار تم" (حالی)
ڈھلمل یقین	ایک لفظ ہندی ایک عربی	"ملکہ عمل سے بھی ضعیف الاعتقاد اور ڈھلمل یقین ہیں" (منثورات از کیفی دہلوی ص۱۶۲)
فوق البھڑک	ایضاً	وہ مس فوق البھڑک لباس زیب تن کئے اتراتی پھرتی تھی" (جام سرشار ص۲۳۹)
لگاوٹ باز	ایضاً	"انکھڑیاں لگاوٹ باز" جام سرشار ص۲۳۹
گراں ڈیل	ایضاً	"وہ بڑے گراں ڈیل اژدہوں کی طرح منہ کھول کر" (جام سرشار ص۲۱۶)
بیساختہ پن	ایضاً	زیور کی نہیں حاجت ہرگز بھی حسینوں کو معشوق وہ ہے جس میں بیساختہ پن ہوگا (داغ)
گل تکیہ	گل مخفف گال ہندی اور تکیہ عربی	وہ گل تکیہ ہے مرے مرقد میں رکھنا معطر ہو جو زلف مشکبو سے (داغ)

لفظ	کیفیت	سند
دیوانہ پن	ایک جزو فارسی ایک ہندی	وہ رہگذر وہ کوچہ وہ در مجھ سے کب چھٹا کچھ ہوش کا لگاؤ بھی دیوانہ پن میں ہے (داغ)
لاابالی پن	ایک جزو عربی ایک ہندی	"مگر اُن کی بے پروائی اور لاابالی پن سے کچھ بعید نہیں" مرقع ادب صہ ۳۲
دانہ پانی	ایک جزو فارسی ایک ہندی	قفس ہی میں جائیں گے ہم گلستاں سے ہمارا یہاں دانہ پانی نہیں ہے (داغ)
غلطی	اصل لفظ غلط ہے	غلطیہائے مضامیں مت پوچھ لوگ نالہ کو رسا باندھتے ہیں (غالب)
طرفدار	بمعنی جانب دار استعمال ہوتا ہے ایک لفظ عربی ایک فارسی ہے	دل روزِ حشر اُس کا طرفدار ہوگیا بگڑا مرا معاملہ جھوٹے گواہ سے (داغ) ع طرفداری قیامت میں کریگا پاسباں میری (داغ) ہم تو دیوانے ہیں مجنوں کی کہے جائیں گے ہیں حسیں آپ طرفداریٔ لیلےٰ کیجئے یہاں طرفداری بہ ترکیب اضافی ہے (محوی لکھنوی)
پاٹ دار	ایک جزو ہندی ایک فارسی	اے ہمصفیر میری فغاں کا ہے رنگ اور آواز پاٹ دار کہاں عندلیب کی (داغ)

"قریب المرگ" کو اس لئے غلط بتایا جاتا ہے کہ قریب عربی ہے اور مرگ فارسی، اور عربی قاعدہ سے دونوں کا پیوند لگایا گیا۔ اگر اس لفظ کو زبان سے خارج کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ کسی کے اختیار کی بات نہیں تو حدِ امکان اور حور و غلمان وغیرہ کو بھی نکالا جائے، ان میں بھی ایسا ہی نقص ہے لفظ تو ہیں عربی اور جوڑ فارسی اضافت وعطف سے لگایا گیا ہے، لیکن ان کو کوئی نہیں نکال سکتا۔ میں عرض کرتا ہوں کہ ایسے الفاظ اور ترکیبوں کو عربی فارسی قاعدے سے جانچا ہی کیوں جائے۔ انھیں عربی فارسی کا ایسا پیوندی جزو کہئے جو اردو ہے ورنہ اگر ایسے الفاظ کو غلط ہی کہہ دیا جائیگا تو بہت سا سرمایہ ایسا خارج ہو جائیگا جس کی جگہ کوئی دوسری چیز پُر نہ کر سکے گی۔ اور خارج کہاں سے ہو جائیگا صرف علما و بلغا کی تحریرات سے جمہور تو اسی لفظ سے اپنا کام نکالیں گے جو موقع و محل کے مطابق ہوگا۔ اور ان الفاظ نے اپنا خاص محل و مصرف زبان میں پیدا کر لیا ہے جیسا کہ اوپر کہا گیا۔ اُردو تو اُردو فارسی میں بھی ایسے الفاظ اور ترکیبیں ملتی ہیں جن کا ایک جزو عربی ایک فارسی ہے، مثلاً خیمہ گاہ۔ ارادت کیش۔ عقیدتمند۔ یہی نہیں بلکہ فارسی نے بہت سے ہندی الفاظ کو بھی اپنا لیا، مثلاً بادلہ پوش۔ چیرہ بند۔ جھکڑ۔ گلاب۔ فارسی جو

ایک اجنبی زبان تھی اُس نے ہندی کے ساتھ یہ سلوک کیا، اور اُردو کے ٹھیکہ دار اپنی ہی زبان کے الفاظ کے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہیں۔ اسی سلسلہ میں اضافی و عطفی تراکیب کے متعلق بھی کچھ ضمناً عرض کرنا مقتضائے مقام ہے۔ اُردو میں اضافت کے لئے "کا" "کے"، "کی" ہیں اور عطف کے لئے "اور" اور فارسی میں یہ کام زیر زیر پیش اور واؤ سے لیا جاتا ہے۔ فارسی میں اضافی و عطفی تراکیب سے دو اغراض پورے ہوتے ہیں، ایک تو کلام میں کسی قدر اختصار ہو جاتا ہے اور دوسرے ترکیب میں چستی آجاتی ہے، اس کے لئے اب تک یہ قاعدہ مقرر ہے کہ ہندی لفظ کے ساتھ فارسی اضافت یا عطف نہ آنا چاہیئے۔ مثلاً "موسم برسات" یا "رنگ و روپ" کہنا صحیح نہیں، لیکن زبان کی روز افزوں ترقی واضح کر رہی ہے کہ اُسے اس قید سے بھی آزاد کرنا ہوگا اور اس کے ادب کو زندگی کی نئی روشوں کے سانچے میں ڈھلنا ہوگا۔ اور ضروریات جو ترکیبیں اختراع کرنے پر مجبور کر رہی ہیں وہ ارباب فن کے غم و غصہ کے برخلاف ادبی خیزو بن کر رہیں گی۔ کس کی مجال ہے جو ذیل کی ترکیبوں کو اور ایسی ترکیبیں صدہا ہیں، جمہور تو دُور تعلیم یافتہ طبقہ ہی کے استعمال سے روک سکے۔

ممبران لیگ۔ کارکنان کانفرنس۔ ممبران بورڈ۔ جلسۂ بورڈ۔ مالکانِ مل۔ افراد کمیٹی۔ طلبائے کالج۔ کاریگران مل۔ افسران محکمہ۔ لیڈران ملک و قوم وغیرہ وغیرہ۔ جب فارسی، عربی اور عربی عربی الفاظ فارسی کی اضافی و عطفی تراکیب کے ساتھ رواج پاکر مستند ہوگئے، جیسے حدامکان اور حور و غلمان اور ہندی فارسی الفاظ میں بھی افصح الفصحا داغ نے اضافت لگانے میں تعصب نہیں برتا جیسے "بو باس غیر" تو انگریزی اور ہندی لفظوں کے ساتھ کیوں تعصب برتا جائے۔ دورِ حاضر کے وسیع النظر ادیبوں اور شاعروں نے اس کا احساس بھی کر لیا ہے اور اس کی مثالیں بھی پیش کر دی ہیں، حضرت عزیز لکھنوی مرحوم فرماتے ہیں:-

نارا کیجئے گا صحبتِ رندانِ کالج سے غضب ہی ڈھائیں گے اے شیخ یہ پڑھے میں انگریزی

اکبر الہ آبادی کے یہاں اس قسم کی مثالیں متعدد ملتی ہیں۔

اسی سلسلہ میں ایک بات اور یاد آگئی وہ بھی عرض کر دوں، اُردو میں عربی فارسی کے بہت سے ایسے لفظ مستعمل ہیں جن کے اول میں حروف متحرک ہیں، جیسے کَلَمہ۔ صَدَقہ۔ اَرَنی حَرَکت۔ بَرَکت وغیرہ۔ نثر میں تو یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ الفاظ صحت حرکت کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں یا نہیں، مگر نظم میں جہاں ایسا کوئی لفظ حرف دوم کے سکون کے ساتھ آیا کہ ارباب فن نے فوراً فتویٰ لگا دیا غلط غلط۔ اگر تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ فارسی میں بھی یہ پابندی توڑ دی گئی ہے مثلاً

موسیٰ ازیں جام تہی دیدوست شیشہ بکہ پائیہ ارنی شکست

چناں باد شمشیر دستے فشاند کہ در خرمن عمر برکت نماند (قدسی)

صائبا خجلت سائل بزمینم در کرد بے دری کرد بمن آنچہ بقاروں زر کرد (صائب)

زبس خوشش حرکت دشیرین ادا بود کہ گرمید ادتیزی خوشنما بود (مُلا فوقی)

اوپر کے شعروں میں ارنی، برکت، خجلت، حرکت بہ سکون حروف دوم آئے ہیں۔ اُردو کے شعرانے بھی یہ تصرف جائز رکھا ہے، میرکو تو یہ کہے ہوئے زمانہ گزر گیا ؎

"خدا کے واسطے کلمہ بتوں کا پڑھ زاہد"

لیکن ناواقفان اصول زبان مدعیان فن بنکر عام رواج کے خلاف احکام صادر کرتے ہیں اب اُن سے کیا کہا جائے، سوا اس کے کہ اُردو کے اساتذہ کے یہاں سے شہادتیں پیش کرکے اُن کی مزید تشفی کردی جائے۔

اشک خجلت کسی میکش کے جو دوزخ میں گریں اوس پڑ جائے دہکتے ہوئے انگاروں پر (داغ)

تعلیم کا شور ایسا تہذیب کا غل اتنا برکت جو نہیں ہوتی نیت کی خرابی ہے (اکبر الہ آبادی)

یکایک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت بڑھا جانب بوقبیس ابر رحمت (حالی)

ع سر دینے میں سبقت کہیں کرتے ہیں وفادار (انیس)

ہاتھوں کو جوڑتی ہوں میں یا شاہ بحر و بر شفقت کی اُس کے حال پہ ہر دم رہے نظر (انیس)

شاعری میں اِن قیدوں میں اور بھی اضافہ کردیا گیا ہے، مثلاً حروف علت کا دبنا، تعقید، ترکیب اضافی وعطفی میں اعلان نون، یائے مشدد کا آنا، وغیرہ وغیرہ۔ جس پر کبھی کسی دوسری فرصت میں کچھ عرض کیا جائے گا۔

کلامِ مدہوش

(از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش ایم۔اے)

زندگی کا ترانہ

پڑے غم جو تجھ پر اُٹھاتا چلا جا
غمِ عشق کھا اور کھاتا چلا جا
تڑپتا ہوا تلملاتا چلا جا
رہِ زیست کو جگمگاتا چلا جا

یہی زندگی کا مری ہے ترانہ
یہی زندگی کا مری ہے فسانہ

نہ کر غم سے خالی تو دل کا پیالہ
بنا لختِ لختِ جگر کو نوالہ
لہو سے رچا زندگی کا شوالہ
جلا خون اور کر دے اِس میں اُجالا

یہی زندگی کا مری ہے ترانہ
یہی زندگی کا مری ہے فسانہ

مِٹا دردِ دل، دردِ دل کو بڑھا کر
جما نقشِ ہستی، تو ہستی مٹا کر
جو مرنا ہے تو مر قیامت اُٹھا کر
تو دنیا سے جا ایک دنیا بنا کر

یہی زندگی کا مری ہے ترانہ
یہی زندگی کا مری ہے فسانہ

مجھے خستہ دیکھا تو کوئی پکارا
ٹھہر جا ٹھہر جا!!! ٹھہر جا!!! خدارا!
نہ ٹھہرا نہ ٹھہرا میں ہمت نہ ہارا
میں تھا عشق کی شیر مردی کا مارا

یہی زندگی کا مری ہے ترانہ
یہی زندگی کا مری ہے فسانہ

جلنا ہے ابھی اور

رکھ حسن کے شعلوں سے نہ ٹھنڈک کی اُمید
قلبِ شرر افشاں! تجھے جلنا ہے ابھی اور
ان عشق کے شعلوں ہی میں جل بھُن دلِ کمبخت
اے شعلہ بداماں! تجھے جلنا ہے ابھی اور

چمکی نہیں قسمت ابھی برگشتہ ہے تقدیر
ہاں اے دلِ سوزاں! تجھے جلنا ہے ابھی اور

تو سوز سے زنجیرِ تمنّا ہی گلا دے
موقوف یہ حرماں! تجھے جلنا ہے ابھی اور

یہ چھوٹتی ہمت نہیں اچھی، نہ ہو بزدل
جلنے سے گریزاں! تجھے جلنا ہے ابھی اور

آرام پسندوں کی ہے تقلید بُری چیز
ہو اس پہ ہی نازاں تجھے جلنا ہے ابھی اور

جیتے ہیں اسی طرح سے جانبازِ محبت
رہ اس پہ ہی خنداں تجھے جلنا ہے ابھی اور

اپنے کو جلا حُسن پر آئے نہ مگر آنچ
اے اُس کے نگہباں! تجھے جلنا ہے ابھی اور

کچھ غم نہیں جلنا جو پڑے تا دمِ آخر
اے موت کے مہماں! تجھے جلنا ہے ابھی اور

جلنا ہے بہر کیف تجھے مر کے بھی مدہوش
اے سوختہ ساماں تجھے جلنا ہے ابھی اور

غمِ بیکسی

بہانہ نکالا بہت کچھ خوشی کا
نہ آئی ہنسی تھا وہ غم بیکسی کا

مری زندگی بھی عجب زندگی تھی
نہ تھا ایک بھی جس میں لمحہ خوشی کا

ہر اِک سانس میں منھ کو آیا کلیجہ
جیئے پر نہ آیا مزہ زندگی کا

جو مِٹنا بھی چاہا تو ہم مٹ نہ پائے
گلہ ہے اگر کچھ تو ہم کو اِسی کا

زمانے کے غم کو غمِ عشق دیکر
طریقہ نکالا نیا غم کشی کا

ہے گو ٹمٹمائی ہوئی شمع ہستی
ابھی ہے مگر حوصلہ زندگی کا

بتائیں یہ ہم رازِ مدہوش کس کو
کہ احسان ہم پر بڑا ہے کسی کا

قطعہ

ناکامِ عشق رہ کے ہوس میں جو پڑ گئے
شل ہو کے رہ گئیں رگیں عیش و نشاط کی

ہم نے بغیرِ عشق نہ نعمت کوئی چکھی
یہ طنطنہ رہا کہ یہی احتیاط کی

فرطِ خوشی سے ڈر ہے نہ ٹوٹے ربابِ دل
کتنی تنی ہوئی ہیں رگیں انبساط کی

———

صحیح اُردو

(از سید محمد اظہار الحسن صاحب بی۔اے۔ ایل ایل بی)

کہتے ہیں خواجہ آتش کے مطلع

دختر رز مری مونس ہے مری ہمدم ہے   میں جہانگیر ہوں وہ نور جہاں بیگم ہے

پر کسی نے اعتراض کیا کہ ہمدم کے ساتھ بیگم کا قافیہ غلط ہے کیونکہ اصلی لفظ ترکی میں بگُم ہے۔ آتش مرحوم نے جواب دیا "میں نے اُردو میں شعر کہا ہے، ترکی میں کہوں گا تو بگُم لکھدوں گا"۔ سید انشانے بھی اپنی مشہور تصنیف 'دریائے لطافت' میں صحیح اُردو کا معیار یہ بتایا ہے:۔

"چھپا نہ رہے کہ ہر لفظ جو اُردو میں مشہور ہوتا ہے وہ عربی ہوگا یا فارسی یا ترکی یا سُریانی یا پنجابی یا پوربی اصل کے اعتبار سے غلط ہو یا صحیح، وہ لفظ اُردو کا لفظ ہے۔ اگر اصل کے مطابق استعمال ہوتا ہے تو بھی صحیح ہے اور اگر اصل کے خلاف ہے تو بھی صحیح ہے۔ کیونکہ اس کی صحت اور غلطی اُردو میں استعمال ہونے پر موقوف ہے۔ جو کچھ اُردو کے خلاف ہے غلط ہے خواہ در اصل صحیح ہی کیوں نہ ہو، اور جو اُردو کے مطابق ہے صحیح ہے خواہ در اصل ٹھیک نہ ہو۔"

اسی کسوٹی پر غلط العام فصیح ہو جاتا ہے۔ اس لئے صحیح اُردو کے جانچنے کے لئے ایرانی ہائی کورٹ کی نظیروں کی ضرورت نہیں، اس کی سند اہل زبان کا روزمرہ ہے۔ قانون داں اصحاب جانتے ہیں کہ اکثر ہندوستانی مقدمات کے طے کرنے میں انگریزی عدالتوں کے فیصلوں سے بھی مدد لی جایا کرتی ہے۔ چونکہ برطانوی ہندوستان کے اکثر قانون انگلستان کے نمونہ پر بنائے گئے ہیں، اس لئے انگلستان کی عدالتوں کی رائے پر استدلال کرنا ایک حد تک جائز ہے، لیکن اگر خود مقامی ہائی کورٹ کی نظیر کسی مسئلہ پر موجود ہو تو پھر انگریزی عدالتوں کے فیصلے قابل پابندی نہیں رہتے۔ بالکل یہی اصول زبان کے معاملہ میں کام کرتا ہے۔ اگر اُردو کے اہل زبان کسی لفظ کو ایک خاص صورت یا معنی میں استعمال کرتے ہیں تو وہ مستند ہے۔ ایرانی یا عربی اساتذہ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن اگر کسی خاص لفظ کے بارے میں اُردو کے

ؔ لائق مضمون نگار نے اس ترجمہ کے ساتھ اصل عبارت بھی حاشیہ میں لکھدی ہے۔ چونکہ یہ عبارت اسی پرچے میں ایک دوسرے مضمون میں آگئی ہے اس لئے اس کو یہاں پر دوبارہ درج نہیں کیا گیا۔ (ا۔ ز)

اہل زبان اصلی زبان کے اساتذہ سے اختلاف نہیں رکھتے تو پھر مؤخر الذکر سے سند حاصل کرنے میں کیا مضائقہ۔

ہر زندہ زبان دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپناتی رہتی ہے۔ اور اگر یہ سلسلہ بند ہو جائے تو پھر زبان کی زندگی معلوم۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ الفاظ بجنسہ شامل کر لئے جاتے ہیں، لیکن اکثر ان میں تراش خراش کر کے اپنی پسند کے مطابق بنالیا جاتا ہے۔ اب اگر اس قسم کے الفاظ کو کوئی شخص ان کی اصلی صورت میں استعمال کرتا ہے تو وہ در اصل غلط زبان بولتا ہے۔

آجکل بعض اُردو لکھنے اور بولنے والے اکثر الفاظ کو اُن کے اصلی تلفظ سے ادا کرنا پسند کرتے ہیں خواہ وہ تلفظ اُردو میں رائج ہو یا نہ ہو۔ شاید وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان لفظوں کو بدلی ہوئی شکل میں استعمال کرنے سے ان کی اصلی زبان کی واقفیت پر حرف آتا ہے، لیکن یہ غلط فہمی ہے جس سے صرف اُنکی اُردو دانی کی قلعی کھلتی ہے اور کچھ نہیں۔ اور یہ کچھ عربی، فارسی یا سنسکرت ہی کے الفاظ پر منحصر نہیں انگریزی جاننے والے ادیب انگریزی لفظوں کو بھی اُن کی اصلی شکل میں لکھتے اور بولتے ہیں۔ رپورٹ کو اُردو میں 'رپٹ' بنایا گیا تھا، اکبر الہ آبادی کہہ گئے ہیں:-

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں کہ اکبر ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں

سکریٹری کو غالب 'سکتر' کہا کرتے تھے، آج ہر وہ شخص جو انگریزی جانتا ہے رپٹ اور سکتر کو گنواری زبان سمجھتا ہے، حالانکہ سکتر اور رپٹ انگریزی لفظ نہیں رہے تھے اُردو ہو گئے تھے۔ ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ بھی خیال ہو کہ اُردو میں خود اپنے لفظ تو ہیں نہیں دوسری زبانوں سے مانگے ہوئے لفظ ہیں، مانگی ہوئی چیز پر تصرف کا کیا حق، لیکن یہ صحیح نہیں جب ہم دوسری زبان کے الفاظ اُردو تحریر یا تقریر میں استعمال کرتے ہیں تو در اصل ہم انھیں اصلی زبان کے الفاظ کی حیثیت سے کام میں نہیں لاتے بلکہ ہم اُنھیں اُردو کا جزو سمجھکر لکھتے اور بولتے ہیں۔ اسی نکتہ کو فراموش کر دینے سے یہ ساری خرابی پیدا ہوتی ہے اور صحت الفاظ کی دُھن اکثر زبان کو بگاڑنے کا سبب بن جاتی ہے۔

فارسی جدید میں ہزاروں انگریزی اور فرانسیسی الفاظ داخل ہو گئے ہیں، لیکن فارسی والوں نے ان کی صورت کو بدل دیا ہے۔ ڈاکٹر کی جگہ دکتور اسٹیشن کے لئے استاسیون اور ٹیلیگراف کے بجائے تلغراف وضع کیا گیا ہے۔ اسی طرح اُردو میں باٹل کو بوتل، لینٹرن کو لالٹین اور سپٹمبر کو ستمبر کہتے ہیں

له اُردو مصنفین کی بے راہ روی کی ایک مثال حال ہی میں ایک نو طبع کتاب میں دیکھنے میں آئی جس کے قابل مصنف نے اپنے نام نامی کے ساتھ پروفیسر کی جگہ ایرانی طرز پر "پروفیسور" لکھنا پسند کیا ہے۔ اسی طرح ایڈیٹر کی جگہ مختلف اصطلاحیں استعمال ہو رہی ہیں۔ حال میں ایک رسالہ میں ایڈیٹر کی جگہ لفظ "ناظر" چھپا ہے۔ (ا۔ ز)

گاؤں کو گرام، بسیوا کو ویشیا کہنا بھی اسی طرح غلط ہے جیسے لالٹین کو لینٹرن کہنا۔ شکر گزار کے معنی ہیں مشکور اور اطاعت کرنے والے کے لئے تابعدار اُردو لفظ ہیں، گو اصل میں ان کے معنی بالکل برعکس تھے۔ عربی میں اصل جڑ کو کہتے ہیں اس کی جمع اُصول ہے، اُردو میں اصل حقیقت کے معنی میں بولا جاتا ہے اُصول کو جمع سے واحد بنا لیا گیا اور معنی بالکل بدل دیئے گئے۔ صلوٰۃ جیسے پاکیزہ لفظ کی جمع اُردو میں صلواتیں بنائی گئی اور معنی میں زمین و آسمان کا فرق کر دیا گیا ہے۔ حور عربی میں جمع ہے اُردو میں واحد اور اس واحد کی جمع حوریں لکھتے ہیں۔ خاطر، عرصہ۔ اثر اور اسی طرح بیسیوں لفظ ہیں جن کے معنی بدل دیئے گئے ہیں۔ اب اگر عربی قواعد سے ان الفاظ پر قیاس کیا جائے تو اُردو کا ستیاناس ہو جائے۔

لیکن اس کے باوجود اُردو کا عربی اور فارسی سے جو گہرا اور فطری تعلق ہے اُس سے کون آنکھیں بند کر سکتا ہے۔ ہندی کے حامیوں کا اُردو پر یہ "الزام" یقیناً صحیح ہے کہ عربی فارسی جانے بغیر اُردو نہیں آسکتی۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ عربی فارسی کی مدد کے بغیر صحیح اُردو بولنا اور لکھنا ناممکن ہے۔ اس میں شک ہو تو جناب آرزو لکھنوی کی خالص اُردو کی کلیات 'سُریلی بانسری' اور سید ابوالقاسم کے وہ مضامین جو 'ہندستانی' اور 'ساقی' میں شائع ہوتے رہے ہیں دیکھئے۔ اُردو کی بنیاد ہندی پر رکھی گئی ہے۔ اس کے فعل، ضمیریں، اضافتیں، حروف ربط سب ہندی ہیں صرف اسمار اور صفات میں عربی اور فارسی کو دخل ہے، اور ان میں بھی ہندی الفاظ کی تعداد کچھ کم نہیں۔ پھر بھی یہ غلط نہیں کہ غالبؔ اور اقبالؔ کے کلام اور انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیوں کو سمجھنے کے لئے عربی اور فارسی کی تھوڑی بہت واقفیت ضروری ہے۔ اُردو کے جو ادیب عربی فارسی نہیں جانتے اُنھیں اپنی پوزیشن کے بارے میں تشویش کی ضرورت نہیں ہے۔ اُردو میں اُن کا وہی درجہ ہے جو انگریزی میں لاطینی نہ جاننے والے اہل قلم کا۔

یہ بات کہ عربی فارسی جانے بغیر اُردو نہیں آسکتی بجائے خود کچھ قابل اعتراض بھی نہیں عربی فارسی ہی پر کیا موقوف ہے، کیا آجکل کوئی شخص جو انگریزی نہ جانتا ہو ہندی اور اُردو کے روزانہ اخبارات کی زبان کو پورے طور پر سمجھ سکتا ہے۔ کیا ادبی ہندی سے لطف اندوز ہونے کے لئے سنسکرت کی اسی قدر واقفیت ضروری نہیں جتنی اُردو کے لئے فارسی کی۔

ہاں صحت زبان اور فصاحت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ فارسی اور عربی ہی کے الفاظ استعمال کئے جائیں۔

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

اس شعر میں ایک لفظ بھی فارسی عربی کا نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی اس کی لطافت اور فصاحت سے کون انکار کرسکتا ہے۔ "تحت قدم والدہ فردوس بریں ہے" سے "کہتے ہیں ماں کے پاؤں کے نیچے بہشت ہے" یقیناً زیادہ فصیح ہے۔ داغ کے بے مثل قبول عام کا راز اس کی زبان کی سادگی ہے سہل ممتنع کلام میں ہمیشہ نازک اور سبک الفاظ ہی استعمال ہوتے ہیں۔ آج بھی مشاعروں میں 'زبان' کے شعر بہت مقبول ہوتے ہیں اور یقیناً 'زبان' کے شعر عربی فارسی کے نامانوس الفاظ کا بوجھ برداشت نہیں کرتے۔

تعصب اور ہٹ دھرمی کسی قوم کے ساتھ مخصوص نہیں، نہ خلوص اور دیانت کسی ایک جماعت کا اجارہ ہے۔ جس طرح ہندی کے بعض رسالوں میں اُردو کلام شائع ہوتا رہتا ہے اور ہندی کے بعض مشہور ادیب اُردو سے دلچسپی رکھتے ہیں، اسی طرح اُردو والوں میں بھی ہندی کے پریمی موجود ہیں۔ عظمت اللہ خاں مرحوم، آرزو لکھنوی، اور ساغر نظامی کا کلام اس کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اُردو کے اکثر رسالوں میں ہندی گیت شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان نیک نیت بزرگوں کی کوششوں کو سراہنا ہمارا فرض ہے۔

لیکن ایک بات یاد رکھنے کی ہے، اُردو اور ہندی دو مستقل اور علیحدہ علیحدہ زبانیں ہیں، ممکن ہے کبھی یہ ایک ہی رہی ہوں یا ان کا مخرج ایک ہو، مگر اب تو مدت سے ان کے راستے علیحدہ علیحدہ ہوگئے ہیں۔ اُردو ہندی کو ملاکر ہندوستانی بنانے کی کوشش کرنے سے کیا فائدہ؟ زبان کے معاملہ میں کسی کی حکومت نہیں چلتی۔ رام رنگی اور پھلپال جیسے رنگین لفظ حکومت کے بل پر رواج نہ پاسکے زبان خود بنتی اور بگڑتی رہتی ہے۔ بدلتی ہے تو اتنی بدل جاتی ہے کہ پہچان نہیں پڑتی۔ چاسر کی انگریزی برنارڈشا کے عہد میں بہت کم لوگ سمجھتے ہیں۔ نصرتی اور بحری کی اُردو سمجھنے کے لئے فرہنگ کی ضرورت ہے اور وہ بھی نہیں ملتی۔ ہندی اور اُردو مل کر ہندوستانی تو کیا بنے گی، ہاں اُردو اور ہندی دونوں کی مٹی پلید ہو جائے گی۔ ہندوستانی بجائے خود کوئی زبان نہیں، اس کو زیادہ سے زیادہ بولی کہہ سکتے ہیں۔ غالب اور اقبال چکبست اور سرشار نے جس زبان میں لکھا ہے وہ اُردو ہے، ہندوستانی نہیں، اور یقیناً غالب و اقبال، چکبست و سرشار کو اُردو والے نہیں چھوڑ سکتے۔ ٹھیک یہی بات ہندی والے کہہ سکتے ہیں اور بالکل بجا طور پر۔ آج کل اکثر یونیورسٹیوں میں اُردو اور ہندی میں ایم۔اے تک تعلیم ہوتی ہے۔ ہندوستانی کے باضابطہ اور مستقل زبان ہونے کے دعویدار کیا ایم۔اے کے لئے ہندوستانی کا کورس تجویز کرسکتے ہیں۔ یقیناً جن کتابوں کا نام لیا جائیگا وہ اُردو ہونگی یا ہندی

رہ گیا آسان الفاظ کا استعمال، یہ موقع اور محل پر منحصر ہے: "کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں"

کہنے والا

"شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے"

بھی کہتا ہے۔ اور پھر آسان زبان کا معیار ہی کیا ہے۔ دلّی کے ریڈیو اسٹیشن سے جس زبان میں براڈکاسٹ ہوتا ہے اُس سے ہندی والے بھی ناراض ہیں اور اُردو والے بھی۔ راج نیتی اور سیاست تو ایک طرف، بعض لوگ "تو" اور "کی جگہ "تھا" "مگر" کے بجائے "پرنتو" لکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آسان زبان اسی کا نام ہے۔ 'ہندوستانی' کے سایہ کے پیچھے دوڑنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ اُردو اور ہندی دونوں کو اپنی اپنی جگہ ترقی کرنے کا موقعہ دیا جائے۔

اس سلسلہ میں مجھے ایک بات اور کہنی ہے۔ اگر زبان کو وسعت دینا منظور ہے تو بعض پرانے قاعدوں میں ترمیم کرنی پڑے گی۔ فارسی اور ہندی الفاظ کو مرکب نہیں کیا جا سکتا، اس کی کوئی معقول وجہ نہیں، ٹھیکیدار، ڈاک خانہ، گاڑی بان، اُگالدان اُردو میں پہلے سے مستعمل ہیں، بسنتی خیز ابھی دیکھتے ہی دیکھتے اُردو میں گھُل مِل گیا۔ مرزا غالب چھ ماہی لکھ گئے تھے، ہندستانی اکیڈمی نے تماہی بنایا اور قبول ہو گیا۔ مجھے تو کتب خانہ کے مقابلہ میں کتاب گھر بھلا معلوم ہوتا ہے۔ ٹکٹ لگے ہوئے لفافہ کو ٹکٹ چسپاں یا ٹکٹ زدہ کہنا بھی خوبصورت ترکیب ہے۔

فارسی اور ہندی لفظوں کے درمیان فارسی عطف و اضافت کا استعمال غلط سمجھا جاتا ہے، میرے نزدیک اس کے رواج دینے کی ضرورت ہے۔ اُردو کی غالباً سب سے بڑی خوبی اس کا اختصار ہے، فارسی حرف عطف "و" "اور" سے مختصر بھی ہے اور خوبصورت بھی۔ ہندی اتھوا ہندوستانی کے حامی تو سرے سے فارسی اضافت کے استعمال ہی کے خلاف ہیں۔ لیکن میری سمجھ میں ان کا اعتراض نہیں آتا۔ فارسی اضافت کے استعمال سے عبارت میں اختصار بھی پیدا ہوتا ہے اور چستی بھی۔ پھر کیوں نہ ہندی لفظوں کے ساتھ بھی اس کا استعمال جائز قرار دیا جائے!

انتظار

اونچی دیواروں کے اندر لوہے کی سلاخوں کے پیچھے بیٹھے ہیں مقفل کچھ انساں، انساں جو نہیں اک گنتی ہیں
اِن کے بھی کبھی دن آئیں گے، اِن پر بھی کرے گی لطف کبھی وہ اندھی پریاں جو قسمت کا تانا بانا بُنتی ہیں

جاگے گی کبھی سوئی قسمت، ٹوٹے گا کبھی قفلِ زنداں
کچھ بیکس روحیں آس لگائے عمر کی گھڑیاں گنتی ہیں

(زنیشا) زنانہ جیل

ابرِ نوبہار

(از حضرت سرشار کسمنڈوی)

مبارک مے پرستوں کو بہارِ نوبہار آئی
فضائے میکدہ بدلی، ہوائے خوشگوار آئی

نشیمن کیا، قفس پر بھی تباہی بار بار آئی
جب آئی آگ برساتی ہوئی موجِ بہار آئی

نئی رنگینیوں میں ڈوب کر صبحِ بہار آئی
دُلھن کے بھیس میں دوشیزۂ لیل و نہار آئی

کچھ اس انداز سے روپوش ہیں ڈھونڈے نہیں ملتے
محبت طور کی چوٹی پہ بھی اُن کو پکار آئی

خدا جانے اسے کس بات سے ایذا پہونچتی ہے
تری محفل سے جب آئی تمنا بے قرار آئی

کشش ایسی کہاں کی مل گئی ان چند تنکوں کو
کہ ہر بجلی نشیمن کی طرف بے اختیار آئی

وہ آئیں یا نہ آئیں کچھ نہ کچھ اب ہونے والا ہے
جوابِ صبحِ محشر یعنی شامِ انتظار آئی

اسے کیا علم اس مدت میں دنیا کس قدر بدلی
پھر آئی اور بل کھاتی ہوئی موجِ بہار آئی

مرے دل کی زیارت کو وہ ظالم ایک بار آیا
مگر دنیا کی ہر تازہ قیامت بار بار آئی

پلٹنا ہو گیا دشوار مجھکو کوئے جاناں سے
محبت اپنے سر کا بوجھ گر پڑ کر اُتار آئی

چمن سے اور کون آتا قفس تک مجھکو پہونچانے
فقط اک درد میں ڈوبی ہوئی صوتِ ہزار آئی

حقارت سے نہ دیکھو میرے چاکِ جیب و داماں کو
انھیں دوراستوں سے جب کبھی آئی بہار آئی

دفا کا قحط ہے سرشار انسانوں کی بستی میں
خدا جانے طبیعت کیوں مری دیوانہ وار آئی

بیداری

رہگذارِ کہکشاں پر تھک کے تارے سو گئے
اوڑھ کر اک نور کی چادر ستارے سو گئے

رات کی آغوش میں گردش کے مارے سو گئے
سارا عالم سو رہا ہے ایک میں بیدار ہوں

میں ربابِ زندگی کا اک لرزتا تار ہوں

(ایشیا)
(شور علیگ)

زبان

(از سرح۔ق۔ ایک گمنام شیدائے ادب)

ہم ناظرین زمانہ کی توجہ چند ایسے لسانیاتی اُصول کی طرف منعطف کرنا چاہتے ہیں جو نئے نہیں ہیں مگر جن کو بھول جانے یا نظرانداز کر دینے سے اکثر مسائل متنازعہ فیہ پیدا ہوتے ہیں۔ اگر یہ اصول یاد رہیں تو جو جھگڑے پیدا ہوتے ہیں وہ خارج از امکان ہو جائیں۔

زبان سے میرا مطلب اتنا سا ہے کہ کسی خاص ملک کی وہ الگ الگ آوازیں جو مل ملا کر کسی ایک چیز کو بتاتی ہیں اور جنھیں اُس ملک کے رہنے والے آپس کے سمجھوتے کے سبب کہنے والے کے منہ سے نکلتے ہی جھٹ سے سمجھ لیتے ہیں۔

پہلے پہل جب کسی ملک میں کوئی زبان پیدا ہوتی ہے تو جو چیزیں وہاں کے بسنے والوں کی آنکھوں کے سامنے ہوتی ہیں، وہ اُنھیں کے نام گھڑ لیتے ہیں۔ ان ناموں میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو دکھائی دینے والی چیزوں کے نام نہیں ہوتے بلکہ اُن باتوں کو بتانے کی کوشش کرتے ہیں جو اُن پر بیتتی رہتی ہیں اور جنھیں آنکھ دیکھ، ناک سونگھ اور زبان چکھ نہیں سکتی۔ اور کان سُن اور ہاتھ چھو نہیں سکتے۔

مگر دنیا کی کوئی چیز سدا ایک سی نہیں رہتی، وقت کے ساتھ ساتھ وہ بھی بدلتی رہتی ہے۔ کسی ملک کی ایک پشت نے کسی ایک چیز کو سمجھانے کے لئے جس طرح کی آوازیں اکٹھا بول کر سمجھایا تھا انھیں اس کے پیچھے آنے والی پشتوں نے کچھ نہ کچھ ضرور بدل دیا۔ اس طرح یہ آوازیں بدلیں اور بدلتی رہیں۔ یہاں تک کہ دس بیس پشتوں میں اِن ناموں کی ایسی کایا پلٹ ہوگئی کہ اگر پہلی پشت اپنی قبروں سے اُٹھ کر دسویں یا بیسویں پُشت والوں میں آ بیٹھے تو ان کی بات تک نہ سمجھے اور اس کایا پلٹ کو دیکھکر بھوچکّا رہ جائے۔

پہلی پشت کے بعد کی پشتیں اتنے ہی پر بس کرتیں تو کوئی بات نہ تھی، وہ تو جیسے جیسے اُن کی عقل بڑھتی یا نئی چیزوں کی ضرورت پڑتی گئی، نئی چیزیں بناتی اور اُن کے نام رکھتی گئیں۔ اور اگر پہلی پشت نے پچاس نام بنائے اور رکھے تھے تو دسویں بیسویں تک ان ناموں کی گنتی ہزاروں تک پہنچ گئی۔ یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ ہر پشت نے جو نام گھڑے اُن پر وہی بیتی جو اُن سے پہلے کے ناموں

بنتی تھی۔ کہنا یہ ہے کہ وہ بھی گھستے گھساتے اور گول سڈول ہوتے رہے۔ جیسے کے تیسے وہ بھی نہ رہنے پائے۔ اور رہنے کیسے پاتے، کیا وہ باتیں کہیں چلی گئی تھیں جنھوں نے پہلے کے ناموں کو بگاڑا تھا، وہ تو وہاں کی وہیں تھیں، پھر ان ناموں پر بپتا کیوں نہ پڑتی۔

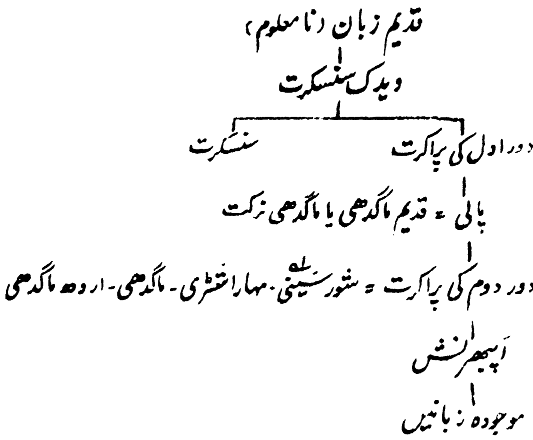
جب تک یہ حال رہا ہر نام کا رنگ ڈھنگ دیسی رہا، مگر دنیا ہر وقت آگے ہی بڑھتی رہتی ہے اس لئے کبھی بنج بیوہار کے سبب کبھی لوبھ لالچ میں پڑکر، لڑائی میں ہار جیت کے سبب دو ملکوں کے رہنے والے ایک جگہ اکٹھا ہو گئے، آپس کا میل جول رنگ لایا، بدیسیوں کے کچھ نام بیوپار نے اور کچھ میل جول نے دیسیوں کے ناموں میں ملا اور بڑھا دیے۔ دھیرے دھیرے بدیسیوں اور دیسیوں میں پیت پریم کی پینگیں یہاں تک بڑھیں کہ دونوں ایک ہو گئے، اور اپنے پرائے کا جھگڑا چُک گیا۔

دیسیوں نے جو نئے نام گھڑے اُن کے جوڑ جوڑ سے دیسی روپ جھلکتا تھا اور جھلک رہا تھا، کیونکہ وہ دیس سے بچ کر کہاں جاتے۔ دیسی اونچے سے اونچے اُڑکر بھی دیس سے باہر نہ جا سکتے تھے، اس لئے وہ تو ہر طرح دیسی ہی رہے۔ وہ نہ بدیسی مسالے سے بنائے گئے تھے اور نہ اُن میں بدیسی بوباس تھی۔ جس دھرتی ماتا نے اُنھیں جنم دیا تھا اُسی کے گُن اُن میں تھے۔ پر بدیسی ناموں پر بپتا پڑی، کبھی تو دیسی اُنھیں ٹھیک ٹھیک بول نہ سکے اور کبھی کوئی سیدھا سیدھا نام بن بگاڑے بولنے بھی لگے تو جیسے دیسی کی صورت دھیرے دھیرے بدل گئی تھی اُن کی بھی بدلی۔ ایسا ہی سمجھو کہ جو ہندوستانی لندن میں رہ پڑے ہیں وہ وہاں رہتے رہتے اب نہیں تو دو چار پشتوں میں کالے سے گورے ہو ہی جائیں گے گورے چٹے نہ ہوئے تو وہ رنگ روپ جو آج ہے وہ تو باقی نہیں رہ سکتا ہے۔

جب یہ بات ہے تو بدیسی ناموں کا کس طرح بولنا ٹھیک ہو گا۔ اس کا جواب اُوپر دیا جا چکا ہے پر گمگم میں کہنا اچھا نہیں، کھلم کھلا یہ بات ہے کہ جب دیسیوں نے بدیسی ناموں کو لیا ہے اُس وقت اُنھوں نے انھیں کیوں کر بولا۔ اگر بدیسیوں کی طرح تو جب تک ان پر دیسی رنگ نہیں چڑھا اُن کو بدیسیوں کی طرح بولنا ہی ٹھیک ہو گا۔ لیکن جب ان پر دیسی رنگ چڑھ گیا تو پھر لکیر نہ پیٹنی چاہیئے وہ تو ہمارے ہو چکے ہمیں بدیسیوں کا منھ نہ تکنا چاہیئے۔ جو کچھ اپنوں نے کیا ہے اُسے آنکھوں سے لگانا اور سر پر رکھنا چاہیئے۔ اور اگر دیسی کسی نام کو بدیسیوں سے لیتے ہی بگاڑ کر بولنے لگے تو ہمیں کبھی بدیسیوں کو نہ پتیانا چاہیئے۔ ہماری سمجھ میں یہی آتا ہے کہ سیدھی سچی بات یہی ہے۔ ہندوستان کی زبانوں کو چھوڑ کر اور دیسوں کی زبانوں پر سوچ بچار کرنے سے ہم نے جو کچھ کہا ہے اُس میں کھوٹ

نہ دکھائی دے گی۔

آپ اس کو تو اب مان گئے ہوں گے کہ ایک ہی دیس کی زبان کال کے چکر میں پھنس کر اپنے لفظوں کی صورت بدل دیتی ہے، مگر ہمیں ڈر ہے کہ آپ کہیں اسے بے پر کی نہ سمجھیں اس لئے آج کل کی زبان کی اُپتت کے لئے " شبد ساگر " میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ایک یونہیں سا نقشہ بنا کر دکھایا جاتا ہے :-



اسے دیکھ کر آپ یہ اچھی طرح جان اور مان گئے ہونگے کہ ہماری ہندی، سنسکرت یا پراکرت سے کایا پلٹ کر بنی ہے۔ کہنا یہ ہے کہ اسی دیس کی ایک پُرانی زبان نے اس کو جنم دیا ہے، آپ اس کو زبان کا بننا سمجھیں یا بگڑنا، اس جھگڑے میں ہم کبھی نہیں پڑنے کے، پر یہ کہے بنا نہ رہیں گے کہ 'کال کے چکر' میں پھنس کر سنسکرت یا پراکرت کا جس سے بھی ہندی نکلی ہو (کیونکہ ہم اس جھگڑے کو بھی پنڈتوں ہی کے لئے چھوڑتے ہیں کہ سنسکرت اور پراکرت میں پہلے کون تھا، اور سنسکرت سے پراکرت نکلی ہے یا پراکرت سے سنسکرت یا سنسکرت اور پراکرت کبھی الگ الگ تھیں) اس کا اب سنسکرت یا پراکرت کی طرف رُخ کرنا، اُلٹی گنگا بہانا ہے۔ سنسکرت یا پراکرت کے لفظ چاہے بن کر چاہے بگڑ کر جیسے بھی آج دکھائی دیتے ہیں ویسے ہی ٹھیٹ ہندی کے لفظ ہیں، سنسکرت تک اُن کی اُپتت پہنچا کر ہندی لفظ کی جگہ سنسکرت کا لفظ بولنا یا لکھنا ٹھیک نہیں۔ یہ کرنا ہے تو پھر تھوڑے ہی سے لفظوں کے ساتھ ایسا کیوں کیا جائے، ہندی کے سبھی لفظوں کو اسی طرح کیوں نہ بدل دیا جائے، یا یوں کہیئے کہ ہندی کی جگہ سنسکرت ہی کیوں نہ بولی اور لکھی جائے۔ یہ بھی کر لیا

---

[1] ادبی سنسکرت مدھیہ دیش میں پیدا ہوئی تھی اور ادبی شورسینی بھی یہیں کی بول چال سے پیدا ہوئی اس لئے ضروری تھا کہ اس پر سنسکرت کا بہت اثر پڑے۔ (شبد ساگر)

[2] ہماری آج کی ہندی اگر سنسکرت کہی جائے تو نامناسب نہیں (شبد ساگر)

تو کیا ہوگا، جیسے پہلے سنسکرت بدل کر ہندی ہوگئی تھی ویسے ہی پھر جی کر مرجائے گی اور کوئی اور زبان ہندی کی طرح جنم لے گی۔ کیونکہ کال کا چکر تو دنیا سے اُٹھ نہ جائے گا۔ جیسے اُس نے اگلے زمانے کی سنسکرت کو توڑ مروڑ کر آج کل کی ہندی بنا دیا ویسے ہی اگر سنسکرت پھر جی اُٹھی تو وہ اُسے ہزار دو ہزار برس میں پیس پاس کر رکھ دیگا۔ اور اس کی صورت پھر کچھ ویسی ہی ہو جائیگی جیسی کہ آجکل ہندی کی ہے۔ یہ کہنا کہ اُردو والے بھی تو عربی فارسی کے لفظ اُنھیں زبانوں کے لغات سے ٹھیک کرتے ہیں کچھ ایسی ہی بات ہے، مار وں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ کیونکہ ہم اس کو مان چکے ہیں کہ ان زبانوں کے لفظوں کو ہم نے جس طرح لیا اور بولا اُن کا ویسے ہی بولنا ٹھیک ہے اور ہمیں اُنھیں اپنے لغات سے ٹھیک کرنا چاہیئے۔ دوسرے یہ بات ہے کہ یہ تو بدیسی شبد ہیں کسی دیسی بھاشا کا رُوپانتر کب ہوا تھا جو اُن کے دیسی ہونے کے سبب اُن کو اپنی اصل سے ملانے کا حق نہ رہے۔

لگے ہاتھوں ایک بات اور کہنا چاہتے ہیں، وہ یہ کہ لفظ پہلے پہل ایک آدمی بناتا ہے اور سماج کے سامنے اس لئے لاتا ہے کہ وہ اسے مان لے۔ اگر سماج نے اُسے مان لیا اور بولنے لگا تو جانو وہ جی گیا اور نہ مانا تو مرگیا۔ اس میں اُن تھوڑے سے آدمیوں کی کچھ نہیں چلتی جنھیں ادیب یا ساہتیاچارج کہتے ہیں۔ یہ لوگ تو بس اتنا کرتے ہیں کہ بول چال کے جو لفظ اُنھیں پسند نہ آئے اُن کا لکھنا پڑھنا چھوڑ دیا۔ کسی نئے لفظ کے لئے جب تک وہ زبان کی خراد پر نہ چڑھ لے یہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتے اور نہ کسی کو اس کا حق ہے کہ لفظ بنتے ہی پکار اُٹھے کہ ادیب یا ساہتیاچاریہ اسے نہیں بولتے یا پسند نہیں کرتے

یہ بات تو ناموں کی بات رہی، اب ہم زبان کے قاعدے قانون کا حال بھی کچھ لکھنا چاہتے ہیں کسی زبان کے قاعدے قانون کبھی اُس کے ناموں کی طرح نہیں گھڑے جاتے۔ وہ تو جس گھڑی سے کسی دیس کا ایک رہنے والا اُسی دیس کے دوسرے رہنے والے کو اپنے من کی بات سمجھانے کے لئے ناموں کو جس طرح بولتا اور آگے پیچھے رکھتا ہے اور دوسرے دیسی انھیں اسی طرح بولنے اور آگے پیچھے رکھنے لگتے ہیں اُسی گھڑی وہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ پہلے پہل تو کوئی ادھر دھیان نہیں دیتا پھر کبھی نہ کبھی کوئی دیسی بدیسی انھیں سوچ بچار کر لکھ ڈالتا ہے، اور یوں یہ قاعدے نکل آتے ہیں قانون بنانے والوں کی بھی یہی ریت رسم ہے۔ ایک دن ایک وکیل صاحب کو ہم نے کہتے سنا تھا کہ ہر دیس کا قانون چار چیزوں سے بنا ہے جن میں سے ایک کو رسم و رواج کہتے ہیں۔ جب دیس کا راجہ اس رسم و رواج کو ٹھیک سمجھ کر اس پر اپنی چھاپ لگا دیتا ہے اور اُسے اس لئے لکھکر رکھ دیتا ہے

کہ جھگڑے ٹنٹے چکانے کے لئے لوگ اس کا سہارا لیں تو وہ قانون بن جاتا اور کہلاتا ہے۔ کہنا یہ ہے کہ زبان کے قواعد تو زبان کے ساتھ ہی ساتھ جنم لیتے ہیں پر انھیں پہچاننے اور ماننے میں دیر لگتی ہے۔

اس طرح جو قانون بنتا ہے وہ دیسی اور اصلی ہوتا ہے، اور جب تک زبان میں بدیسی نام نہیں آتے اُس وقت تک دیس کی زبان سے جو قاعدے قانون لئے گئے ہیں، انھیں کو جان کر دیسی بدیسی جسے ضرورت ہو زبان ٹھیک ٹھیک بول اور لکھ سکتا ہے۔ مگر جب بدیسی نام زبان میں مل جاتے ہیں تو وہ چاہتے ہیں کہ انھیں بدیسی قاعدوں ہی کے ساتھ برتا جائے۔ اب یہ دیسیوں کی مرضی ہے کہ وہ اُن کی بات مانیں یا نہ مانیں۔ مان لیجئے کہ دیسیوں نے اُن کا کہنا نہ مانا تو پھر انھیں دیسی ہی قاعدوں کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے اور جو دیسیوں نے اُن کے کہے پر کان دھرے تو پھر جیسے دیسی ناموں میں بدیسی نام آملے تھے ویسے ہی یہ بھی گھل مل جاتے ہیں۔ دیسی قاعدوں کے گھٹنے سے تھوڑے سے بدیسی قاعدے بھی گھٹنا جوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں، اور اصلی قاعدوں کے ساتھ نقلی (ہم ان بدیسیوں کو نقلی کہیں گے اس لئے کہ وہ بدیسی ہیں) قاعدے بھی آملتے ہیں، اسے بھی آپ کوئی نئی بات نہ سمجھیں، دیس دیس کے قانون یونہیں بنتے ہیں۔ جب تک کسی دیس میں اُس کے رہنے والے بستے ہیں سارے قانون کی جڑ اُنھیں کے رسم ورواج ہوتے ہیں، مگر جب پردیسی آکر اُس دیس کی پرجا میں مل جاتے ہیں تو پھر قانون میں کچھ نہ کچھ اُن کی رعایت کرنی ہی پڑتی ہے۔

رہی یہ بات کہ زبان کے قاعدے بدلتے ہیں یا نہیں، اوپر دکھایا جا چکا ہے کہ ناموں کی کایا پلٹ ہوتی رہتی ہے۔ جیسے ناموں کی کایا پلٹ ہوتی ہے ویسے ہی زبان کے بولنے والے اُنھیں اپنی بات سمجھانے کو آگے پیچھے رکھنے کی ریت کو بھی بدل دیتے ہیں، اس لئے زبان کے قواعد بھی بدلتے ہیں

کسی دیس کی زبان بولنی ہوگی تو اُس دیس کی زبان کے قواعد بھی سیکھنے ہی ہوں گے، اور وہ بدیسی قواعد بھی آنے ہی چاہیئے جن کو اُس نے اپنا لیا ہے۔ یہ ہم کیوں کریں کہ تھوڑے سے بدیسیوں کے لئے اُن کی سب باتیں سیکھیں۔ اور زبانوں کے لئے تو ہم کچھ نہ کہیں گے پر اُردو کے قواعد کی کتابوں کا حال ہم جانتے ہیں۔ پلاٹس صاحب نے جو قواعد اُردو انگریزی میں لکھی ہے اُس میں یہ باتیں پائی جاتی ہیں، ان کی کتاب کا نام ہے *A Grammar of the Hindustani or Urdu Language.*
آپ چاہیں تو دیکھ لیں اور بیچ بیچ سے بچ کر آپ ہی یہ بھی فیصلہ کر لیں کہ یہ اس زبان کو کتنا ٹھیک ٹھیک لکھنا اور بولنا سکھاتی ہے۔

دلّی اور لکھنؤ والوں میں چوٹیں چلتی ہی رہتی ہیں۔ کوئی تیس چالیس برس ہوئے جب لاہور کا اخبار وطن زوروں پر تھا، اُس وقت بھی کسی وجہ سے آپس میں جھپٹ ہوگئی تھی، دلّی کے ایک حمایتی نے ایک شعر لکھا تھا:۔

سکھائی گرچہ دلّی نے زباں احسانؔ پوربکو تفاوت ہے مگر اہل زباں میں اور زباندان میں

ہم نے اس شعر کو محض اس واسطے لکھا ہے کہ ناظرین کی توجہ جناب احسانؔ صاحب کی تقسیم کی طرف منعطف کرکے یہ بتائیں کہ کسی زبان کے بولنے والوں میں دو گروہ ہوتے ہیں۔ ان دونوں لفظوں کی تعریف کی ضرورت نہیں، جو اُردو کی تاریخ سے واقف ہیں وہ خود بخود سمجھ لیں گے کہ دونوں کے مدلول میں کیا فرق ہے۔ اہل زبان ہوں یا زبان داں اگر وہ اپنی مادری زبان کما حقہ جانتے ہیں اور اُن کے اظہارِ خیالات بلند کا وہ سچّا اور صحیح آلہ ہے تو اپنے ملک کے لٹریچر میں اُن کا رتبہ مسلّم ہے اگر وہ بدیسی زبانیں نہیں جانتے تو پروا نہیں۔ ملٹن اور شیکسپیئر اگر آج زندہ ہیں اور آیندہ زندہ رہیں گے تو لاطینی علم وفضل کی بدولت نہیں، بلکہ مادری زبان پر کامل قدرت رکھنے کے صدقہ میں۔

محسوساتِ ماہر

(از حضرت ماہر القادری)

اُن شوخ نگاہوں کے پرستار ہمیں تھے سرتا بہ قدم حسرتِ دیدار ہمیں تھے
تیرے لئے ہر لطف سے بیزار ہمیں تھے سوئی ہوئی مخلوق تھی بیدار ہمیں تھے
شایانِ مقامِ رسن و دار ہمیں تھے معراجِ محبّت کے طلبگار ہمیں تھے
اُس نرگسِ بیمار کے بیمار ہمیں تھے میخانۂ فردوس کے میخوار ہمیں تھے
ہم پر ہی رہی حسن کی ہر گرم نگاہی کیا جرمِ محبت کے گنہگار ہمیں تھے
جب حسن و محبّت کے تعلق پہ نظر کی محسوس ہوا پردۂ اسرار ہمیں تھے
جس بارِ امانت کو اُٹھایا نہ کسی نے اُس بارِ امانت کے خریدار ہمیں تھے
ڈھونڈا تو وہ کچھ دُور نہ تھے حدِ طلب سے دیکھا تو سرِ رہگذرِ یار ہمیں تھے
فریاد ہے اے خالقِ تقدیرِ دو عالم کیا تہمتِ ہستی کے سزاوار ہمیں تھے

ماہرؔ ستمِ دہر کی رُوداد نہ پوچھو
ہر چند کہ تھی معصوم گنہگار ہمیں تھے

"خواب آور غزل خوانی"

(پنڈت آنند نراین ملا ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی)

جھجک اظہارِ ارماں کی بہ آسانی نہیں جاتی
خود اپنے شوق کی دل سے پشیمانی نہیں جاتی

تڑپ شیشہ کے ٹکڑے بھی اڑا لیتے ہیں ہیرے کی
محبت کی نظر جلدی سے پہچانی نہیں جاتی

اُفق پر نور رہ جاتا ہے سورج ڈوبنے پر بھی
کہ دل بجھکر بھی نظروں کی درخشانی نہیں جاتی

سوئے دل آکے وہ چشمِ کرم بھی کیا بنائے گی
شعاعِ مہر سے صحرا کی ویرانی نہیں جاتی

کسی کے لطفِ بے پایاں نے کچھ یوں سوئے دل دیکھا
کہ اب ناکردہ جرموں کی پشیمانی نہیں جاتی

یہ بزمِ دیر و کعبہ ہے نہیں کچھ صحنِ میخانہ
ذرا آواز گونجی اور پہچانی نہیں جاتی

نظر جس کی طرف کرکے نگاہیں پھیر لیتے ہو
قیامت تک پھر اس دل کی پریشانی نہیں جاتی

نظر جھوٹی، شباب اندھا، وہ حسنِ نقشِ فانی ہے
حقیقت ہے تو ہو لیکن ابھی مانی نہیں جاتی

نہ پوچھو تجرباتِ زندگانی چوٹ لگتی ہے
نظر اب دوست اور دشمن کی پہچانی نہیں جاتی

نہ سمجھو ضبطِ گریہ سے خطا پر ہیں نہیں نادم
کہ آنسو پونچھ لینے سے پشیمانی نہیں جاتی

صدائے جنگ ہر جانب سے آتی ہے مگر مُلّا
تری اب تک وہ خواب آور غزل خوانی نہیں جاتی

"توہینِ دوستی"

سمجھ رہا ہوں میں خوب اسکو بھلا کہاں تو کہاں میں مخلص
مجھے کچھ اسکا گلا نہیں ہے کہ فرق یہ تو نصیب کا ہے

زباں سے مُلّا کو دوست کہکر مگر نہ توہینِ دوستی کر
ذرا خیالوں کا جائزہ لے کہیں گزر بھی غریب کا ہے

نہیں وہ تیرے کرم کے شایاں تو کیوں اسے دے حسین دھوکے
کہ وہ سمجھ بوجھکر ہے ناداں، ہنوز اسکاں فریب کا ہے

(شیدا)

اِلہام پارے

(از حضرت سیماب اکبرآبادی)

بلند اپنا عزمِ کلیمانہ کردے — وہ پھر چھپ گئے ہیں، پھر افسانہ کردے
عطا سوزِ دل بے حجابانہ کردے — حریفِ روایاتِ پروانہ کردے
بہارِ تبسّم، وقارِ تکلم — جسے چاہے، جب چاہے دیوانہ کردے
مری تشنہ کامی بے انتہا کا — کوئی ہے جو محدود پیمانہ کردے؟
اگر بت شکن ہے، اگر خود شکن ہے — تو مسمار دل کا خودی خانہ کردے
جبیں کو بنا خوگرِ سجدہ لیکن — قیودِ تعیّن سے بیگانہ کردے
ہے لعنت وہ دستورِ سرمایہ داری — جو ذہنیتوں کو غلامانہ کردے
تخیّل جو ویرانیوں پر ہو مائل — تو ذرّوں کو بکھرا کے ویرانہ کردے
تصوّر جو رنگینیوں کا ہو حامل — تو پھولوں کو پھیلا کے گل خانہ کردے

وہی اصل میں ترک ہے ماسوا کا — جو بیگانگی سے بھی بیگانہ کردے
بناتا ہے اِک دل، تپش آزمودہ — فراہم کوئی خاک پروانہ کردے
بہار آئے اب کے جنوں خیز ایسی — جو دیوانہ سازوں کو دیوانہ کردے
مرے دل کے تفتیدہ ٹکڑوں کو یارب — چراغِ گذرگاہِ بت خانہ کردے
گوارا نہ کر حبسِ رازِ محبت — چھپانا ہے مشکل تو افسانہ کردے
ہے مختارِ کل میری خانہ خرابی — جہاں چاہے تعمیر کاشانہ کردے
وہ کرتے ہیں پرسش کچھ ایسی نظر سے — جو دیوانے کو اور دیوانہ کردے

کرے کیا جو سیماب دل کو نہ اپنے
نثارِ اداہائے ترکانہ کردے

سنسکرت ادب اور ہندی فنِ تصویر

(از مسٹر جگیسور ناتھ ورما بیتاب بریلوی، بی۔اے، ایل ایل، بی)

سنسکرت ادب کی پرانی تصانیف میں ایسے بہت سے حوالے ملتے ہیں جن سے ہندی فن تصویر کی قدامت کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بھاس سنسکرت کا وہ پہلا ناٹک نویس ہے جس کی تصنیفات دستبردِ زمانہ سے ہنوز محفوظ ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے سوپن واسوودتا میں کئی بار ولس راج اودین اور واسوودتا کی تصویروں کا ذکر آیا ہے۔ بھاس کے بہت دنوں بعد کالیداس کے ناٹکوں کا آفتابِ شہرت طلوع ہوا۔ لیکن اس درمیانی زمانہ کی کیفیت ابھی تک پردۂ خفا میں چھپی ہوئی ہے۔ مگر کالیداس کے کئی ناٹکوں میں بھی مصوری کا تذکرہ موجود ہے۔

وکرم اُروشی (विक्रमोर्वशीय) نامی ناٹک میں جب پُرورا (पुरुरवा) اُروشی کے غمِ فراق سے مضطرب ہو کر دل بہلانے کی تدبیر دریافت کرتا ہے تو ودوشک یہ دو صورتیں بیان کرتا ہے:

"स्वप्न समागमकारिणी निद्रां सेवतां भवान् अथवा तत्र भवत्या उर्वश्याः प्रतिकृतिं चित्रफलके ऽ भिलिख्य आलोकयन्नात्मानं विनोदयतु।"

یعنی "یا تو خواب میں اُروشی سے ملیئے یا لوح پر اس کی تصویر اتار کر دلِ بیتاب کی تسکین کا سامان فراہم کیجئے۔"

کالیداس کے دوسرے ناٹک مال وکاگنی متر کی شروعات ہی ایک تصویر سے ہوتی ہے اگنی متر تصویروں کے مرقع میں مال وکا کی شبیہ جمیل دیکھتے ہی دل دے بیٹھتا ہے۔ اس کے علاوہ اس ناٹک میں دو اور تصویروں کا بھی ذکر ہے۔ شکنتلا میں بھی ہم مہجور جمال دشینت کو شکنتلا کی تصویر بناتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہ تصویر تو اس درجہ جامع اور مکمل بنائی جاتی ہے کہ پیکرِ تصویر کے پھول سے رخسار پر بھونرا مستانہ وار منڈلاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

ساتویں صدی کی مشہور منظوم تصنیف کادمبری مصنفہ بان بھٹ سے بھی اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اس زمانہ کے شہزادوں کو علم سیاست اور فنونِ جنگ کی تربیت کے ساتھ ساتھ

تصویر کشی کی بھی مشق کرائی جاتی تھی۔ اور یہ تلوار کے دھنی بڑے چابکدست مصوّر ہوتے تھے۔ امن و چین کے دنوں میں شہزادے اس دلچسپ مشغلہ سے اپنا دل بہلایا کرتے تھے۔ ان دنوں اس فنِ لطیف کی قدردانی کا یہ عالم تھا کہ اس زمانہ کی شہزادیاں اور دیگر مستورات اس فن میں مہارت تامّہ رکھتی تھیں۔

بانؔ بھٹ کے قول کے مطابق ویشمپاین اپنے زمانہ کے سب سے بڑے ماہر فن تھے۔ ایک مقام پر شاعر نے چندرا پیڑ (चन्द्रापीड़) کے بارے میں لکھا ہے کہ चित्रकर्मणि परम कौशलमवाप (وہ تصویر بنانے میں بہت ہوشیار ہوگیا ہے۔

اُتر رام چرت (उत्तररामचरित) نامی بھوبھوتی کے بہترین ناٹک میں بیس بائیس تصویروں کا حوالہ موجود ہے۔ لکشمن جی رام اور سیتا کو مختلف تصویریں دکھاتے ہوئے جب پرشرام کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو سیتا جی کے منہ سے بیساختہ ہی نکلتا ہے کہ "कम्पिता स्मि" (میں تو کانپ گئی) اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پرشرام کی تصویر بلاشبہ اُن کے ڈیل ڈول کے مطابق بھیانک بنی ہوگی۔ اور اُسے دیکھتے ہی اُن کی آنکھوں میں وہ سماں پھر گیا ہوگا جب رامچندر کے شیو دھنش توڑ ڈالنے پر غم و غصّہ سے بدحواس پرشرام نے راجہ جنک کی سبھا میں قدم رکھا تھا۔

شورپ نکھا (शूर्पणखा) کی تصویر دیکھکر بھی سیتا جی پر بعینہٖ یہی کیفیت طاری ہوگئی تھی اِس ناٹک میں بھوبھوتی نے مناظر قدرت کی حسین تصویروں کا نہایت دلکش انداز میں چربہ اُتارا ہے ایک تصویر کو سامنے رکھکر بھوبھوتی لکھتا ہے کہ:-

"حسنِ فطرت کا کتنا حسین نظارہ ہے بتپوبن کے سامنے ایک طرف کوہساروں کی آغوش میں مچلتا ہوا جھرنا بہہ رہا ہے۔ کناروں پر ہرے ہرے پیڑوں کے جھُنڈ لہرا رہے ہیں، بان پرستھیوں کے دم سے آشرم کی پُرسکون فضائیں جھلملانے لگی ہیں۔"

ایک دوسری تصویر کو لفظی جامہ پہناتے میں بھی شاعر بے مثال نے کمال کر دیا ہے۔ یہ پرسروانٹر پربت (प्रस्रवण पर्वत) تکلف و تصنع سے عاری حسنِ ذاتی کی روشن تصویر ہے۔ مصوّر نے ایک شیل[۲] بنایا ہے، پہاڑ کی گپھا بھی نمایاں ہے۔ اس کے قریب ہی گوداوری ندی پیڑوں کے جھرمٹ سے نکل کر موجیں مار رہی ہے۔ گھنے درختوں سے چھایا ہوا کہسار نیلا نیلا دکھائی دیتا ہے، پہاڑ پر بادل بکھرے ہوئے ہیں اس لئے اس کا رنگ بھی آسمانی سا ہوگیا ہے۔

مدرا راکششس نامی ناٹک میں بھی تصویروں کا ذکر موجود ہے۔ ایک موقع پر غور و فکر کے سمندر میں ڈوبا ہوا

---

[۱] ایک پہاڑ کا نام۔   [۲] یعنی پہاڑ

راکششش کہتا ہے کہ جس طرح لٹکانے کے لئے دیوار نہ ہونے سے بہترین تصویر بھی بیکار ہوتی ہے اسی طرح میری انتہائی کوشش بھی سہارے کے بغیر لا حاصل ہے۔

اس سے ثابت ہے کہ "راکششش" کے عہدِ تصنیف میں تصویروں کا رواج عام ہو چکا تھا، اور تصویر بنانے کے لئے کاغذ وغیرہ کا بھی استعمال ہونے لگا تھا۔

اوپر جن ناٹکوں کا حوالہ دیا گیا ہے وہ سب کے سب قدیم ہندستانی اسٹیج کے لئے لکھے گئے تھے اور ایسے تاریخی ثبوت بھی بکثرت موجود ہیں جو ان کی عام نمائش پر دلالت کرتے ہیں۔ پس سنسکرت ناٹکوں کے بنیادی اصولوں کے پیش نظر بلا خوفِ تردید یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ ان ناٹکوں میں جن تصاویر کا ذکر ہے وہ برابر اسٹیج پر لائی جاتی تھیں اور ناٹک کے پہلو بہ پہلو ان کی بھی نمود و نمائش کا اہتمام ہوتا تھا۔ جس کا مطلب صرف یہ ہے کہ بھاس سے لیکر سنسکرت ادب کے دور المتاخرین تک اعلیٰ پایہ کی مصوری کا فقدان نہ تھا۔

غالباً یہیں سے سنسکرت علم و ادب کی طرح فنِ تصویر کے زمانۂ ادبار و انحطاط کا بھی آغاز ہوتا ہے پھر بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس فنِ لطیف کو زندہ رکھنے کے لیئے کچھ نہ کچھ کوششیں ضرور ہوتی رہی ہونگی۔

رنگ و نغمہ

(از سیدہ سردار بیگم اختر حیدر آبادی)

عالمِ رنگ و نغمہ میں کیف بہت سہی مگر
بیخودِ سیرِ کائنات! اپنی طرف بھی اک نظر

اُن کی بھی آنکھ ہو گئی جوشِ الم سے آج تر
میں نے اُٹھائی کیوں نگاہ عالمِ درد میں اُدھر

شکلِ حسیں دکھائے جا، پردۂ درمیاں اُٹھا
شوق مرا ہے پارسا، عشق مرا ہے معتبر

یوں نہ پہونچ سکے گا تو اُس کی حریمِ ناز میں
عشق کی تیغ تیز لے، عقل سے پہلے جنگ کر

تیرے تمیزِ شوق کو ایک زمانہ چاہیئے!
تیرا لہو ابھی ہے سرد، میری نوا ہے گرم تر

آہ شرابِ شوق کا کیف بہت عجیب ہے
وہ ہیں کہ مجھ سے بے نیاز، اور میں اُن سے بیخبر

تیری نوا نے کر دیا، سینۂ گل کو چاک چاک
اختر خوشنوا خموش! اختر خوشنوا ٹھہر!!

شامِ شب افروز

از مسٹر جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی، بی اے ایل ایل بی

ہونے لگے رہ رہ کے سرِ عرش اُتارے   روئے گلِ خورشید پہ صدقے گئے تارے
باہم گل و بلبل میں ہوئے طُرفہ اشارے   سمٹے ہوئے غنچے نہ کِھلے شرم کے مارے

اُڑنے لگے شبنم کے جھلکتے ہوئے موتی
سبزے پہ تھے قطرے کے ڈھلکتے ہوئے موتی

لاتی تھی جوئے شیر مسی اپنی دھڑی سے   مِلتی تھی گلے صبح قیامت کی گھڑی سے
شعلوں کی سی بارش جو تھی پانی کی جھڑی سے   گل آگ کے جھڑنے لگے پھولوں کی چھڑی سے

تھا خاک کا انبار سرِ دامنِ ہستی
دم بھر میں ہوا نذرِ خزاں گلشنِ ہستی

آمادہ بہ شوخی جو ہوا باغ میں آئی   مُنہ چوم لیا گُل کا جہاں آنکھ ملائی
کھول اُٹھے حباب آگ جو پانی میں لگائی   دی قطرۂ ناچیز کو دریا نے دُہائی

رو دیتے تھے گل اوس سی سبزہ پہ پڑی تھی
جھلسا ہوا منکا تھا جو موتی کی لڑی تھی

تپتی ہوئی کرنیں تھیں کہ چلتے ہوئے بھالے   کالے کی طرح لیتی تھی ہر موج سنبھالے
گرداب کے حلقے تھے کہ خورشید کے ہالے   پڑ جاتے تھے امواج کے ہر گام پہ چھالے

شبنم کے لباسوں میں حسیں کانپ رہے تھے
دریا میں سمندر بھی پڑے ہانپ رہے تھے

پھر مشعلِ خورشیدِ فلک گل ہوئی بارے   پیشِ نگہِ شوق ہیں دلچسپ نظارے
سرچشمۂ مہتاب میں غلطاں ہیں ستارے   پرواز میں جگنو ہیں کہ پرّاں ہیں غبارے

ہر موجِ رواں بادہ بلب لطف بکنارے
ایں شامِ شب افروز بہ از صبحِ بہارے

دو بچّے

ایک قصّہ

(از سیّد علی عباس حسینی ایم۔اے)

نواب صاحب پو تڑوں کے رئیس تھے، باپ دادا لاکھوں کے جاگیر دار رہ چکے تھے، وہ بات تو اب نہ تھی مگر مٹتے مٹاتے پر بھی بہت کچھ تھا۔ اس لئے رکھ رکھاؤ، آن بان وہی تھی، نوکر۔ چاکر، ماما دائیاں، خواصیں، مہریاں، سب ہی تھیں۔ محل بھی ایک نہیں کئی تھے۔ لیکن بچّہ صرف ایک ہی تھا، دو برس کی جان، ماں باپ کی آنکھوں کا تارا۔ بڑے اللہ آمین سے پالا جا رہا تھا۔ جہاں بیگم صاحبہ کی گود سے اُترا اناؤں، دائیوں، کھلائیوں کے "حصار" میں گھر گیا۔ ہر وقت یہی خیال کہ کمرے سے باہر نکلتے وقت گرمیوں میں تیز دھوپ سے سنولا نہ جائے۔ اور جاڑوں میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا "نزلے کی تحریک" نہ پیدا کردے۔ اناؤں اور کھلائیوں پر بھی تاکید تھی کہ ہر وقت صاف ستھری رہیں، ایسا نہ ہو کہ بچّے کے مزاج میں گندگی کے برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ ہر وقت یہ قدغن کہ مٹی دھول میں کھیلنے نہ پائے، اگر ننّھے ننّھے صندل کے پاؤں سے چلایا بھی جائے تو وہ بھی اندر کمرے کے قالین پر یا مسہری کے مخملی گدّوں پر!

بچّہ خوش قسمت تھا کہ وہ اِن بندشوں پر بھی لُدبُد لُدبُد چلنے بھی لگا، اور تُتلا کے چھوٹے چھوٹے فقرے بولنے بھی لگا۔ اس کی بھولی بھولی صورت اور اس کا یہ تُتلانا اتنا پیارا معلوم ہوتا تھا کہ ہر وقت بیگم صاحبہ اور نواب صاحب کو "ماشاء اللہ، ماشاء اللہ، خدا نظر بد سے بچائے" کہہ کہہ کر نہ جانے کتنی دفعہ "ناد علی" "حرز یمانی" "جوشن" اور نہ جانے کون کون سی دعائیں پڑھ کر دم کرنا پڑتی تھیں۔ اور نئے نئے تعویذ اور نقوش ملّاؤں اور سیانوں کے پاس سے منگوا کر پہنانا پڑتے تھے۔

ایسے موقعوں پر نواب اور بیگم ایک دوسرے کو دیکھ کر بڑی محبت سے کہتے تھے:۔

"ماشاء اللہ بڑا ذہین ہوگا!"

"اللہ اس پر حضرت عباس کے علم کا سایہ رکھے۔ یہ جوان ہو کر قیامت ڈھائیگا"!

اور نواب صاحب اپنے قیامت ڈھانے والے واقعات مُسکرا مسکرا کر یاد کرنے لگتے تھے!

غرض ننھے نواب پر ماں باپ جان چھڑکتے اور ہر وقت اس بچے کی صفائی، کھانے پینے، اُٹھنے بیٹھنے، ہر امر کا خاص اہتمام رکھتے تھے۔ ـــــــــ

کہ ایک دن محل میں بجائے بوڑھی مہترانی کے اُس کی پوتی آئی! یہی کوئی چھ سات برس کے سن کی، میلے کپڑے پہنے، ایک چھوٹی سی کوڑا اُٹھانے کی بالٹی لئے ہوئے۔ دادی بیمار پڑ گئی تھی اس لئے ساٹھ برس کی بوڑھی کے کام کی ذمہ داری اس ننھی سی جان پر آپڑی تھی۔ ڈرتی، سہمتی جھجکتی، گھبراتی آئی، اور اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اپنے فرائض ادا کرنے میں منہمک ہو گئی۔

ننھے نواب نے آج پہلی دفعہ اپنے سن سے نسبتہً قریب تر عمر کی ایک لڑکی دیکھی، انّا کی گود سے اُتر کر فرش کے کنارے تک لُد پھُد کرتے آئے۔ دونوں بچوں نے ایک دوسرے پر سر سے پاؤں تک نظریں ڈالیں۔ چھوٹی مہترانی کی آنکھوں سے اِس صاف ستھرے بچے کو گود میں اُٹھا لینے اور پھول سا منہ چوم لینے کی بیچین خواہش ظاہر تھی۔ ننھے نواب کے ہاں تعجب تھا، اتنے چھوٹے سے بھی لوگ ہوتے ہیں، جن کے بال اُنھیں کی طرح سیاہ، جن کے ہاتھ پاؤں اُنھیں کی طرح چھوٹے چھوٹے، مگر جو بالٹی سے کھیل سکتے ہیں۔ گھر کی سب سے زیادہ دلچسپ چیز کوڑا، جس میں تنکے بھی ہیں، کاغذ بھی اور رسیوں کے ٹکڑے بھی، یوں سمیٹ کر لے جا سکتے ہیں! دوستی کرنے کے لئے مُسکرائے۔ انّا نے جو یہ تیور دیکھے ڈانٹا " نواب اُدھر کہاں جا رہے ہو، مہترانی ہے گندی چھی، چھی، چھی!"

ننھے نواب نے کچھ جواب نہ دیا، وہ ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے اور چھوٹی مہترانی کو بغور دیکھتے رہے، جب وہ کوڑا لے کر باہر چلی گئی تو انّا سے پلٹ کر بولے " مہہ تلانی، تلی گئی!"

وہ بولی " ہاں، نواب وہ موئی دفان ہوئی! لو تم اپنے کھلونے کھیلو، اس گندی چھوکری کی فکر نہ کرو!"

دوسرے دن ننھے نواب کمرے کے فرش پر اپنی گڑیل سے دوسری دایہ کی نگرانی میں منہمک تھے کہ پھر چھوٹی مہترانی آئی، ان کا گلاب سا چہرا خوشی سے بالکل بیر بہوٹی کے رنگ کا ہو گیا۔ وہ ایک مرتبہ ننھے ننھے ہاتھوں سے تالی بجا کر بولے " مہہ تلانی، میلی (میری) مہہ تلانی آ گئی!"

پھر بیگم صاحبہ کے پاس دوڑ کر خوشخبری سنائی " امّی! امّی۔ مہہ تلانی آ گئی!"

اُنھوں نے اس گلنار چہرے کو چوم کر کہا " امّی تیرے صدقے! لیکن بیٹے مہترانی کے آنے پر

اتنی کیوں خوشی ہے؟ وہ تو گندی، میلی، کالی اور خراب ہے!......."

بچے نے گھبرا کر کہا "کھر آپ، نہیں، میلی۔ مہ تلانی —— اتّھی! —— بہت اتّھی!"

وہ بولیں "وہ موئی کیا اچھی ہو گی! وہ البتہ اچھی ہو گی جسے میں بہو بنا کر لاؤں گی! چاند سی ہو گی، چاند سی!"

ننھے نے کہا "تاند سی؟ تندا ماموں سی!"

وہ کلیجے سے چمٹا کر بولیں "چندا ماموں سے بھی کہیں زیادہ اچھی!"

تیسرے دن ننھے نواب نے قیامت ڈھا دی!

چھوٹی مہترانی آئی، اُس نے کمرے کے سامنے جھاڑو دی، حسرت بھری نگاہوں سے اس پھول کو دیکھا جس کی وجہ سے کمرہ گلدان بنا ہوا تھا اور چھوٹی بالٹی میں جھک کر کوڑا رکھنے لگی۔ ننھے نواب پہلے تو اس کی حرکتیں تعجب سے دیکھتے رہے، پھر ایک بار لُدپھُد دوڑے اور اُنھوں نے اپنی دونوں باہیں مہترانی کی گردن میں ڈال دیں! —— بس گھر بھر میں زلزلہ آگیا۔ انّائیں، دائیاں، مہریاں، خواصیں، مامائیں، سب ایک ساتھ دوڑیں۔ خود بیگم صاحبہ مسہری سے اُتر کر ننھے کی طرف لپکیں۔ نواب صاحب نے پیچوان ہاتھ سے پھینکی اور "ارے رے! توبہ! توبہ!" کہتے ہوئے اسی طرف چلے۔

بیچاری چھوٹی مہترانی عجیب مخمصے میں پھنس گئی، اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتی کہ کہیں ننھے نواب گر نہ پڑیں۔ ہاتھ سے چھُو نہیں سکتی، اس لئے کہ بچہ ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے 'اچھوت' ہونے سے واقف تھی، غرض وہ بالکل بُت بنی بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ بڑی انّا نے بڑھ کر ننھے کے ہاتھ اس کے گلے سے الگ کئے اور اسے گود میں لیتے ہی مہترانی کو ایک لات جمائی۔

"حالزادی، نواب کو سر سے پاؤں تک نجس کر دیا!"

دوسری ماما دائیوں نے بھی گالیوں کی ایک باڑھ ماری اور جوتیوں سے تواضع کی، بیگم صاحبہ کی طرف سے بھی خطابوں کی بارش ہوئی۔ اور چھوٹی مہترانی روتی، بسورتی، بلکتی سسکتی بالٹی سمیت باہر بھاگ گئی۔

بیگم صاحبہ بولیں "اس قطامہ سے کہہ دو کہ اگر آج سے محل میں قدم رکھا تو کتوں سے بوٹیاں نچوا دوں گی! کمینی!"

نواب صاحب بولے "ارے بھئی، ننھے کے سارے کپڑے اتار کر پھینک دو اور اسے خوب نہلا کر دوسرے کپڑے پہناؤ۔"

بیگم صاحبہ نے کہا "اور دیکھو ہنڈے میں ملنے کے لئے صابون کی ایک نئی بٹی اور آدھ پاؤ بیسن نکال لو!"

بوڑھی انا نے کہا "سرکار قربان جاؤں! تھوڑا ماش اور کڑوا تیل بھی صدقے کے لئے ایک ٹوکری میں نہ رکھ لاؤں؟"

بیگم نے کہا "ہاں نوا! ضرور۔ اور اسی ٹوکری میں ایک نیا روپیہ اور چاندی کی چونی بھی رکھ دینا بلا گلے ہی سے چپٹ گئی تھی! خدا نے بڑا فضل کیا جو میر العل بال بال بچ گیا!"

ننھے نواب یہ سارا ہنگامہ ایک فلسفی کی متانت سے دیکھا کئے، پھر انھوں نے اپنے باپ کی طرف پلٹ کر اپنے نزدیک سب سے اہم خبر سنائی:۔

"میلی مہ تلانی بھاگ گئی!"

انکشاف

(از مسٹر ڈی۔ پی۔ بھٹناگر کشتہ)

فروغ صبح ہوں میں، تیرگی شام ہوں میں
ہے سب سفید و سیہ جس سے وہ نظام ہوں میں

جواب پا کے مخاطب ہے، شاد کام ہوں میں
کلیم طور نہیں، خود سے ہم کلام ہوں میں

نفس نفس سے مرے مدعا ٹپکتا ہے
دیا ہے جو مری ہستی نے وہ پیام ہوں میں

مرے وجود سے بزم دوام روشن ہے
جو تا سحر نہ بجھے وہ چراغ شام ہوں میں

کدھر خیال ہے، کچھ ہے خیال میرا بھی
ذرا سنو تو سہی، تم سے ہم کلام ہوں میں

مرے خمار کی عظمت سپرد خاک ہوئی
جو گر کے اٹھنے نہ پائے وہ دُردِ جام ہوں میں

ازل ابد ہیں ورق دلو مرے فسانے کے
کوئی سنے تو مجھے قصہ دوام ہوں میں

مری نگاہ بھی مجھ پہ کبھی نہیں اٹھتی
مرا وجود ہی کیا ہے، برائے نام ہوں میں

بنا چمن میں کبھی آشیاں کی رکھی تھی
اسی خطا پہ بس اب تک اسیر دام ہوں میں

ہے فرط شوق میں یہ امتیاز بھی مشکل
پیامبر ہوں ترا، یا ترا پیام ہوں میں

سخن شناس مری قدر کیا کریں کشتہ
ادیب ہوں نہ کوئی صاحب کلام ہوں میں

اے بادِ بہاری

(از سید مقبول حسین احمد پوری، بی۔اے، ایل ایل، بی)

دیکھی نہیں جاتی ترے گلزار کی خواری
مرجھائے ہوئے نخل ہیں اُجڑی ہوئی کیاری
دل توڑ نہ دے بلبلِ مایوس کی زاری
اس باغ میں کب آئیگی پھر تیری سواری

اے بادِ بہاری !

اغیار کے گلشن سے محبت ہے تجھے کیوں؟
کانٹوں میں اُلجھ رہنے کی عادت ہے تجھے کیوں؟
کیوں اپنے ندیموں سے یہ وحشت ہے تجھے کیوں؟
پھولوں سے خدارا یہ عداوت ہے تجھے کیوں؟

اے بادِ بہاری !

کچھ یاد تو آتا ہے، کبھی تیرے کرم سے
واقف بھی نہ تھے ہم خلشِ بیم و اَلم سے
تھی کونسی برکت جو نہ تھی تیرے قدم سے
کترا کے خزاں دُور نکل جاتی تھی، ہم سے

اے بادِ بہاری !

کیا خوب وہ دن تھے کہ ترا ہم پہ کرم تھا
اُجڑا ہوا اپنا یہ چمن رشکِ اِرم تھا
شمشیر و عَلم بس میں تھے قابو میں قلم تھا
تب ہم میں بھی اِک آن تھی تب ہم میں بھی دم تھا

اے بادِ بہاری !

کیا بات ہے کشمیر سے تا راسِ کماری
گلزار پہ غم ایک زمانے سے ہے طاری
رُخسار پہ پھولوں کے نہیں رنگ کی دھاری
کیا یاد بھی آتی نہیں اب تجھکو ہماری؟

اے بادِ بہاری !

قطعات

یونہی آسان کٹ نہیں سکتی
زندگانی کا سلسلہ ہے دراز
جس کو کہتے ہیں لوگ شادی و غم
ہیں اسی راہ کے نشیب و فراز

فکر انساں کی ہر بلندی دیکھ
کہیں رکتی نہیں بشر کی نگاہ
آسماں پر یہ کہکشاں کا نشاں
ہے اسی کارواں کی گردِ راہ

(ایشیا)
محترمہ سلمیٰ لاہور

سرشاہ محمد سلیمان مرحوم

(از حضرت نظام الدین حسین نظامی بدایونی، ایڈیٹر ذوالقرنین)

کچھ غرض ہاں عشق و الفت سے نہیں — موت کو بس اک بہانہ چاہیئے
زندگانی ہے فقط نقش بر آب — اتنی سی مدت میں کیا کیا چاہیئے

یہ دو شعر شاہ مرحوم کے والد ماجد حضرت فدائی مرحوم کے دیوان سے لئے گئے ہیں۔ جن کو سرشاہ مرحوم اکثر مزے لے لے کر پڑھا کرتے تھے۔ ایک دفعہ دوسرے شعر کے اخیر مصرع کو اُن کی زبان سے سُن کر غالباً سنہ ۲۹ء میں میں نے اُن سے کہا تھا کہ ابھی تو آپ کو بہت کچھ کام کرنا ہیں، اگر آپ کو اپنے لئے نہیں تو ہمیں آپ کی ذات سے بہت کچھ چاہیئے۔ زندگی ضرور فانی ہے اور شاعر نے اس کو صحیح طور پر نقش بر آب لکھا ہے لیکن مولانا حالی صاحب کی یہ رُباعی بھی آپ نے سنی ہے :-

دنیائے دنی کو نقش فانی سمجھو — ہر چیز یہاں کی آنی جانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا — ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو

یہ سُن کر فرمانے لگے کہ یہ بھی سچ ہے اور وہ بھی سچ ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان مرنے ہی کے لئے پیدا ہوا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ابھی تو ہمیں آپ سے بہت کام لینا ہے اور آپ عرصہ تک زندہ رہیں گے، جب ملازمت کی حالت میں آپ نے قومی خدمت انجام دینے کی ہمت کی ہے، تو جب آپ ملازمت سے سُبکدوش ہو کر ریٹائر ہونگے تو خدا جانے آپ کی ذات سے ملک و قوم کو کیا کیا فائدے پہونچیں گے۔

کسے خبر تھی کہ سرشاہ مرحوم ریٹائر ہونے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو جائیں گے، اور ہماری آئندہ توقعات جو اُن کی ذات سے وابستہ تھیں پُوری نہ ہونگی۔ ابھی اُن کی عمر پچپن ۵۵ سال سے زیادہ نہ ہوئی تھی کہ وہ ہمیں داغ مفارقت دے گئے

سرشاہ مرحوم کی ابتدائی تعلیم جونپور میں ہوئی۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں میور سنٹرل کالج الہ آباد سے بی۔ اے پاس کیا اور یونیورسٹی میں اوّل آئے۔ سرکاری وظیفہ سے ولایت بھیجے گئے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں بیرسٹری پاس کی سنہ ۱۹۱۱ء میں قانون کی ڈگری حاصل کی، کچھ دنوں تک جونپور میں اور پھر ۱۹۱۳ء میں الہ آباد ہائیکورٹ

میں کام شروع کیا، بیرسٹری خوب چلی، اور کیوں نہ چلتی، آپ کے والد شاہ محمد عثمان بھی جونپور کے نامور وکیلوں میں تھے اور آپ کے دادا شاہ خادم علی مرحوم و مغفور نے ۱۸۵۷ء سے پہلے وکالت میں جو فروغ حاصل کیا تھا وہ عرصہ تک اس نواح میں لوگوں کے زبان زد رہا۔ خلاصہ یہ کہ آپ کی پرفطری ذہانت اور قابلیت نے خاندانی فضا میں مل کر آپ کو پانچ چھ سال کی مدت ہی میں اس وقت کے پُرانے مشہور قانون پیشہ اصحاب کا ہم پلّہ بنا دیا تھا۔

۱۹۲۰ء میں ہائی کورٹ کی ججی خالی ہونے پر آپ بار سے نکل کر بنچ میں گئے۔ جج کی حیثیت سے قانون میں ایسی ایسی موشگافیاں کیں کہ آپ کی قانونی قابلیت کی نہ صرف اس صوبہ میں بلکہ تمام ہندوستان میں دھوم مچ گئی۔ ۱۹۳۲ء میں ہائیکورٹ کے مستقل چیف جسٹس مقرر ہوئے۔

نیا آئین جاری ہونے پر ۱۹۳۷ء میں دہلی میں فیڈرل کورٹ قائم ہوئی اور حکومت نے ہندوستان کی اس سب سے بڑی عدالت کی ججی کے لئے آپ کا انتخاب کیا۔ ابھی اس عہدہ پر مقرر ہوئے تین برس کچھ مہینہ کی مدت ہوئی تھی کہ دہلی میں آپ کو ایک معمولی مرض لاحق ہوا جو آخر مرض الموت ثابت ہوا۔ اور ۱۲۔ مارچ یوم چہارشنبہ آدھی رات کے وقت آپ نے وفات پائی۔ بیماری کی خبر وفات سے تین چار روز پہلے مشتہر ہوئی تھی، جس نے تمام ہندوستان میں تشویش پیدا کر دی تھی۔ آپ کی تجہیز و تکفین دہلی میں عمل میں آئی۔ جنازے کی نماز سلطان علاؤالدین خلجی کی تاریخی مسجد کے صحن میں پڑھی گئی۔ دہلی کے علما، مشائخ اور عمائد اور مرکزی اسمبلی کے باہر کے اراکین شریک نماز تھے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کے مزار کے پاس صرف دو سو قدم کے فاصلہ پر سپرد خاک کئے گئے۔

دنیا ان کو فیڈرل کورٹ کے مرحوم جج کی حیثیت سے ہی نہیں روئے گی بلکہ ان کی ذات میں وہ خوبیاں تھیں کہ جو ہمیں آٹھ آٹھ آنسو رلائیں گی۔ وہ نہ صرف اعلیٰ درجہ کے مقنن تھے بلکہ ماہر فن تعلیم بھی تھے۔ تعلیم کے میدان میں پبلک طور پر ان کی قابلیت کا سب سے پہلا مظاہرہ بدایوں میں ۱۹۲۴ء میں ہوا تھا جب کہ انھوں نے صوبہ کی مسلم تعلیمی کانفرنس کی صدارت فرمائی تھی اور اپنا پُر از معلومات خطبہ ارشاد فرمایا تھا۔

۱۹۲۸ء میں اجمیر کے اجلاس آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت فرمائی اور اس کے بعد ہی رحمت اللہ کمیٹی کی رپورٹ شائع ہونے کے بعد جب مسلم یونیورسٹی کی کشتی ڈگمگا رہی تھی تو آپ نے اس کی ناخدائی کی ذمہ داری قبول کر کے تمام قوم کو ممنون منت بنایا۔ اور دوبارہ ۱۹۳۱ء میں آپ کا انتخاب اتفاق رائے سے وائس چانسلری کے عہدہ پر ہوا جس کی میعاد آئندہ مہینہ میں ختم ہونے والی تھی

یونیورسٹی کے بہی خواہ کئی مہینہ سے آپ سے التجا کر رہے تھے کہ آپ کم سے کم ایک ٹرم وایس چانسلری کا عہدہ پھر قبول کرلیں تاکہ آپ کے زیر نظر اسکیمیں بار آور ہوسکیں، لیکن آپ اس بار گراں کے اٹھانے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے۔ اور وفات سے پانچ روز پہلے آپ نے بیماری کی حالت ہی میں کورٹ کے ممبروں کے نام یہ پیام بھیجا تھا کہ "میں نے وایس چانسلری کا عہدہ صرف ایک میعاد کے لئے قبول کیا اس لئے میرا یہ مصمم ارادہ رہا اور ہے کہ آئندہ دوسری میعاد کے لئے وایس چانسلری قبول نہ کروں گا۔"

اس پیام کا حال جب ۹۔ مارچ کو علی گڑھ میں معلوم ہوا تو بھی بعض ممبران یہ خیال کرتے تھے کہ ابھی سر شاہ سے التجا کرنے کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے۔ لیکن ۱۳ کو مشیت نے اس اُمید کو ہمیشہ کے لئے منقطع کردیا۔ آپ کی وفات کی خبر سُن کر یونیورسٹی کے در و دیوار پر مایوسی چھا گئی، تعزیت کے ریزولیوشن پاس ہوگئے، یونیورسٹی ایک دن کے لئے بند کردی گئی۔

ماہر فن تعلیم کی حیثیت سے مسلم یونیورسٹی کے معاملات کو آپ نے جس طرح سدھارا وہ ہمیشہ یادگار رہیگا۔ ان مصروفیتوں کے باوجود آپ نے سائینس اور ریاضی کے شعبہ جات میں بھی اپنی ذہانت اور قابلیت کی بدولت خاص شہرت حاصل کی تھی۔

۱۹۳۳ء میں آپ نے اینسٹائن کے نظریۂ اضافیت Relativity کے غلط ہونے کا اعلان کیا تھا۔ دنیا اس اعلان سے حیرت میں پڑ گئی تھی۔ مگر ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء میں پروفیسر میچلوف نے سائبیریا میں تحقیقات کرکے بتادیا کہ سر شاہ کا نظریہ بالکل صحیح ہے آپ کی یہ بڑی خصوصیت تھی کہ سائینس اور ریاضی سے دلچسپی رکھنے کے ساتھ ساتھ آپ کو علم ادب سے بھی دلچسپی تھی۔ بیرسٹری کی حالت میں مقدمات کی پیروی کرنے کے لئے آپ جہاں جاتے اُردو ادب بالخصوص نظم کی کتابیں خریدتے، اس کے علاوہ دوستوں سے بھی فرمائش کرتے رہتے تھے کہ اُردو نظم کی جدید یا قدیم جو کتاب بھی مل جائے وہ ان کے لئے خرید لی جائے۔ کئی سال کی کوششوں سے انھوں نے اُردو ادب کا ایک اچھا خاصہ کتب خانہ جمع کرلیا تھا۔ صرف جمع کرکے اس کو الماریوں کی زینت نہیں بنادیا تھا بلکہ اس کو پڑھتے بھی تھے۔ اس مطالعہ کا یہ اثر ہوا کہ آپ نے ۱۹۲۲ء میں قصائد ذوق کی از سر نو ترتیب کی ضرورت محسوس کی، جس کی وجہ آپ نے اس کے دیباچہ میں یہ بتائی کہ "نوجوانانِ قوم کو جو اکثر اُردو ادب سے ناآشنا ہوتے ہیں یہ موقعہ ہاتھ آئیگا کہ اُردو شاعری کے ایک اُستاد کے کلام کو نئے لباس میں ملبوس دیکھکر اس کے مطالعہ کی طرف مائل ہوں۔"

اس کے بعد انتخاب غزلیات ذوق اور انتخاب غزلیات میر معہ تمہید اور مقدمہ کے شائع کیا۔ آپ کا ارادہ تھا کہ سلسلۂ کلام اساتذہ اُردو کی اشاعت کو جاری رکھیں گے۔ لیکن عدیم الفرصتی کے سبب ۱۹۳۰ء

کے بعد کوئی کتاب اس سلسلہ کی ترتیب نہ دے سکے۔

بہر حال قانون، سائینس، ریاضی کے مذاق کے ساتھ ساتھ اُردو ادب سے دلچسپی ان کی ذات میں جمع ہو جانے سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ قدرت نے ان کی ذات واحد میں ان اوصاف کو ایک جگہ جمع کر کے ان کی غیر معمولی ترقی کا یقین دلایا تھا جو سچ ہو کر رہا۔ باوجود اس ترقی اور اقبال کے ان کا اخلاق اعلیٰ درجہ کا تھا، اور اُن کے والد ماجد کے سوانح نگار نے جو الفاظ شاہ محمد عثمان رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاق کے متعلق لکھے ہیں وہی ورثہ میں سر شاہ کو ملے تھے: "وہ بڑے متواضع، سیر چشم، اقربا پرور، دوست پرست اور سخی تھے۔ اخلاق کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ ہر طبقہ کا ہر شخص یہ سمجھے کہ التفات و مروت کی نظر سب سے زیادہ مجھ پر ہے۔"

کل ہی کی بات ہے کہ بدایوں کے ایک غیر مسلم وکیل صاحب سے سر شاہ کے اخلاق کے متعلق گفتگو کرنے کا موقعہ ملا، وہ یہی کہتے تھے کہ "سر شاہ سب سے زیادہ مجھ پر مہربان تھے، اور اُن کے انتقال سے میں یتیم ہو گیا ہوں، وہ تو نہیں مرے میرے باپ مر گئے۔"

اس اخلاق اور خوبیوں کا انسان آسمان کی سیکڑوں گردشوں، زمانہ کی ہزاروں کروٹوں کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

خدا سے دعا ہے کہ وہ ان کی مغفرت کرے، اور آئندہ نسلوں کو اُن کے کارناموں کے دیکھنے اور سمجھنے کے لئے بصارت اور بصیرت عطا فرمائے۔ میں نے فوری حیثیت سے چند سطروں میں اُن کے بعض حالات اور اوصاف لکھکر اپنا فرض ادا کیا ہے۔ اُمید ہے کہ ملک کے قابل اور تعلیم یافتہ جماعت میں سے کوئی شخص اُن کی مبسوط سوانح عمری لکھکر ایک قومی ضرورت کو پورا کرے گا۔

۱۳۔ مارچ کو سر شاہ مرحوم کی وفات حسرت آیات کی خبر سنتے ہی ایک قطعۂ تعزیت بھی موزوں ہوا تھا جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں:۔

ھند کی اعلیٰ عدالت میں پڑا کہرام ہے　　سر سلیماں سا مقنن اس کو خالی کر گیا
آج دنیائے ادب بھی ہو رہی ہے سوگوار　　اس کا حامی اس کا محسن ہو گیا اُس سے جُدا
ماہر سائنس تھا اُس کی نئی تحقیق تھی　　قابلیت کا ہے اس کی آج شہرہ جا بجا
اس کی کشتی جب بھنور میں آ گئی تھی یک بیک　　مسلموں کی جامعہ کا وہ بنا تھا ناخدا
جامعہ کی اس نے جو خدمات کی تھیں بے غرض　　قابلِ تعریف بے شک اس کا یہ ایثار تھا
اب اُٹھایا جائیگا مجھ سے نہ یہ بارِ گراں　　مرنے سے پہلے یہی پیغام تھا مجکو دیا

جامعہ کے چھوڑنے سے قبل دنیا چھوڑ دی — تھی مشیت ہی یہی پورا نہ ہو یہ مدعا
وہ ہوا نظروں سے اوجھل کارنامے چھوڑ کر — اس کے زندہ رہنے کا دیتے ہیں گے وہ پتا
کیوں سلیماں کی فنا پر روتے ہیں اہل جہاں — صفحۂ عالم پہ اس کی ثبت ہے مہر بقا
یہ تو سب سچ ہے مگر میں اپنے دل کو کیا کروں — حال اس کا غیر ہے اب میں اسے سمجھاؤں کیا
فرض ہے بیگم سلیماں سے کروں میں تعزیت — اُن پہ یہ بپتا پڑی ہے راج ان کا لٹ گیا
اب تو بچے سامنے اُن کے ہیں ان کی زندگی — ہے نظامی کی دُعا دیکھیں انھیں پھولا پھلا

(۲)

(از خان بہادر مولوی بشیرالدین صاحب ایڈیٹر "البشیر")

ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان جج فیڈرل کورٹ اور وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی وجاہت اور قابلیت کے ساتھ نہایت با اخلاق، فیاض اور مہماں نواز بزرگ تھے۔ سب سے بڑی خوبی ان میں یہ تھی کہ ان میں غرور اور تکبر نام کو بھی نہ تھا۔ غریب سے غریب شخص سے بھی اخلاق و جانفشانی کے ساتھ ملتے تھے اور اپنے ملنے والوں کے ساتھ بلا خیال پوزیشن مساویانہ برتاؤ کرتے تھے۔ ان کو قانون و تعلیم سے خاص دلچسپی اور شغف تھا۔ بیرسٹری کرنے کے بعد کئی سال تک اُنھوں نے کسی قسم کے قومی کام میں حصہ نہیں لیا اس زمانہ میں مَیں نے اُن سے یہ شکایت کی کہ آپ قومی کاموں میں حصّہ کیوں نہیں لیتے تو مرحوم نے ارشاد فرمایا کہ جو نوجوان اپنی حیثیت درست کرنے کے قبل قومی کاموں میں حصّہ لیتے ہیں اُن کی ذات سے قوم کو نقصان زیادہ پہونچتا ہے اور نفع کم۔ لہذا میں نے یہ ارادہ کیا ہے کہ جب میری مالی حالت درست ہو جائیگی اور مجھ کو دنیا کا تجربہ بھی ہو جائے گا تو قومی کاموں میں حصّہ لوں گا۔ چنانچہ سب سے پہلے اُنھوں نے قومی کاموں میں اس وقت دلچسپی کا اظہار کیا جب الہ آباد میں پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا۔ مَیں نے خود بھی آنکھ سے دیکھا کہ وہ مثل ملازموں اور مزدوروں کے ہر چھوٹا بڑا کام خود اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ مرحوم کی علمی اور قانونی قابلیت مسلّمہ ہے۔ اِن کا خاندان سلطنت مغلیہ میں نہایت باعزت اور باوقار رہا۔ سلطنت مغلیہ کے ختم ہونے کے بعد ان کے خاندان کے بہت سے افراد انگریزی حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر سرفراز تھے، اور جہاں جو شخص رہا وہ پبلک کی نظروں میں معزز اور باا‌ثر ہو کر رہا۔

علمی قابلیت بھی اس خاندان کی خصوصیات میں سے تھی۔ لہذا علمی قابلیت مرحوم کو وراثت میں ملی تھی۔

تنقید کتب[^]

باقیات بجنوری[1]

مشہور غالب پرست ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کے نام نامی سے اُردو ادب کے قدردان بخوبی واقف ہیں۔ اس وقت ہندوستان کے سخن فہم طبقہ کی غالب پرستی میں ان کی جگرکاوی کا بہت بڑا حصہ ہے افسوس ڈاکٹر صاحب کی عمر نے وفا نہ کی اور بے وقت موت نے انھیں اُردو سے اس قدر جلد چھین لیا تاہم انکی بہت سی قابل قدر چیزیں عام قدردانی کی مستحق ہیں۔ ہم کو جامعہ ملیہ دہلی کا شکرگزار ہونا چاہیئے جس نے آپکے ادبی و تنقیدی مضامین، خطوط اور نظموں کا ایک مجموعہ "باقیات بجنوری" کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس کتاب کا سب سے پہلا مضمون فخر ہندوستان ڈاکٹر ربندرناتھ ٹیگور کی گیتانجلی پر ایک فاضلانہ تنقید ہے جس میں ڈاکٹر صاحب مرحوم نے وہی ڈھنگ اور وہی اسلوب تنقید اختیار کیا ہے جو دیوان غالب کے مقدمہ میں اختیار کیا تھا۔ دوسرا مضمون وضع اصطلاحات پر ہے جس میں ہدایت کی گئی ہے کہ غیر زبان کی اصطلاحات کا ترجمہ کرتے وقت غیر مانوس اور ثقیل عربی یا سنسکرت لفظوں یا ترکیبوں کی ٹھونس ٹھانس نہ کرنا چاہیئے۔ اگر عمدگی سے ہوسکے تو فارسی سے کام لیا جائے ورنہ اصلی زبان کی اصطلاح ہی استعمال کی جائے۔ اس سلسلہ میں آپ نے چند نمونے بھی پیش کئے ہیں۔ تیسرا مضمون لکھنؤ کی سیر ہے جو بہت دلچسپ و سبق آموز ہے اس میں لکھنؤ اور لکھنؤ والوں پر خاصی تنقید کی گئی ہے۔ اس کے بعد مرحوم کے چند خطوط بھی دیے گئے ہیں جن میں فلسفیانہ استدلال اور حکیمانہ باتوں سے کام لیا گیا ہے۔ آخر میں پرانی چال کی نظمیں ہیں جن میں کوئی خاص بات نہیں لیکن نثر کے مضامین اور خطوط گراں قدر انشاپردازی کا قابل تقلید نمونہ ہیں۔ بہرحال جامعہ ملیہ نے یہ مجموعہ شائع کرکے بعض ادبی جواہرات کو کتابی صورت میں محفوظ کردیا ہے۔

گلبانگ حیات

یہ نظرفریب اور دلآویز کتاب خان بہادر خواجہ محمد مسیح پال تخلص امین حزین سیالکوٹی کے پسندیدہ

---

[1] چھپائی ٹائپ کاغذ عمدہ جلد نظرفریب ضخامت ۲۴۲ صفحات۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ ؎ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔

[^] تنقید کے لئے کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہے۔ (ا۔ ن)

کلام کا قابل قدر مجموعہ ہے۔ آمین صاحب ایک پُرگو اور کہنہ مشق شاعر ہیں، اور ملک کے اکثر رسالوں میں ان کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ آپ کے نام کے ساتھ الفاظ "مسیح" اور "پال" سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ آپ عیسائی ہیں بلکہ آپ کشمیری مسلمان ہیں۔ آمین صاحب شروع شروع میں مولانا ظفر علی خاں یا مولانا محمد علی مرحوم کے رنگ سے متاثر تھے لیکن بعد میں جب خیالات و جذبات کے اندر زیادہ پختگی اور سنجیدگی پیدا ہوئی تو آپ نے ڈاکٹر اقبال کا رنگ اختیار کیا۔ بہرحال آپ کا کلام عموماً حکیمانہ اور جوش عمل سے معمور ہوتا ہے، مثلاً آپ فرماتے ہیں:-

زندگی نام ہے ماحول پہ چھا جانے کا   بزم کو بادۂ کردار سے گرمانے کا

ظرف عالی ہے تو اے رندِ خراباتِ عمل   خم بہ آغوش ہے قطرہ ترے میخانے کا

اس مجموعہ میں بعض نظمیں بہت گرانمایہ ہیں اور قطعات بھی اچھے اور سبق آموز ہیں۔ غزلوں کا بھی کافی حصہ ہے۔ جن میں گو شوکتِ الفاظ سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن وہ برجستگی اور وہ رنگینی نہیں ہے جو شاعری کا طرۂ امتیاز ہونا چاہیے۔ بعض بعض جگہ ہندی ذخیرہ کھپانے کی بھی کوشش کی گئی ہے، مثلاً:-

جی کا وظیفہ تیری تمنّا   نینوں کا کاجل نورِ تجلّے

اس شعر میں "جی"، "نینوں" اور "کاجل" استعمال کئے گئے ہیں مگر "وظیفہ" اور "نور تجلی" کے ساتھ جوڑ ٹھیک نہیں بیٹھ سکا۔ اور "نینوں کا کاجل" میں "دو کا" بری طرح سے متصل آگئے ہیں۔

سُکھی خود تھی اور ساک سینوں کا سُکھ تھی   پتی، ساس اور بھائی بھینوں کا سُکھ تھی

بہو کیا تھی گھر بھر کے نینوں کا سُکھ تھی   رہا جب تلک اس کا مسکن حویلی

بہو بیٹیوں کا اب اللہ بیلی!

اس بند میں بھی ہندی کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، مگر "ساک سینوں" عام فہم نہیں ہے۔ ممکن ہے پنجاب کا کوئی محاورہ ہو اور "بھینوں" (یعنی بہنوں) تو بالکل ہی ٹکسال باہر ہے۔ غالباً "سینوں" اور "نینوں" سے جوڑ ملانے کے لئے تصرف سے کام لیا گیا ہے، لیکن ذوقِ سلیم کے نزدیک یہ تصرف بیجا ہے۔ اس کے علاوہ جدید شاعری میں لفظ "تلک" بھی متروک ہے۔ ایک تازہ غزل کا شعر ہے:-

محمل کی اوٹ میں لبِ لیلیٰ شفق فروش   دشتِ جنوں میں قیس ہے غوغا لئے ہوئے

پہلے مصرعہ میں "لبِ لیلیٰ شفق فروش" کی حسین ترکیب داد سے باہر ہے، لیکن دوسرے مصرعہ میں قیس کے "غوغا لئے ہوئے" نے تمام مزا کرکرا کر دیا۔ شروع میں سر عبد القادر کا ایک فاضلانہ مقدمہ ہے جس میں حضرت امین حزیں کے سوانح حیات پر روشنی ڈالتے ہوئے اُن کے کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے[1]

---

[1] لکھائی چھپائی اچھی کاغذ عمدہ حجم ۲۰۴ صفحات۔ قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ اردو اکیڈمی پنجاب لوہاری دروازہ لاہور

علمی خبریں اور نوٹ

چھ سال ہوئے کہ زمانہ بابت اپریل ۱۹۳۵ء میں مرحوم منشی پریم چند جی نے "اردو۔ ہندی۔ ہندستانی" کے عنوان سے ایک اہم مضمون لکھکر اُردو ادیبوں کی توجہ اس ضروری مسئلہ پر مبذول کی تھی۔ چنانچہ ابتک زمانہ میں تقریباً تیس مضامین چھپ چکے ہیں جن میں اس مسئلہ کے ہر پہلو پر اظہار خیالات کیا گیا ہے۔ زمانہ جون جولائی ۳۵ء میں مسٹر حامد اللہ افسر و مرزا عظیم بیگ چغتائی نے ہندی اُردو کے قضیہ کے متعلق قابل غور مضامین لکھے۔ زمانہ نومبر ۳۵ء میں پنڈت منوہر لال صاحب زتشی کا مضمون شائع ہوا۔ جنوری ۳۶ء میں مسٹر ریاض الدین احمد خاں بی۔اے نے "اُردو زبان اور رسم الخط" پر اظہار خیالات فرمایا۔ فروری ۳۶ء میں مسٹر سلیم جعفر کا مضمون "ہماری قومی زبان" چھپا۔ مئی ۳۶ء میں مسٹر بیتاب بریلوی نے "اُردو یا ہندی" پر مضمون لکھا۔ فروری ۳۷ء میں مسٹر سلیم جعفر نے "ہندی رسم الخط کے ارتقا" پر ایک محققانہ مضمون لکھا۔ اکتوبر ۳۷ء میں مسٹر بابو دیال جین نے "ہماری قومی زبان" اور اپریل ۳۸ء کے زمانہ میں حضرت جگر بریلوی نے ہندو ادیبوں کی حق تلفی کی شکایت کر کے ایک دُکھتی ہوئی رگ پر انگلی رکھی۔

اس کے بعد اس مسئلے پر حضرت سہیل اور کئی صاحبوں کے اہم مضامین شائع ہوئے۔ اکتوبر ۳۸ء میں "حق پرست" نے اُردو۔ ہندی۔ ہندستانی کے مسئلہ پر ہندو قوم پرستوں کے نقطۂ خیال کی مزید وضاحت کی۔ مسٹر سہیل نے اپریل ۳۹ء میں عام سیاسی نقطۂ خیال سے بحث کی۔ اسی نمبر میں حق پرست کا اس مسئلہ پر ایک دوسرا مضمون شائع ہوا۔ اس کے بعد جون۔ جولائی ۳۹ء میں ایک گمنام ادیب اور مسٹر منوہر لال طالب کے مضامین درج ہوئے۔ اگست و نومبر ۱۹۳۹ء میں "حق پسند" صاحب نے اپنے خیالات اور عقائد کی مزید تشریح کی اور اپنے معترضین کے اعتراضات کے جواب دیئے۔ فروری ۴۰ء میں ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے ایک عام اور مشترکہ زبان کے تمام پہلوؤں پر اصولی حیثیت سے بحث کر کے اُردو کو ملک کے بڑے حصہ کی عام زبان بنانے کی تدبیریں بتائیں۔ ڈاکٹر موہن سنگھ کی تجویزیں دُور رس اور دیرپا نتائج پیدا کرنے والی ہیں جن پر ہمارے نامور ادیب حضرت آرزو لکھنوی عرصہ سے عملدرآمد کر رہے ہیں۔ حضرت آرزو نے جس کامیابی سے عام ہندوستانی زبان میں شاعری کا حق ادا کیا ہے اس کا نمونہ ان کے نوطبع مجموعۂ کلام "سُریلی بانسری" وغیرہ میں موجود ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ ملک میں جا بجا اُن کے طرز کی پیروی ہو رہی ہے چنانچہ عظمت اللہ صاحب مرحوم نے اسی زبان میں کئی مشہور نظمیں لکھیں آج بھی مقبول حسین صاحب احمد پوری اکثر نظمیں اسی عام فہم زبان میں لکھتے ہیں اور حال ہی میں "دو پھول"

کے عنوان سے پنڈت آنند نرائن ملا کی ایک دلکش نظم زمانہ میں شائع ہو چکی ہے۔ یہ نظمیں اردو ہندی دونوں حروف میں چھپ سکتی ہیں اور چھپی بھی ہیں۔ ہم نہیں کہتے کہ علمی مباحث کے لئے دونوں زبانوں کا فرق آسانی سے مٹایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ روزمرہ ضروریات کے لئے دونوں زبانیں ایک دوسرے کے بہت قریب لائی جا سکتی ہیں۔ اور اردو کو سہل سلیس اور عام فہم بنا کر اس میں خالص ہندوستانی عنصر کو زیادہ سے زیادہ داخل کر کے ہم اس کی توسیع و ترقی میں بہت کچھ اضافہ کر سکتے ہیں۔ محاورات اور املا دونوں میں ہم کو عوام کی ضروریات کا پورا لحاظ رکھنا چاہئے کیونکہ اس کے بغیر ہم اردو کو عام پسند اور ہر دلعزیز نہ بنا سکیں گے بہرحال اسی بحث کی ایک دوسری کڑی صحت الفاظ کا مباحثہ ہے جو مرزا عظیم بیگ چغتائی نے زمانہ دسمبر ۱۹۴۱ء میں شروع کیا۔ ہمارا خیال تھا کہ کل ہند اردو کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں جو دسمبر ۱۹۴۱ء کی آخری تاریخوں میں کانپور میں ہوا اس مسئلہ پر پوری طور سے غور کیا جائے گا لیکن معمولی ریزولیوشنوں کے سوائے کانفرنس نے کسی خاص مسئلہ پر کوئی توجہ نہیں دی۔ چغتائی صاحب نے اردو ادیبوں سے عموماً اور جناب اثر لکھنوی سے خصوصاً اس گتھی کو سلجھانے کی اپیل کی تھی۔ خوشی کی بات ہے کہ مکرمی اثر صاحب کے علاوہ اور کئی صاحب تحقیق ادیبوں نے بھی اس مسئلہ پر اظہار خیالات فرمایا ہے۔ چنانچہ اس ماہ کے پرچے میں اس کے متعلق کئی قابل قدر اور قابل غور مضامین درج کئے گئے ہیں۔ بعض اہل الرائے احباب اور محققین نے اس سلسلے میں ایڈیٹر کے نام خاص خطوط بھی لکھے ہیں۔ مثلاً مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی ۲۹ جنوری ۱۹۴۲ء کے خط میں ادب اردو کے ایک دیرینہ خادم کی حیثیت سے تحریر فرماتے ہیں:۔

"عربی۔ فارسی۔ انگریزی وغیرہ کے جو الفاظ اردو میں مل جل گئے ہیں وہ اردو زبان کا جزو بن گئے ہیں، ان کی صحت و غلطی کے باب میں تو اردو ہی کا محاورہ اردو ہی کی قواعد معیار کا کام دیں گے "لالٹین" بولتے وقت انگریزی کے تلفظ کی پابندی غلط ہی نہیں بلکہ مضحکہ انگیز ہوگی۔

البتہ جن الفاظ کی حیثیت اردو میں ابھی صرف مہمان کی ہے، اور وہ اردو زبان کا جزو نہیں بنے ہیں اُن میں ترین احتیاط یہی ہے کہ خود انھیں کی زبان کا تلفظ وغیرہ ملحوظ رکھا جائے۔ گو اُن کے اردو استعمال کو بھی غلط قرار دے دینا مشکل ہی ہے۔

باقی عام فہم اردو الفاظ کو چھوڑ کر خواہ مخواہ عربی الفاظ لانے کا طریقہ بھی صحیح نہیں۔ مثلاً "چندہ" کے بجائے "بدل اشتراک" یا "فہرست" کے بجائے "فہرس" وغیرہ۔ البتہ "ہوائی جہاز" (Airship) اور طیارہ (Airoplane) مختلف چیزیں ہیں، اس لئے "طیارہ" لانے میں مضائقہ نہیں۔ گو یہاں بھی عام فہم لفظ "ہوائی کشتی" کا چل سکتا ہے"۔ اس کے بعد آپ لکھتے ہیں کہ:۔

میری تو عرصہ سے تجویز ہے کہ اُردو ہندی قضیہ کو چکانے کے لئے ایک کل ہند "ہندوستانی کمیٹی" بنا دی جائے جسکا ایک ممبر بھی مسلمان نہ ہو اور تصفیہ اسی پر چھوڑ دیا جائے۔ چند نام بھی ایسی کمیٹی کے لئے میرے ذہن میں ہیں:-

(۱) سر تیج بہادر سپرو (الہ آباد)　(۴) منشی دیا نراین نگم (کانپور)

(۲) پنڈت برج موہن ناتھ کیفی (دہلی)　(۵) پنڈت انند نراین ملّا (لکھنؤ)

(۳) راجہ محبوب پرشاد (حیدر آباد دکن)　(۶) پنڈت امرناتھ ساحر (دہلی)

یہ چند نام محض نمونہ کے طور پر ہیں۔ (رائے زادہ گوبند پرشاد (بھوپال)، ڈاکٹر تارا چند (الہ آباد) وغیرہ اور حضرات بھی بہ آسانی مل سکتے ہیں۔

ایک اور قابل مضمون نگار لکھتے ہیں کہ چغتائی صاحب نے یقیناً دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا ہے۔ ان کے مضمون کی ہر سطر میں ان کا خلوص جھلک رہا ہے۔ یوں بھی اُردو دنیا میں ان کی جو پوزیشن ہے اس کی وجہ سے ان کے خیالات احترام کے مستحق ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ارباب فن ان کے پیش کئے ہوئے مسائل پر غور کریں گے اور ان کو حل کرنے کی کوشش کریں گے۔

عجب لطف کی بات ہے کہ عوام کی روزمرہ ضروریات اس اہم اور نازک مسئلہ کو جو ہمارے لئے اتنا دشوار بن گیا ہے ایک حد تک خود بخود حل کر رہی ہیں۔ چنانچہ موجودہ جنگ کے سلسلے میں غیر ملکی ریڈیو کے روزمرہ اعلانات میں کتنے ہی لفظوں کے مقبول عام ترجمے ہو گئے ہیں۔ ہمارے قواعد داں بزرگ کچھ ہی کہیں مگر ان میں سے اکثر ترجمے عام زبان کے جزو بن جائیں گے، بالکل اسی طرح جس طرح Positive اور Negative برقی لہر کے لئے خود برقی کارخانوں کے کاریگروں نے گرم اور ٹھنڈے تار کی اصطلاح وضع کر لی۔ اگر اس اصول کو مدنظر رکھکر ہم اُردو زبان کی توسیع و ترقی کی کوشش کریں تو شاید یہ مسئلہ ایسا مشکل نہ رہے

۱۳-۱۲ مارچ کی درمیانی رات کو چند روز کی علالت کے بعد آنریبل جسٹس سر شاہ سلیمان صاحب جج فیڈرل کورٹ کی صرف ۵۵ سال کی عمر میں وفات ملک کے علاوہ اردو ادب کے لئے بھی ایک سانحہ عظیم ہے پچھلے بیس سال کے اندر آپنے اپنی غیر معمولی قابلیت جودت طبع اور محنت شاقہ کی بدولت ملک میں ایک خاص پوزیشن حاصل کر لی تھی آپ الہ آباد یونیورسٹی کے ایک بہترین گریجویٹ اور ہر حیثیت سے صوبہ متحدہ کے علمی و ادبی حلقوں کے رکن اعظم تھے آپ کی قانونی نکتہ دانی کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ آپ ۱۹۲۰ء میں صرف ۳۴ سال کی عمر میں الہ آباد ہائیکورٹ کے جج مقرر ہوئے اسکے بعد ۱۹۳۱ء میں قائم مقام اور ۱۹۳۲ء میں مستقل چیف جسٹس مقرر ہوئے۔ آپ کی نکتہ سنجی اور معاملہ فہمی کا سب سے نمایاں اظہار مقدمہ سازش میرٹھ کی اپیل کے وقت ہوا جس کا فیصلہ آپ نے صرف نو دن میں سنا دیا تھا۔ عدالت سخن فہمی میں یہ

مقدمہ برسوں چلا تھا۔ لیکن اپیل میں آپ نے مہینوں کا کام دنوں میں کر ڈالا اور گورنمنٹ ایڈوکیٹ وکلا اور ملزمان سب آپ کی نکتہ رسی اور تجربہ کاری پر عش عش کرتے رہ گئے۔ پشاور فائرنگ کی تحقیقاتی کمیٹی میں بھی آپ نے ملک کی اہم خدمت انجام دی، اور گو گورنمنٹ نے آپکی رپورٹ شائع نہیں کی لیکن کہا جاتا ہے کہ آپ نے معاملات کی تہ پر پہونچکر بے لوثی سے کل واقعات گورنمنٹ کے سامنے کھولکر رکھدیے تھے۔ ہندوستان اور انگلستان کے فوجی مصارف کی جانچ کمیٹی میں بھی آپ نے خاص قابلیت سے کام کیا۔ اس کے بعد جب فیڈرل کورٹ قائم ہوئی تو آپ اس کے جج مقرر ہوئے۔ اسی اثنا میں علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے بھی آپ نے قوم کی بہترین خدمت انجام دی۔

انتظامی قابلیت اور قانونی فضیلت کے علاوہ آپ کو علم ریاضی میں بھی خاص ملکہ تھا، چنانچہ اس مد میں دنیا کے ماہرین سائنس نے آپ کی علمی تحقیقات کی داد دی ہے۔ آپ کو طبعیات اور ریاضیات دونوں میں ید طولیٰ حاصل تھا

قانونی مسائل پر غور وفکر کے بعد جو وقت بچتا تھا وہ آپ طبعیات کے بعض اہم مسائل کی تحقیق وتفتیش میں صرف کرتے تھے۔ چنانچہ آپ نے دنیا کے نامور ماہر سائنس پروفیسر آئنسٹن کے نظریۂ اضافیت کی نکتہ چینی کر کے ایک نیا نظریہ پیش کیا جسکی صحت ماسکو کے مشہور ومعروف ماہر علم نجوم پروفیسر Michailor نے تسلیم کی۔ ان ادق اور خشک علوم کے ساتھ ساتھ آپ اُردو ادب کے بھی سچے قدردان اور مستقل خدمتگزار تھے۔ آپ کے ماجد کو شاعری سے خاص ذوق تھا، آپ کو بھی شعر وسخن سے بڑی دلچسپی تھی۔ چنانچہ آپ نے قصائد ذوق، مثنویات میر وغیرہ کے خاص ایڈیشن مرتب کئے، اور اردو ادیبوں اور شاعروں کی ہمیشہ دل کھولکر قدر کی۔ جب کبھی کوئی نامور انشا پرداز یا شاعر الہ آباد میں آتا تو آپ نے اسکی عزت افزائی کرنا ہمیشہ اپنا فرض منصبی سمجھا۔ در اصل آپ کا اخلاق اتنا وسیع تھا کہ ہر کس وناکس کے ساتھ خندہ پیشانی، شگفتہ مزاجی اور حسن سلوک کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ایڈیٹر زمانہ پر بھی آپ کی خاص نظر عنایت تھی اور زمانہ کی ترقی واستقلال کے سلسلے میں آپ کی ذات گرامی سے بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ آپ نے بارہا اس کے متعلق ہر ممکن مناسب کوشش کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ افسوس یہ تمام اُمیدیں اب خاک میں مل گئیں۔ مگر سر شاہ سلیمان کی ناوقت وفات سے ملک نہ صرف ایک فخر زمانہ محسن ادب بلکہ ایک بہترین جج ایک اعلیٰ ترین ماہر سائنس اور ایک بے لوث رہنما کی خدمات سے محروم ہو گیا ہے۔ یہ کمی مدتوں میں بھی پوری نہ ہو سکے گی۔ ملک کی اس سے زیادہ کیا بدنصیبی ہو سکتی ہے کہ سر شاہ سلیمان جیسے نیک نفس اور اُلو العزم قدردان علوم وفنون اس قدر جلد داغ مفارقت دے جائیں اس سانحۂ عظیم میں ہم اُن کے اہل خاندان اور اعزا کے شریک غم ہیں، اُن کا نقصان ملک اور قوم کا نقصان ہے لیکن انسان مجبور ولاچار ہے اور مشیت ایزدی میں چون وچرا کی مجال نہیں۔ افسوس۔ صد افسوس۔

The ZAMANA, APRIL 1941 REGD. No. A 147

زمانہ

مرتبہ: دیانرائن نگم

جلد ۷۶	اپریل سنہ ۱۹۴۱ع	نمبر ۴

فہرست

قیمت سالانہ پانچ روپیہ ۵ مع محصول ڈاک غیر سے آٹھ روپیہ

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

زمانہ

جلد ۷۶ — اپریل سنہ ۱۹۴۱ء — نمبر ۴

اُردو۔ہندی۔ہندوستانی

(از نواب محمود علی خاں عرف آغا علی خاں رئیس الہ آباد)

زمانہ کے انقلابی دور نے جہاں ہندوستان میں سیاسی بیداری پیدا کی وہاں ماحولی کشمکش بھی پیدا کردی ہے۔

پانی کے بہاؤ کو جب کسی مضبوط پتھریلے پشتے سے روک دیا جائے تو جب وہ پتھر سے ٹکرا کر واپس ہوتا ہے تو ردّ عمل کے ساتھ اندرونی کشمکش میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہی حالت اس وقت ہندوستان کی دو بڑی قوموں کی ہو گئی ہے۔ سلطنت سے ٹکرانے کے بعد اندرونی کشمکش کا پیدا ہونا ایک فطری چیز بنی ہوئی اور اگر دیانتداری سے روکی نہ گئی تو اور بڑھتی جائیگی۔ اس مختصر مضمون میں میں محض اُردو زبان کے مسئلہ پر ناظرین کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں۔

ہندوستان کے اُردو رسالوں میں آج کل "اُردو ہندی اور ہندوستانی" پر مضامین نکل رہے ہیں اور ہر مضمون نگار اپنے نقطۂ نظر سے پوری قوت اپنی تائید میں صرف کر رہا ہے۔ مگر اس کی کوشش نہیں کی جاتی کہ جس منزل پر کوئی صورت بھی اختلاف کی پیدا ہو گئی ہو اس کو رفع کرنے کی سعی کی جائے۔

اس بحث کے چند مسائل ایسے ہیں جن میں کسی کو اختلاف نہیں ہے، مثلاً اُردو دو بڑی قوموں کے میل جول، ضرورت اور تبادلۂ خیال کی وجہ سے ہندوستان میں پیدا ہوئی، یہیں اس کی نشو و نما ہوئی اور یہیں پروان چڑھی، اور اس کی پرورش اور تربیت میں جتنا مسلمانوں کا حصہ ہے اتنا اگر

نہیں تو بہت بڑی حد تک ہندو صاحبان کا بھی ضرور ہے۔ متقدمین کے علاوہ اس وقت بھی باوجود ایک بہت بڑے طوفان کے منشی دیا نراین صاحب نگم کی طرح بہت بڑی تعداد ہندو صاحبان کی اُردو کی خدمت کو اپنا ضروری فریضہ بنائے ہوئے ہے اور اُن پر کوئی اثر خلاف فطرت طوفان کا نہیں پڑا۔

رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو بالقابہ کا یہ ارشاد سنہرے حرفوں سے لکھنے کے قابل ہے کہ "اُردو ہندو مسلمانوں کا مشترکہ متروکہ ہے جو ناقابل تقسیم بھی ہے۔" ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے الہ آباد کے یوم اُردو کے جلسے میں جو تقریر فرمائی ہے اُس میں بہت صحیح ارشاد فرمایا ہے کہ دنیا کی مختلف زبانوں کی تاریخ میں یہ ایک معجزہ سے کم نہیں ہے کہ اُردو نے ہندوستان میں بغیر سلطنت یا کسی قوت کی امداد کے خود ترقی کی ہے۔

مگر باوجود ان سب مسلمہ باتوں کے چند صاحب الرائے ہندو صاحبان کو اُردو ادب سے کچھ شکایتیں پیدا ہو گئی ہیں، اس لئے ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے کہ آیا وہ شکایتیں صحیح ہیں یا محض وقتی جذبات سے متاثر ہو کر کی گئی ہیں۔

گاندھی جی کے علاوہ جنھوں نے اپنی لاعلمی سے اُردو کو قرآن کی زبان بھی فرمایا ہے۔ غور کرنے سے نیچے لکھی ہوئی تین شکایتیں ایسی ہیں جن پر بحث کرنا ہے:۔

۱۔ اُردو کو ہندوستانی فطرت سے کوئی لگاؤ نہیں ہے،

۲۔ اُردو ادب میں ہندو کلچر، تہذیب اور معاشرت نہیں ہے اور اگر ہے تو بہت کم۔

۳۔ بلا ضرورت عربی اور فارسی کے الفاظ اُردو میں داخل کر دیئے گئے ہیں۔

پہلی شکایت چونکہ ایک ذمہ دار ہستی کے قلم سے نکلی ہے اس لئے اس کا لکھنا ضروری تھا، اور اگر وہ خود اپنی اس تحریر میں اس کی تفصیل نہ لکھدیتے تو یہ سمجھا جاتا کہ انھوں نے وقتی جوش سے متاثر ہو کر خلاف فطرت یہ جملہ لکھدیا ہے، مگر چونکہ تفصیل میں اُنھوں نے اس کی تشریح شکایت ۲ کے رنگ میں کی ہے اس لئے اصولاً ۱ اور ۲ کی شکایتیں ایک ہی سمجھی جانا چاہئیں، کیونکہ جو واقعات اُوپر لکھے گئے ہیں اُن کو دیکھتے ہوئے (اُردو کو ہندوستانی فطرت سے لگاؤ نہیں ہے) کا قول (خود خلاف فطرت ہے)

میری رائے میں یہ شکایت ہندو صاحبان کی صحیح ہے، اور اُردو کے شعرا اور مصنفین کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص اس طرف توجہ کرنی چاہیئے، اور اس لئے بھی کہ بہترین شاعری اور ہر قسم

کے جذبات اور مناظر کی صحیح ترجمانی وہ ہے جو ماحول کو دیکھکر اور اُس سے متاثر ہو کر کی جائے۔ کیا کوئل کی مستانہ آوازیں یا جذبات کو اُبھارنے والی غم انگیز پپیہے کی فریادیں شاعر کو دعوتِ نظم نہیں دیتیں اسی طرح برسات کا موسم اور اس زمانے کے مناظر، یا ہمالیہ کے بعض حصّے اتنی کشش نہیں رکھتے کہ ان کی طرف توجہ کی جائے۔ اسی طرح کرشن جی کا نغمۂ محبت یا ہندو مخدرات کی شوہر پرستی سے ایک بہترین درس نہیں ملتا ہے؟

یہ دیکھکر خوشی ہوتی ہے کہ خان بہادر نواب مرزا جعفر علی خاں صاحب وزیر کشمیر نے کرشن جی پر ایک بہترین نظم لکھی ہے، اور اسی طرح سے اکثر مسلمان شعراء اس غلطی کا اعتراف کر رہے ہیں مگر مجموعی حیثیت سے ہم اس کمی کو پورا نہیں کر رہے ہیں جو فطرتاً اور انصافاً ہم کو کرنی چاہیئے۔

معاف کیا جائے اگر میں یہ عرض کروں کہ مسلمان شعراء اور مصنفین سے زیادہ ہندو شعراء اور مصنفین قابل الزام ہیں جنھوں نے ایسے فطری جذبات کو کیوں دبایا اور کس لئے اس طرف توجہ نہ کی جو ان کے لئے نہ محض ایک فطری چیز تھی بلکہ ایک فرض کی حیثیت بھی بعض چیزوں میں رکھتی تھی

تیسری شکایت میں یا تو غلط فہمی ہوئی ہے یا غلط فہمی پیدا کرائی گئی ہے۔ اُردو ادب کے جتنے فطری شاعر ہیں یا اچھے مصنف ہیں اُنھوں نے عربی کے الفاظ یا فارسی ترکیبیں کبھی بلا ضرورت استعمال نہیں کی ہیں، اور جن حضرات نے بلا ضرورت استعمال کی ہیں اُنھوں نے اُردو کی خدمت نہیں کی بلکہ اس کو نقصان پہونچایا ہے۔ ہم کو ایسے حضرات سے کوئی سروکار نہیں ہے، اور نہ اُن کی تصانیف نے کوئی خاص درجہ اُردو ادب میں حاصل کیا ہے۔ آپ خود غور فرمائیے کہ اُردو ایک اشتراکی زبان ہے، اس کے اجزا ترکیبی ایسے ہیں جس کی تعمیر مختلف زبانوں اور محاوروں سے ہوئی ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بلا وجہ اور بلا ضرورت عربی۔ فارسی۔ انگریزی اور سنسکرت کے ایسے الفاظ ٹھونسے جائیں جو نہ محض ثقیل ہوں بلکہ اُردو کی دلکشی اور شیرینیت کو ختم کردیں، اور نہ ایسے الفاظ اُردو سے نکالے جائیں جن کا وجود نہ محض ضروری ہے بلکہ اُن کی ادبی صلاحیت اور موسیقیت اُردو کو بلند کرتی جاتی ہے۔ مثلاً انگریزی کے الفاظ اسٹیشن، کانگریس وغیرہ کو نکال کر اس کی جگہ پر کوئی دوسرا لفظ خواہ کتنی ہی تلاش سے آپ رکھیں تو نہ محض اس کا صحیح مفہوم پیدا نہ ہوگا بلکہ ایک عجیب و غریب معنی گمراہی میں آپ ہندوستان کو مبتلا کردیں گے۔

یہ ہو سکتا ہے کہ آپ تھرمامیٹر کا ترجمہ آلہ مقیاس الحرارت کردیں، مگر اس کا خیال رہے کہ اُردو ادب کے دائرہ کو کم کرنے کے علاوہ آپ کو اس سے مانوس کرنے کے لئے ایک نسل کی ضرورت ہوگی

فارسی اور عربی کے بعض ایسے الفاظ بھی ہیں جن کو اُردو سے نکالنا اس کی دلکشی اور موسیقیت کو ختم کر دینا ہے ۔

ہندوستان کے شیکسپیئر جناب میر انیس صاحب مرحوم کے دو مصرعوں سے آپ میرا مفہوم اچھی طرح سے سمجھ لیں گے کہ باوجود اوس اور شبنم ہم معنی الفاظ ہونے کے جہاں شبنم کے لفظ کی ضرورت ہے وہاں اوس نظم کیا جائے تو نہ محض نظم کی موسیقیت ختم ہو جائیگی بلکہ یہ معلوم ہو گا کہ اس کے جسد میں ایک پھوڑا نکل آیا ہے ۔

شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا

اسی طرح ہندی کے اکثر ایسے الفاظ ہیں جو فارسی اور عربی کے ہم معنی الفاظ سے زیادہ دلکش اور موسیقیت پیدا کرنے والے ہیں، مثلاً پریم، سندر، رس کی بوندیں وغیرہ ۔ اُردو زبان کی خوبیوں میں اضافہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ایسے الفاظ کا اضافہ کیا جائے، جو کانوں اور آنکھوں کو بھلے معلوم ہوں ۔ یا بحالت مجبوری کسی قسم کے سائینس یا فلسفہ کا ایسے الفاظ میں ترجمہ کیا جائے جو ہماری روزمرہ کی زندگی میں مستعمل نہیں ہیں مگر الفاظ ایسے ہوں جو ثقیل اور غیر مانوس نہ ہوں ۔ اور ایسے الفاظ نکالنے چاہئیں جو ثقیل اور غیر مانوس ہوں ۔ یہی ایک ایسا معیار ہے جسے شاعروں مصنفوں اور ترجمہ کرنے والوں کو پیش نظر رکھنا چاہیئے ۔

اسی کے ساتھ ساتھ میں بہت ادب سے ہندوستان کے سچے بہی خواہ اور منصف مزاج ہندو صاحبان سے یہ عرض کرونگا کہ وہ اس زبان اور ادب کو محض ہندو مسلم اتحاد کا ایک خاص ذریعہ سمجھیں چونکہ ان کے بزرگوں نے صدہا برس کی محنت سے سے سرسبز و شاداب کیا ہے اور اپنے جواہر افکار سے اسکے خزانہ کو مالا مال کیا ہے اسلیے وہ اسے اُن ہندو صاحبان کے ہاتھوں سے تباہ و برباد ہونے سے بچائیں جو وقتی جذبات سے مغلوب ہو چکے ہیں ۔

ہر منصف مزاج شخص جب ٹھنڈے دل سے تاریخ کے اوراق اُلٹے گا تو دیکھے گا کہ مسلمان حکمرانوں نے اُردو کی حمایت کبھی نہیں کی، حکومت کی زبان فارسی تھی اور جو کچھ امداد ہوتی رہی وہ عربی اور فارسی کی ہوتی رہی ۔ اُردو ماحولی ضرورت اور محض میل جول سے پیدا ہوئی ہے ، اور ہندوستان کی دو بڑی قوموں کی سچی محبت اور صحیح تربیت ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ اس میں غیر معمولی دل فریبی پیدا ہو گئی ہے ۔

جو حضرات سیاسی ردعمل سے مغلوب ہو چکے ہیں وہ یہ نہیں خیال فرماتے کہ اس زبان کو تمام ہندوستانی آبادی کے منھ اور زبان ہیں زبردستی ٹھونسنا جو بقول آنریبل مسٹر جسٹس تیج نرائن ملّا کے لوہے کے چنے ہیں خلاف فطرت ہے بلکہ نامناسب بھی ہے۔ کیا وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہندو صاحبان دیوتاؤں کی زبان میں کسی اپنے ہمسایہ بھائی سے بات چیت کریں تو وہ رستم اور اسفندیار کی زبان میں جواب دے۔ ایسی حالت میں ہندوستانی زندگی اور اس کے کاروبار میں جو ابتری پیدا ہوگی وہ ظاہر ہے یہ ممکن ہے کہ جیسے ہندوستان کا ایک جاہل قلی جب لندن یا پیرس جاتا ہے تو اشاروں سے یا ٹوٹی پھوٹی انگریزی یا فرانسیسی زبان میں ڈبل روٹی اور مکھن تو مانگ لیتا ہے مگر اس سے زیادہ وہ اور کچھ نہیں کر سکتا، ویسی ہی ہندوستان کی حالت ہو جائے گی کہ یہاں کے کاروبار سیاست تہذیب اور شائستگی میں بجائے ہم آہنگی کے مشکلات اور اختلافات کا اضافہ ہوتا جائیگا اور یہ بات ہندوستان کے سچے بہی خواہوں کے لئے ناقابل برداشت ہو جائیگی۔

یہ ممکن ہے کہ میری رائے سے بعض حضرات اتفاق نہ کریں مگر میری اتنی استدعا ضرور ہے کہ اسی اسپرٹ میں ان مسائل پر مضامین لکھے جائیں جن میں کہ میں نے لکھا ہے۔

انسان کی کم مایگی

انسان گرد و پیش کی دنیا میں ایک ناچیز مخلوق ہے۔ یہ زمین جس پر وہ سکونت پذیر ہے ایک بہت بڑا کرہ ہے جس کا محیط تقریباً ۲۵ ہزار میل ہے مگر پھر بھی اس آفتاب سے جو ہمیں روشنی دیتا ہے کہیں چھوٹا ہے۔ آفتاب جسامت کے اعتبار سے زمین سے ۱۳ لاکھ گنا بڑا ہے۔ مگر ہمارا یہ عظیم الشان آفتاب بھی ایک چھوٹے سے نقطے یا کائنات کے اتھاہ سمندر میں ایک قطرہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ کھرب ستارے ایسے ہیں جو بجائے خود آفتاب ہیں۔ اُن میں سے کچھ ہمارے آفتاب سے چھوٹے اور کچھ اس سے کئی گنا بڑے ہیں۔ ان ہی سے ہمارا کہکشانی نظام بنتا ہے جسکی حدبندی کہکشاں کرتی ہے۔ روشنی کو ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل فی سکنڈ کی زبردست رفتار سے آفتاب سے چلکر زمین تک پہونچنے میں ۸ منٹ لگتے ہیں لیکن قریب ترین ستارے بھی اتنے دُور ہیں کہ ان سے روشنی کو زمین تک پہونچنے میں چند منٹ، چند گھنٹے، چند دن، چند ہفتے یا مہینے نہیں بلکہ سوا چار سال اور بعض حالتوں میں تو اس سے بھی زیادہ عرصہ لگتا ہے یہ تو قریب ترین ستاروں کا ذکر ہے۔ کہکشاں کا قطر اتنا بڑا ہے کہ روشنی کو باوجود اس شدید تیز رفتاری کے اُسکے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہونچنے میں دو لاکھ ۸۰ ہزار سال لگ جاتے ہیں اور ہمارے اس عظیم الشان کہکشانی نظام کے اس طرف کروڑوں اور کہکشانی نظام ہیں جو کوہ وکسن کی ۱۰۰ انچ قطر کی دوربین کی مدد سے مشاہدے میں آئے ہیں۔ ان سحابیوں کا فاصلہ ناقابل تصور ہے انمیں سے بعض دور دراز سحابیوں سے روشنی کو باوجود اتنا تیز رفتار ہونیکے زمین تک پہونچنے کیلئے چوبیس کروڑ سال چاہیئے

سر شاہ سلیمان مرحوم

پیر مغاں سے ایک سوال

(از منشی تلوک چند محروم بی، اے)

کل میکدے میں پوچھا پیرِ مغاں سے میں نے
بت خانہ اور مسجد نزدیک ہے یہاں سے

گلبانگ میکشو نکی، رندوں کا شور و غوغا
ہے گونجتا فضا میں ٹکرا کے آسماں سے

مسجد کے سجدہ آرا، بت خانہ کے پجاری
ہوتے نہیں ہیں برہم غوغائے آسماں سے

ہو جاتے ہیں پہ لیکن باہم چھری کٹاری
ناقوس کی صدا سے آوازۂ اذاں سے

"مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا"
یہ خود سنا ہے میں نے اقبالِ خوش بیاں سے

یہ لوگ اِس حقیقت سے آشنا نہیں ہیں
یہ سہو ہو گئی ہے فطرت کے ترجماں سے

روداد سُن کے میری وہ پیر مرد بولا
آئینِ وعظ و حکمت ہے دُور اِس مکاں سے

کہتا ہوں تجھ سے لیکن رندوں کا ایک نکتہ
جو سر بسر ہے عاری آرائشِ بیاں سے

دل میں ہو یا عمل میں ایماں ہے امنِ عالم
یکسر فساد، اگر ہو ظاہر فقط زباں سے

شاعرانہ شکریہ

پچھلے دسمبر میں محروم صاحب کے صاحبزادہ حضرت آزاد کی شادی کے موقع پر ملک کے کئی نامور شاعروں نے سہرے لکھکر ہمارے محترم دوست کی خدمت میں بھیجے تو انھوں نے ان دوستوں کے لطف کے تشکریہ میں ذیل کے اشعار لکھے۔

افق[1] نے سخن کو منور کیا
کہ بزمِ سخن کو منور دیا

کیا جوش نے شاعری کو بلند
کہ بخشا اُسے عرش سا ارجمند

ہے آزاد محروم کی یادگار
جو ہے شاعری کے چمن کی بہار

خدا اُن پہ برسائے رحمت کا مینہ
یہ برسائیں حسنِ طبیعت کا مینہ

[1] والد گرامی حضرت منور لکھنوی

میرؔ کا کلام[لہ]

(۴)

(میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی)

مطبوعہ کلیاتِ میرؔ میں کتابت کی ہزارہا غلطیاں ہیں۔ ہمارے مکرم و نامور دوست میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی نے ان غلطیوں کی جو تصحیح کی ہے وہ کسی نسخے کو سامنے رکھکر نہیں کی گئی ہے بلکہ موصوف نے محض اپنے ذوقِ سلیم کی رہنمائی سے اور میرؔ کے اندازِ سخن کو ملحوظ رکھکر مطبوعہ اشعار کو صحیح پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ (ا۔ز)

ایک کہتا ہوں میں تو منہ پہ رقیب — تیری لیستی سے سو ستاتے ہیں
(پشتی — سُناتے)

نوٹ: پشتی بمعنی حمایت۔ یرچک

آتا ہے دل میں حال بد اپنا بھلا کہوں — پھر آپ ہی آپ سوچ کے کہتا ہوں کیا کہوں
(حالِ بد)

یری سمجھے تجھے وہم و گماں سے — کہاں تک اور ہم اب دل جلاویں
(پری)

نچھرے ہے شیخ مجلس ہی میں قصاں — ادھر آ نکلے تو ہم بھی نچاویں
(پھرے — دل جلاویں)

نظر آئے ابر اب مست آ بہاوا — کہیں میری بھی آنکھیں ڈبڈباویں
(مبادا — نچاویں)

قدم بوسی تلک مختار ہیں غیر — زیادہ لگ چلیں تو سر میں کھاویں
(منہ کی)

مثال سایہ محبت میں حال اپنا ہوں — تمھارے ساتھ گرفتار حال اپنا ہوں
(سدا یا تمال)

یہ بے قراریاں نہ کبھو اُن نے دیکھ یاں — جانکا ہیاں ہماری بہت سہل جانیاں
(دیکھیاں)

اور یہ خرام ناز سے خوباں کے ہمنشیں — ٹھوکر سے یہ اُٹھاتے ہیں آفات کے تئیں
(دربے)

خر کے بے سلوک ہم اب تیری دیکھکر — کرتے ہیں یاد پچھلی ملاقات کے تئیں
(آخر کے — سلوک — تیرے)

چوٹیں رہیں گی جاری گلشن میں ایک مدت — سایہ میں ہر شجر کے ہم روز رو چلے ہیں
(سوتیں — جس شجر کے)

بچتا لئے نہ کیونکر جی اس طرح سے دیکر — یہ گوہر گرامی ہم مفت کھو چلے ہیں
(پچتائیے)

لہ اس سلسلہ کے پہلے مضامین زمانہ بابت جون، جولائی و دسمبر ۲۷ء میں شائع ہو چکے ہیں (ا۔ز)

شکوہ کروں ہو لی بخت کا آئنہ نہ ہو غضب بتاں ۔۔۔ مجھ کو خدا نخواستہ تم سے تو کچھ گلا نہیں

اک فقط ہے سادگی تم پہ بلائے جاں ہے تو ۔۔۔ عشوہ کرشمہ کچھ نہیں آن نہیں ادا نہیں

کوئی تو زمزمہ کرے میر آسا دل خراش ۔۔۔ یوں تو قفس میں اور گرفتار ہیں بہت

مسجد سے میکدے پہ کاش ابر روز برسے ۔۔۔ واں رو سفیدیاں ہیں یاں روسیاہیاں یاں

جسکی نظر پڑے ہیں اون نے مجھے بھی دیکھا ۔۔۔ جب سے وہ شوخ آنکھیں ہیں نے سراہیاں ہیں

جہاں کی مضطلی میں مست طالع ہیں نظر آتے ۔۔۔ نہ تھا اس دور میں آیا جسے ہشیار کہتے ہیں

معاذ اللہ دخل کفر ہو اسلام میں کیوں ہے ۔۔۔ غلط اور پوچ نامعقول بعضے یار کہتے ہیں

سمجھا تنگ نہ اپنی تو سود و زیاں کو میں ۔۔۔ مانا کیا خدا کی طرح ان بتاں کو میں

ان لوگوں کو تو گرد نہ پھر سب ہیں لباسی ۔۔۔ سو گز بھی جو یہ پھاڑیں تو اک گز بھی نہ واریں

نوٹ:- یہ لوگ لباسی ہیں یعنی دیکھنے کے امیر ہیں۔ دل کے ایسے کنجوس ہیں کہ سو گز بھی اتاریں تو ایک گز نہ واریں۔ خیرات نہ کریں۔

ناچار ہو رخصت جو منگا بھیجے تو بولا ۔۔۔ میں کیا کروں جو میر ہی جاتے ہیں سدھاریں

برا کہنا بھی میرا خوش نہ آتا اوس کو تو ورنہ ۔۔۔ تسلی دل ناشاد ہوتا ایک گالی میں

مرے استاد کو فردوس میں اعلیٰ ہے جا کہ ۔۔۔ پڑھایا کچھ نہ غیر از عشق مجھکو خرد سالی میں

یہ غلط کہ میں چاہوں قدح شراب تجھ بن ۔۔۔ نہ گلے سے میرے اترا کبھو قطرہ آب تجھ بن

نہیں چلتے جی تو ممکن ہمیں تجھ بغیر سونا ۔۔۔ مگر آنکھ مرکے کیجئے تہ خاک خواب تجھ بن

تکلیف باغ کنی کی تجھ خوش دہاں کے تئیں ۔۔۔ دیتا ہے آگ رنگ ترا گلستاں کے تئیں

مرے ہو چکے خشک مژگاں کے سب ۔۔۔ لعاب جگر میں مگر کچھ نہیں

فلک نے گر کیا رخصت مجھے سیر بیاباں کو ۔۔۔ نکال سر سے میرے جائے مو خار مغیلاں کو

بہائے سہل پر دیتے ہیں کس محبوب کو کف سے ۔۔۔ قلم اس جرم پر کرتا ہے دست گلفروشاں کو

چاہوں تو بھر کے کولی اٹھا لوں ابھی تمہیں ۔۔۔ کیسے ہی بھاری ہو مرے آگے تو پھول ہو

نوٹ:- کولی میں بھر لینا یعنی گود میں اٹھا لینا

سرمہ جو نور بخشے ہے آنکھوں کی خلق کی
شاید کی راہِ یار کی ہے خال دھول ہو
شاید کہ راہِ یار کی یہ خاک دھول ہو

دل لے کے لونڈی دلی کی کب کا پچا گئی
دل لے کے لونڈے دلی کے کب کا پچا گئے
اب اُن سے کھائی پی ہوئی شے کیا وصول ہو

شوق ہی شوق ہے نہیں معلوم
اوسے کیا دل نہاد ہے ہم کو
اوس سے

بردنہ اتنی بھی کی سخت ناموافق نے
بدد　بخت
کہ مدعی سے اوسے ایک دن لڑائی ہو
کہ اوس سے مدعی سے

مزے کو عشق کی ذلت کے جانتا ہے وہی
کسی کی جتنی کھبولات گلی کھائی ہو
جتیاں نے

گر سایہ لے گرا تو دلِ مضطرب کو میر
سایہ
آرام کر چکا ترے مشتِ غبار کو
آ چکا

ہے فراق ہی میں خیر، نہ کر آرزوئے وصل
مل بیٹھے جو اسے تو شکوہ دراز ہو
مل بیٹھے جو اس سے

دامن کشاں ہے جاگہ طپش پہ طپش ہے دفن
دامن کشاں ہی جاگہ
زنہار کوئی صدمہ سے زیر و زبر نہ ہو

حیران ہیں کہ ایسی یہ مشہد ہے کون سی
مجھ سے خراب حال کہ جس کو خبر نہ ہو

ہم سے تم کو ضد سی پڑی ہے خواہ نخواہ رلاتے ہو
ہوں
آنکھ اٹھا کر جب دیکھے ہیں اور دن کیں خستے جاتے ہو
کو جس کی
آنکھ اٹھا کر جب دیکھو ہو اور بھی ہنستے جاتے ہو

بکھری رہی ہیں منہ پر زلفیں آنکھ نہیں کھل سکتی ہے
بکھر رہی ہیں
کیونکہ چھپے بیخواری اب شب جب ایسی رات کے ماتے ہو
کیونکہ چھپے بے خوابی شب جب ایسی رات کے ماتے ہو

سروقد و بالا ہوتا ہے درہم و برہم شاخِ گل
تا ز سے قدکش ہو کے چمن پر ایک بلا تم لاتے ہو
ناز سے

راحت پہونچی تک تم سے تو رنج اٹھایا رو تک
راحت پہونچی تک　دیر تلک
سر سہلاتے ہو جو کبھو تو بھیجا بھی کھا جاتے ہو

جن نے تم کو نہ دیکھا ہووے اُسے آنکھیں مار دو تم
اوس کے
ایک نگاہ مفیتن کر تم سو فتنے اٹھاتے ہو
مفتن　سو سو فتنے

ہو کے گدائے کوئے محبت روز صدا یہ نکالی ہے
نزدر
اب تو میر جی راتوں کو تم ہر در پہ چلاتے ہو

عشق کو نفع نہ بیتابی کرے ہے نہ شکیب
کرے تدبیر جو درد دوا رکھتا ہو
کرے تدبیر جو یہ درد

اسے تشبیہ تو دیتے ہیں یہ شاعر لیک
اس سے تشبیہ تو دیتے ہیں یہ شاعر لیکن
سبب کچھ اوس ذقن آگے جو مزار رکھتا ہو
سیب

مت پوچھو کچھ اپنی باتیں کہیے تو تم کو ندامت ہو
مت پوچھو
قد قامت یہ کچھ ہے تمھارا لیکن قہر قیامت ہو
یہ کچھ ہے

رابطۂ اخلاص اے دیدۂ دل بھی دنیا میں ہوتا ہے ایک ہی
ربط اخلاص اے دیدہ و دل دنیا میں ایک ہی ہوتا ہے
لگ پڑتی ہے جیسے تیسے تم بھی کوئی ملامت ہو
لگ پڑتے ہو جیسے تیسے تم بھی کوئی بلا لت ہو

چاہ کا دعویٰ سب کرتے ہیں ملتے کیونکر بے آثار
اشک کی سرخی زردی منھ کی عشق کی کچھ علامت ہے

بل بیٹھیے اوس نالے کے سی کوئی گھڑی جو زاہد تو
جتنے بال ہیں سارے سر میں ویسی ہی اسکی عجامت ہو

کس مدت سے دوری میں تیری خاک برہ سے برابر ہوں
کریے رنجہ قدم تک مجھ تک جو کچھ پاس قدامت ہو

منھ اوس کے تیغ ستم کی سیدھا جانا ٹھہرا ہے
جینا پھر کچھ دارو مرنا اس طور میں ہویا مت ہو

شیخ جی آو مصلےٰ کرو جام کرو
جنس تقویٰ کے تئیں صرف مے جام کرو

مقصود درد دل ہے نہ اسلام ہے نہ کفر
پھر ہو گلی میں سبحہ و زنار کیوں نہ ہو

زیادہ حد سے تھی تابوت میر پر کثرت
ہوا نہ وقت مساعد یہ ناز کرنے کو

دل خراشی و جگر چاکی و سینہ کاوی
اپنے ناحق میں ہیں سب اور ہنرمت پوچھو

جوں توں حال دل ایک بار تو میں عرض کیا
میر صاحب جی لیس اب بار دگر منت پوچھو

دل ہی سارے تھی یہ اک وقت میں جو کر گذار
شکل شیشہ کی بنائی ہے کہاں ہے شیشہ

مرجاؤ کوئی پروا نہیں ہے
کہتا ہے مغرور اللہ اللہ

کہتے ہیں تو اوس کے منھ لگے گا
یوں ہی یارب جو ہے یہ افواہ

ہے ماسوا کیا جو میر کہیے
آگاہ ساری اسے ہیں آگاہ

دلی میں ایکی آکر اون یاروں کو نہ دیکھا
کچھ دیکھیے شتابی کچھ ہم بھی دیر آئے

قامت خمیدہ اوسکی جیسی کماں تھی لیکن
قربان گہ وفا میں مانند تیر آئے

نوٹ: اوس کے عاشقان خمیدہ قامت اگرچہ کمان کی طرح جھکے ہوئے تھے مگر قربان گاہ وفا میں جب آئے تو تیر کی طرح سیدھے ہے۔ یہ اشارہ ہے امام حسین کے اک عاشق جاں باز حضرت حبیب ابن مظاہر کی طرف جو بہت ضعیف ہو چکے تھے مگر میدان کربلا میں جب نبرد آزما ہوئے تو جوانوں کی طرح سینہ تانے

صورتگر ازل کا کیا ہاتھ تھا کہے تو
کھینچے وہ تیغ ابرو فولاد کے قلم سے

کڑھیے نہ روئیے تو اوقات کیونکہ گزرے
رہتا ہے مشغلہ سا بار غم و الم سے

بات احتیاط سے کر ضائع نہ کر نفس کو — گئی دل ہے مانند شیشہ دم سے

بالیدگی دل ہے

دل درد ہو میر صاحب اوس بدمعاش کو تم — خاطر تو جمع کر لو ٹک تول سے قسم سے

دل دو ہو

ہدف اُس کا ہوئی مدت ہوئی سینے کو پر اب تک — گھٹا نکلے ہے لخت دل مرا تیروں کے بھالوں سے

ہوئے — گھٹا نکلے ہے — تیروں کی بھالوں سے

نوٹ:۔ سینے کو اوسکا ہدف ہوئے مدت ہو چکی مگر اب تک میرا لخت دل اوس کے تیروں کی بھالوں سے گھٹا ہوا نکلتا ہے۔

ہوا پیرانہ سر عاشق ہوا زاہد مضحکہ سب کا — کہن سالی میں ملتا ہے کوئی بھی خرد سالوں سے

ہو

نوٹ:۔ ہو معنی ہو کر۔ پیرانہ سری میں عاشق ہو کر زاہد مضحکہ بن گیا۔

دی میگسار ظرف جنھیں خم کشتی کی تھی — پھر کر نگاہ تو نے جو کی وہ ہیں جھک گئے

دے میگسار ظرف جنھیں خم کشتی کا تھا — پھر کر نگاہ تو نے جو کی وہ دل ہی جھک گئے

تو ہے کس ناحیے سے اے دیار عشق کیا جانوں — ترے باشندگاں ہم کاش سارے بے وفا ہوتے

ناحیہ — جانیں

سرمایۂ صداقت دیدار کی خواہش ہے — دل کی تو سمجھ لیجیے گر چشم کہا مانے

سرمایۂ صد آفت

ایسی تقریب اوس گلی میں ہے — منتیں ہیں شکستہ پائی کی

اسی — ہے

لے ہی جاتی ہے زر گل کو اُڑا — صبح کے بھی باد ہادی چور ہے

صبح کی بھی باد — بادی چور ہے

دل کھچے جاتے ہیں سارے اُس طرف — کیوں کی کہنے حق ہمارے اُور ہے

کیونکہ کہیے — حق ہماری اُور ہے

کل میر نے کیا کیا کی مے کے لئے بیتابی — آخر کو گرو رکھا سجادۂ صحرائی

سجادۂ محرابی

جاگا ہے کہیں وہ بھی شب مرتکب ہے ہو — یہ بات سجھاتی ہے اون آنکھوں کی بیخوابی

مرتکب مے ہو — سُجھاتی ہے

ماہ وشاں کل جو انکو ٹھونیہ جلیوں میں — ہے خاک سے آج اونکی ہر صحن میں مہتابی

تھے ماہ وشاں کل جو ان کوٹھوں پہ جلسن میں

(باقی)



سماج کا شکار

(پنڈت آنند نراین ملا، ایم۔اے، ایل ایل۔بی)

جا پوچھ سکھی شور یہ کیسا ہے گلی میں ؟

اِک سال سے ہر روز وہ مزدور کا بیٹا
آتا تھا ادھر، شام ہو دن ہو کہ سویرا
دو روز سے لیکن اُسے میں نے نہیں دیکھا
معلوم نہیں اس کو یکایک یہ ہوا کیا ؟

اب تک اُسے آنے سے کبھی روک نہ پائے
تپتی ہوئی گرمی کے برستے ہوئے شعلے
سردی کی ہواؤں کے وہ اُڑتے ہوئے نیزے
برسات کی جھڑیاں ہی نہ بجلی ہی نہ اولے

جا پوچھ سکھی شور یہ کیسا ہے گلی میں؟

دروازے سے کچھ دور جو اُس پار گلی کے
اِک پیڑ ہے پیپل کا اُسی پیڑ کے نیچے
میں نے تو ہمیشہ اُسے پایا ہیں بیٹھے
کچھ چپ سا کچھ آزردہ سا کھویا ہوا جیسے

جی کی نہ کبھی اُس نے کسی کو بھی بتائی
سب چھوٹے بڑے اُسکو سمجھتے رہے خبطی
مانی نہ بُری اُس نے کوئی بات بھی کڑوی
سب ہنستے تھے جب اس پہ تو ہنس دیتا تھا وہ بھی

جا پوچھ سکھی شور یہ کیسا ہے گلی میں؟

دن آیا تھا برسوں جو مری سالگرہ کا
معلوم نہیں کس نے اُسے جا کے بتایا
جاتی تھی شوالے کو میں جب کرنے کو پوجا
اُس نے مجھے لا کر دیا اِک پھولوں کا مالا

میں بڑھ گئی جلدی سے لیا میں نے نہ مالا
کچھ اُس نے کہا اور نہ کچھ میں نے ہی پوچھا
مجھکو یہ گوارا نہ تھا شاید وہ یہ سمجھا
پلٹی تو مجھے آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا

جا پوچھ سکھی شور یہ کیسا ہے گلی میں؟

دربان نے کیا جانئے کیا دُور سے دیکھا
اور جا کے پتاجی سے نہ معلوم کہا کیا؟
غصے میں گئے، منہ پہ جو آیا وہ سنایا
چُپ چاپ وہ سُنتا رہا کچھ منہ سے نہ بولا

کی میں نے شکایت، کہیں وہ یہ تو نہ سمجھا
خود اُس نے کوئی عذر کیا اور نہ شکوہ
پر نام پتاجی کو کیا اور سدھارا
اور جب کا گیا پھر وہ پلٹ ہی کے نہ آیا

جا پوچھ سکھی شور یہ کیسا ہے گلی میں؟

کیا دے گئی دھوکا اُسے سچ مچ یہ رُکھائی
نادان تھا کیسا کہ نہ سمجھا مرے جی کی
یہ شرم بھی جھوٹی ہے یہ تہذیب بھی جھوٹی
اے کاش کہ ہوتی نہ مہاجن کی میں بیٹی

جنگل میں دبائے ہے یہ خونخوار سماج آج
قیدی ہے بشر اور ہے دیوار سماج آج
قربانی کی ہم بھیڑیں ہیں تلوار سماج آج

جینے نہیں دیتی ہے یہ مُردار سماج آج
جا پوچھ سکھی شور یہ کیسا ہے گلی میں؟

اک بار وہ پھر آئے تو کیا کیا نہ کروں گی
سچ کہتی ہوں دنیا کی میں پروا نہ کروں گی
رسوا ہوں تو ہوں شوق کو رُسوا نہ کروں گی
کھاتی ہوں قسم اب کبھی ایسا نہ کروں گی

جاں ہوتی ہے پیاری مجھے اِس کا تو یقیں ہے
دنیا بھی جوانی کی نگاہوں میں حسیں ہے
لیکن وہ جہاں رہتا تھا روتا یہ وہیں ہے
جو دل میں مرے شک ہے کہیں سچ تو نہیں ہے
جا پوچھ سکھی شور یہ کیسا ہے گلی میں؟

غزل

(پنڈت آنند نراین مُلّا، ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی)

ارماں کو چھپانے سے مصیبت میں ہے جاں اور
شعلے کو دباتے ہیں تو اُٹھتا ہے دُھواں اور

اس رنج کی دنیا میں بنانا ہے جہاں اور
ساقی اِدھر ساقی مرے اِک رطلِ گراں اور

خود تو نے بڑھائی ہے یہ تفریقِ جہاں اور
تو ایک، مگر رُوپ یہاں اور وہاں اور

کیسی یہ غلط ربطیِ دنیائے محبت
چاہو جسے جتنا ہی بنے دشمنِ جاں اور

اتنا بھی مرے عہدِ وفا پر نہ کرو شک
ہاں ہاں میں سمجھتا ہوں کہ ہے رسمِ جہاں اور

دل میں کوئی غنچہ کبھی کھلتے نہیں دیکھا
اس باغ میں کیا آکے بنائے گی خزاں اور

کچھ دُور پہ ملتی ہیں حدیں ارض و سما کی
صحرائے طلب میں نہیں منزل کا نشاں اور

اب کوئی صدا میری صدا پر نہیں دیتا
آوازِ طرب اور تھی آوازِ فغاں اور

اک آہ اور اِک اشک پہ ہے قصۂ دل ختم
رکھتی نہیں الفاظ محبت کی زباں اور

مُلّاؔ وہی تم، اور وہی اب تک سرِ الفت
جیسے کبھی دنیا میں نہ تھا کوئی جواں اور

پت جھڑ

(از سید مقبول حسین احمد پوری، بی۔اے، ایل ایل بی)

بولے آندھی بھوت کی بولی
کھیلے دھول بھیانک ہولی

ناچ رہی ہے ناچ نرالے
جیسے بھوانی گھونگھٹ ڈالے

لئے بونڈلے اپنی جھاڑن
جھاڑ رہے ہیں سب بستی بن

مست بنے کھاتے ہیں چکر
آندھی جھکڑ دھڑک دھڑک کر

پت جھڑ میں یہ ہوا کے جھونکے
گھتے ہو کر بن میں بھونکے

رہی نہ پیہو پیہو، کو، ہو،
پیڑ یہ کرتی آندھی ہو ہو

وہ پتی جو شاخ پہ جھولی
ٹوٹ کے بکھری رستہ بھولی

کلی سے جو پنکھڑی تھی پھوٹی
ٹوٹ کے ٹہنی دیس سے چھوٹی

ساری دنیا کھوئی کھوئی
جیسے بھیانک سپنا کوئی

نیند میں لے لے کر خراٹا
آہیں بھرتا ہے سناٹا

سب کے من میں چھائی اداسی
لیکن آتما پیاسی پیاسی

رویاں رویاں نیند سموئے
پریم نہ پت جھڑ میں بھی سوئے

کہتے یہ سنّاٹے بن کے
پریم کی پیاس میں سکھ جیون کے

ملے کہیں، دل کرے اشارا
درشن کو مکھ پیارا پیارا

پت جھڑ کی یہ ہوا جو سنکی
بکھر گئیں آشائیں من کی

بھڑک رہی ہے جیون جوالا
اوم اوم جپتے سب مالا

نہیں کسی کے دھیان میں آتا
تو کس سوچ میں اے جگ داتا

کیا یہ پریم کی سب تیاری
آتی جیسے بسنت بہاری

سب کے جیون الجھے الجھے
یہ الجھاؤ تجھی سے سلجھے

لہ یہ نظم لکھنؤ یونیورسٹی کے پچھلے سالانہ مشاعرے میں پڑھی گئی تھی۔

پریم کے بھید کو تو ہی جانے | اِس کے سپنے بڑے سہانے
کویتی کی بانی سوئی سوئی | آ تماشا سناٹے میں کھوئی
موہن مالے آنکھ پروئے | آنکھ نہ سوئے کھُل کھُل روئے

پلک اوٹ سے کہتے آنسو
ہے اِس روپ میں بھی تو ہی تو

جمالِ منتظر

(از حضرت اعجاز صدیقی)

صرف اِک التفات سے کاوشِ دل مٹی گئی | شکریہ نگاہِ حسن، عشق کی بے کلی گئی
ایک لطیف سی ضیا روح میں پھیلتی گئی | جب حریمِ جمال تک میری نظر کبھی گئی
حجلۂ غم میں رات بھر کھیل کے چاندنی گئی | آگیا سر پہ آفتاب پھر بھی نہ تیرگی گئی
جذبۂ تہ نشین عشق لاکھ رہا دبا دبا | شوخ نگاہ حسن کی پھر بھی اُبھارتی گئی
دستِ ہوس یہ کیا کیا، کیوں اسے تو نے چھو لیا | حسن کی دلکشی گئی، پھول کی تازگی گئی
وقت گذاریوں کا شغل چاہیئے دہر میں کوئی | غم میں بھی بیت جائیگی، جائے اگر خوشی گئی
ایک ہی لے میں سیکڑوں ساز تھے نغمہ آفریں | جب کبھی گوشِ ہوش سے دل کی صدا سُنی گئی
مَیں نے خودی کی سرحدیں پائیں خدا سے دُور تر | تیری نظر اگر اُٹھی تا حدِ بیخودی گئی
اب نہ وہ ذوق و شوق ہے اور نہ اُمید و آرزو | بندہ نوازیوں کے ساتھ عادتِ بندگی گئی
لیجئے کس سے انتقام شوق نے کی نہ روک تھام | یاد تو اُن کی آئی تھی، آ کے مگر چلی گئی

اُن کا جمالِ منتظر، دل میں ہوا تھا جلوہ گر
پھر بھی نگاہِ بے خبر وقت پہ چوک ہی گئی

سر سلیمان اُردو ادب کی دنیا میں

(از جناب نظامی بدایونی ایڈیٹر ذوالقرنین)

مرحوم سے میری پہلی ملاقات مارچ ۱۹۲۴ء میں ہوئی جبکہ وہ صوبہ کی مسلم تعلیمی کانفرنس کی صدارت کے لئے بدایوں تشریف لائے تھے۔ اُس وقت تک میرے مرتبہ دیوان غالب کے پانچ ایڈیشن شرح کے ساتھ چھوٹی تقطیع پر نکل چکے تھے اور ایک نسخہ معرّیٰ فرہنگ کے ساتھ جس میں مرزا غالب کی خود نوشتہ سوانح عمری شامل ہے بڑی تقطیع پر شائع ہو چکا تھا۔ اس ملاقات میں معلوم ہوا کہ مرزا غالب کے دیوان کے وہ سب نسخے جو نظامی پریس بدایوں نے شائع کئے تھے اُن کی نظر سے گذر چکے تھے، اور اس لئے میں معنوی طور پر اُن کے لئے اجنبی نہ تھا۔ اسی وجہ سے اس پہلی ملاقات میں دیر تک مرزا غالب کی شاعری کا تذکرہ رہا۔ سرشاہ نے اسی سلسلہ میں ذوق کی شاعری پر اپنی رائے کا اظہار کیا اور فرمایا کہ نظامی پریس نے غالب کے تو کئی ایڈیشن چھاپے اور ذوق ایسے اُستاد کو کیوں فراموش کر دیا۔ مَیں نے عرض کیا کہ آپ کو ذوق کے کلام سے ذوق ہے تو آپ نظامی پریس کی اس کمی کو پُورا کر دیں۔ مجھے اس ملاقات میں اثبات یا نفی میں اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن پانچ مہینہ کے بعد دوسری دفعہ جب میں مرحوم سے الہ آباد میں ملا تو کیا دیکھتا ہوں کہ قصائد ذوق کا مجموعہ نئی ترتیب کے ساتھ میز پر رکھا ہوا ہے۔ مجھ سے فرمایا کہ لیجئے آپ کی فرمایش پُوری ہو گئی، اور کہا کہ خدا سے دعا کیجئے کہ میں نے اُردو ادب کی جو خدمت شروع کی ہے اُس کا سلسلہ جاری رہے، اور ساتھ ہی دوسرے کمرے میں لے جا کر اُردو نظم و نثر کا کتب خانہ بھی دکھایا۔ فرمایا کہ جس وقت سے میں نے بیرسٹری شروع کی اور مقدمات کی پیروی کے سلسلہ میں الہ آباد سے باہر جانے کا اتفاق ہوا تو ہر جگہ سے میں نے اُردو نظم کی کتابیں خریدنا شروع کیں، رفتہ رفتہ یہ ذخیرہ جمع ہو گیا۔ جو آپ کے سامنے ہے۔ میں نے دیکھا کہ آپ کے اس کتب خانہ میں نظم کی چھوٹی سے چھوٹی کتاب بھی موجود تھی نثر کی کتابیں وہی تھیں جو کسی دوست نے ہدیتاً بھیجی تھیں یا خاص خاص مستند مصنفوں کی آپ نے خرید کی تھیں۔ فرمایا کہ اُردو نظم کو دیکھکر میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اُردو کے مستند شعرا کے کلام کو نئی ترتیب، اچھی طباعت اور صحت

کے ساتھ شائع کرنا اُردو ادب کی ایک ایسی خدمت ہوگی جس سے ہمارے نوجوانانِ قوم کو جو اکثر ادب اُردو سے ناآشنا ہوتے ہیں اُس کے مطالعہ کی ترغیب پیدا ہوگی۔ غرض استاد ذوق کے قصائد کا یہ مجموعہ ستمبر ۱۹۲۴ء میں ایک دیباچہ اور فرہنگ کے ساتھ نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوگیا

اس مجموعہ میں مرحوم نے قصائد کے ساتھ ذوق کے قطعات۔ مثنویات۔ رباعیات اور مسدس کو بھی شامل کر دیا ہے جس کے ساتھ ایک لسبیط دیباچہ شامل ہے۔ اس دیباچہ میں قصائد ذوق پر مختصر تنقید کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں نظم میں بالخصوص قصائد میں اُردو شعرا جس مبالغہ سے کام لیتے ہیں اور جس کو ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، اس کا ذکر کرتے ہوئے اس اعتراض کو یہ کہہ کر غلط بتایا ہے کہ:-

مبالغہ صرف ایک جامۂ زریں ہے جس میں اصل خیال آراستہ کیا جاتا ہے، غرض صرف اعلیٰ مشابہت سے ہے، مبالغہ خوبیِ کلام ہے نہ کہ نقص"

مجموعۂ قصائد کی اشاعت کے ایک سال کے بعد اُنھوں نے یہ خیال کیا کہ قصائد کے ساتھ اُستاد ذوق کی دیگر اصناف سخن کا مجموعہ تو شائع ہوگیا ہے، صرف غزلیات باقی رہ گئیں۔ اگر مکمل غزلیات نہیں تو کم سے کم اُن کا انتخاب شائع کر دیا جائے۔ چنانچہ اس انتخاب کو مرتب کر کے ستمبر ۱۹۲۵ء میں میرے پاس بھیج دیا۔ انتخاب کا کام فی الواقع ایک مشکل کام تھا لیکن سر شاہ نے اس کام کو بحسن و خوبی انجام دیا اور یہ انتخاب تعلیم یافتہ طبقہ میں مقبول ہوا۔

اِس انتخاب کے متعلق اُنھوں نے اس کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ:-

"اس انتخاب کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو اشعار انتخاب سے ترک کئے گئے ہیں وہ اچھے نہیں ہیں بلکہ ہر شخص کا انتخاب اُس کے مذاق کے موافق ہوتا ہے"

سر شاہ کا یہ انتخاب ایک انگریزی داں کے نقطۂ نگاہ سے کیا گیا ہے جیسا کہ اُنھوں نے دیباچہ میں صاف ظاہر کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی داں طبقہ میں اس کی قدر کی گئی۔

اس انتخاب کے مقدمہ میں آپ نے ذوق و غالب کی شاعری کا موازنہ نہایت دلچسپ طریقہ سے کیا ہے، اور دونوں نامور شعرا اُردو کی شاعری کے ہر صنف کا مقابلہ کر کے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے لیکن کہیں انصاف کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ قصائد میں ذوق کو ترجیح دی ہے۔ غالب اور ذوق کے سہروں کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ذوق کا سہرا غالب کے سہرے سے نمبر لے گیا۔ قطعات میں غالب کو ترجیح دیتے ہوئے لکھا ہے کہ غالب کے قطعات قصیدہ نما ہیں اور قصیدہ کے طرز میں ہیں۔

اِس لحاظ سے ذوق کے چھوٹے قطعات سے مقابلتہً بلند تر ہیں۔ دونوں اُستادوں کی رباعیوں کو مساوی درجہ کا بنایا ہے اور اس ضمن میں میر انیس کی رباعیات کا ذکر کرتے ہوئے دونوں اُستادوں کی رباعیات کو انیس کی رباعیات سے کمتر درجہ کا بتایا ہے۔ آخر میں دونوں اُستادوں کی غزلیات کا مقابلہ نہایت دلچسپ ہے۔ اس موازنہ میں دونوں اُستادوں کی ہم طرح غزلوں کے چیدہ اشعار لکھکر یہ لکھدیا ہے کہ ترجیح کا فیصلہ پڑھنے والے کی رائے پر چھوڑا جاتا ہے۔ لیکن پڑھنے والے کو صحیح فیصلہ پر پہنچنے کے لئے آپ نے نہایت خوبی سے دونوں اُستادوں کی خصوصیات کی طرف اشارہ کردیا ہے۔ مثلاً ذوق کو پختگی کلام صحت زبان سلاست بیان اور فصاحت کا مالک بتایا ہے۔ غالب کی مضمون بندی۔ فارسی تراکیب کو اردو میں ڈھالنے کی قدرت نازک خیالی اور بلاغت کا اعتراف کیا ہے۔ دونوں اُستادوں کے تمام اشعار کو جو اس موازنہ میں درج کئے گئے ہیں اگر نقل کیا جائے تو مضمون بہت طویل ہو جائیگا۔ ہم ناظرین کی دلچسپی کے لئے چند مشہور اشعار جن کا موازنہ کیا ہے لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں:۔

۱
(ذوق):۔ جل اُٹھا شمع نمط تار رگِ جاں میرا — آہ روغن نہ ہوا کلبۂ احزاں میرا
دھیان میں آئینہ رخ کے گئی جان نکل — رہ گیا ہائے کھُلا دیدۂ حیراں میرا
غالب:۔ سرمۂ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے — کہ رہے چشم خریدار پہ احساں میرا
رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم — تیرے چہرے سے ہو ظاہر غم پنہاں میرا

۲
ذوق:۔ لگا ہے تیر دل پر آہ کس کافر کے مژگاں کا — نشاں سوفار کا معلوم ہوتا ہے نہ پیکاں کا
غالب: بخموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں — چراغ مُردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

۳
ذوق:۔ بیمارِ عشق کا نہ جو تجھ سے ہوا علاج — کہہ اے طبیب تو ہی کہ پھر تیرا کیا علاج
غالب:۔ لو ہم مریض عشق کے تیماردار ہیں — اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

۴
ذوق:۔ یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں — واں ایک خامشی تیری سب کے جواب میں
خط دیکھکر وہ آئے بہت پیچ و تاب میں — کیا جانے لکھ دیا انھیں کیا اضطراب میں
غالب: قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں — میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں
غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی — پیتا ہوں روز ابر و شب ماہتاب میں

اس سلسلہ کی تیسری کتاب جو آپ نے مرتب کی وہ اُردو کے مسلم الثبوت اُستاد میر کی مثنویات کا انتخاب ہے جو ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا۔ اس کے ساتھ ایک بسیط مقدمہ شامل ہے جس میں میر کی سوانحِ عمری

نہایت تحقیق و تدقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے، اور اُن کے کلام پر ریویو کیا گیا ہے، اور اُن کی نسبت بعض سوانح نگاروں نے جو غلطیاں کی ہیں تاریخوں کے حوالہ سے اُن کی صحت کی ہے۔

مولانا آزاد نے آب حیات میں میر کی نسبت جو قصے درج کئے ہیں، اس کی نسبت دوسرے تذکرہ نویسوں نے یہ الزام لگایا ہے کہ یہ قصے آزاد کی گڑھت ہیں۔ سرشاہ نے ان الزامات کی از سر نو جانچ کی ہے اور یہ فیصلہ کیا ہے کہ آزاد نے جو کچھ لکھا ہے وہ بے اصل نہیں ہے لیکن آزاد نے اپنی رنگین بیانی سے قصوں میں نمک مرچ ضرور لگایا ہے۔ اس طرح انھوں نے ادبی دنیا میں عدالت گستری کے فرض کو ادا کیا ہے۔ میر کی مثنویات کا انتخاب جس نقطۂ نظر سے کیا ہے اُس کا انھوں نے صاف الفاظ میں اظہار کر دیا ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے اُن اشعار کو جن میں فحش خیالات یا غیر فطری حکایات کا اظہار کیا گیا تھا خارج کر دیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس انتخاب کو بھی انھوں نے مغربی خیالات کے تعلیم یافتہ اصحاب کے پڑھنے کے قابل بنا دیا ہے۔ لیکن اس انتخاب میں یہ خیال رکھا گیا ہے کہ مثنوی کا لطف بھی ہاتھ سے نہ جائے اور اصل قصہ کی صورت بھی بدلی ہوئی معلوم نہ ہو۔

فی الواقع یہ ایک مشکل کام تھا اور میر کی مثنویات کا یہ انتخاب اردو ادب پر بڑا احسان ہے، کہ سرشاہ نے میر جیسے شاعر کی مثنویات کو ایک خوش نما جامہ پہنا کر تعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے ایسی صورت سے پیش کر دیا کہ اُس کے مطالعہ سے اُن لوگوں کے دل میں میر کی عظمت نہ گھٹے۔

آخر میں سرشاہ کی ایک آخری کوشش کا جو انھوں نے اردو ادب کی خدمت کے سلسلہ میں فرمائی تھی اگر ذکر نہ کیا جائے تو ناانصافی ہوگی سرشاہ کے والد مولوی شاہ محمد عثمان صاحب مرحوم جونپور کے مشہور وکیل اور عربی فارسی کے عالم و فاضل تھے۔ اور اردو ادب کے ادیب تھے۔ اس علم و فضل کے ساتھ فن شعر سے بھی آپ کو فطری مناسبت تھی فدائی تخلص کرتے تھے بیشتر زیادہ تر آپ کا فارسی کلام ملتا ہے۔ کبھی کبھی اردو میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے لیکن اپنی زندگی میں کبھی اپنے کلام کو مدوّن کرنے کی کوشش نہ کی۔ اُن کا انتقال ۱۳۔ دسمبر ۱۹۱۹ء کو ہوا۔ انتقال کے بعد ہی سرشاہ کو یہ فکر ہوئی کہ اپنے والد ماجد مرحوم کے متروکہ جواہر ریزوں کو جمع کر کے دنیائے ادب میں پیش کر دیں۔ کئی سال کی کوشش میں انھوں نے مرحوم کے قطعات غزلیات جمع کر کے مرتب کر دی تھیں جن کو اُن کے برادر عزیز شاہ محمد سلیمان بی۔ ایس سی، ایل۔ ایل۔ بی وکیل الہ آباد نے مولانا کیفی چریا کوٹی کے مقدمہ کے ساتھ ۱۹۳۴ء میں نظامی پریس بدایوں میں طبع کرا کے شائع کرایا سرشاہ کا نام اگر ماہرین قانون کی صف اول میں شمار ہوتا ہے تو اُسی کے ساتھ سائنس اور

ریاضی کے ماہرین میں بھی وہ کچھ کم مشہور نہ تھے اُنھوں نے عصر حاضر کے مشہور ترین ماہر سائینس اینسٹائن کے نظریۂ اضافیت میں جدید تحقیق پیش کرکے سائینس کی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ تعلیمی مسائل پر بھی آپ کو کچھ کم عبور حاصل نہ تھا۔ ان سب اوصاف کے ساتھ اردو ادب سے آپ کی دلچسپی ایک ایسی خصوصیت تھی جس نے آپ کو اپنے ملک میں ہر دلعزیز بنا دیا تھا، اور تعجب ہوتا تھا کہ ایک قانون داں اور ریاضی اور سائینس کا ماہر اُردو کا ادیب بھی ہو سکتا ہے اور اس کو شعر و شاعری کا مذاق بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن آپ کی ذات نے اس تعجب کو دُور کر دیا اور دنیا کو بتا دیا کہ ذہانت استقلال اور عزم جس شخص میں جمع ہوں وہ جس فن اور جس علم میں چاہے تبحر پیدا کر سکتا ہے۔ سر شاہ ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے ہیں۔ لیکن اُن کی زندہ مثال آئندہ نسلوں کے لئے ہمیشہ رہنما کا کام دے گی۔

علمِ انسانی

دنیا کی حیرت انگیز ترقی کے باوجود انسان کا علم ابھی بالکل ابتدائی حالت میں ہے۔ اس طویل زمانے میں جب کہ انسان نے عالم حیوانی میں ترقی کے بہت سے مدارج طے کئے ہیں۔ اس نے بتدریج معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کر لیا ہے۔ پھر بھی ہماری مثال ان بچوں کی ہے جو علم کے سمندر کے کنارے پر بیٹھے سنگریزے چن رہے ہوں۔ ہماری انتہائی لاعلمی فوراً ظاہر ہو جاتی ہے جب ہم کائنات کی وسعت کا تصور کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اگر آپ اسے ملحوظ رکھیں کہ آفتاب اسی کھرب سال سے موجود ہے اس زمین کی عمر جس پر کہ ہم بستے ہیں دو ارب سال ہے اور زمین پر زندگی کے آثار نمایاں ہوئے تیس کروڑ سال گزر چکے ہیں۔ مگر اس کے مقابلہ میں انسان کا وجود صرف تین لاکھ سال سے اور ذی عقل انسان کا صرف پندرہ بیس ہزار سال سے ہے تو یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ چند ہزار سال کا زمانہ جس میں کہ انسان نے اپنی معلومات فراہم کی ہیں، اس طویل زمانہ کا ایک نہایت خفیف سا جزو ہے جو کہ کائنات کے اسرار کو معلوم کرنے کے لئے درکار ہے۔ ہماری عقل کو عاجزی کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس کائنات کی حدود لا انتہا اور اس کا دائرہ نامحدود ہے۔

سر شاہ سلیمان مرحوم

ہستی

از مسٹر فیاض الدین احمد خاں فیاض بی۔ اے

غم نعمتِ ہستی کا سر انجام نہیں ہے ہستی کا بہر کیف عدم نام نہیں ہے
وہ صبح ہے یہ جسکی کوئی شام نہیں ہے جو جان گیا اس کو وہ ناکام نہیں ہے
یہ دولتِ بیدار مگر عام نہیں ہے

کافر نہیں ہستی کو خدا ماننے والے یہ رازِ نہاں جانتے ہیں جاننے والے
پہچان گئے ہیں اُسے پہچاننے والے آہوش میں غم عیش کو گرداننے والے
ہستی پہ تری ذات سے الزام نہیں ہے

غم کیا ہے؟ مسرت کی بدلتی ہوئی صورت خود موت ہے ہستی کی مچلتی ہوئی صورت
ماتم بھی ہے اِک عیش کی ڈھلتی ہوئی صورت تکلیف ہے راحت کی نکلتی ہوئی صورت
اِک کھیل ہے یہ گردشِ ایام نہیں ہے

ہستی کی ہر اِک لطف کا ہستی ہی بدل ہے یہ آئینۂ جلوۂ رخسارِ ازل ہے
ہستی ہی کے بازو میں تمناؤں کا بل ہے خود حسنِ ازل جلوہ گر دارِ عمل ہے
شایانِ طلب لذتِ آرام نہیں ہے

دُنیا میں اُبھرنا ہے تو پستی سے گذر جا پی جامِ عمل بادہ پرستی سے گذر جا
آہوش میں بے وقت کی مستی سے گذر جا ہستی کو بڑھاتا ہوا ہستی سے گذر جا
تقدیر کو رونے کا یہ ہنگام نہیں ہے

جو عام ہے ہستی کی وہ تفسیر بدل دے روشن جو ہو وہ رُخِ تصویر بدل دے
جو تیر پرانے ہوئے وہ تیر بدل دے تدبیر کے اِک زور میں تقدیر بدل دے
محدود تری سعیِ خوش انجام نہیں ہے

Safety first

سیفٹی فرسٹ

(از مسٹر ضیاء الدین احمد برنی، بی۔اے)

جب سے موٹروں کا چلن ہوا ہے یا جب سے بجلی سے چلنے والی گاڑیاں جاری ہوئی ہیں "سیفٹی فرسٹ" کے الفاظ بہت زیادہ سننے اور پڑھنے میں آتے ہیں۔ ان کا مفہوم یہ ہے کہ اپنی حفاظت سب باتوں پر مقدم ہے، یعنی ہر شخص کو خیال رکھنا چاہیئے کہ جب وہ بازاروں میں چلے یا گاڑیوں میں بیٹھے تو اس طرح سے چلے اور بیٹھے کہ اُسے کوئی جسمانی ضرر نہ پہونچنے پائے۔ مثلاً بہت سے لوگ چلتی گاڑیوں پر سے اُترنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ سب کو معلوم ہے کہ بھاپ اور بجلی کی گاڑیاں بہت تیز رفتار ہوتی ہیں، اس لئے ایسا اقدام خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ اسی طرح لوگ ٹرام گاڑیوں کے معاملہ میں بھی احتیاط نہیں برتتے اور اکثر ایسی جگہ اُترنے کی کوشش میں جہاں ٹرام کا اسٹیشن نہیں ہوتا وہ اپنے تئیں خطرہ میں ڈالنے سے نہیں چوکتے۔ اگرچہ ایسا کرنے میں انھیں بعض اوقات شدید ضربات آجاتی ہیں، اگر لوگ ریل گاڑیوں اور ٹرام کاروں میں چند منٹ کی دیر سویر کا خیال نہ کریں، اور صرف اُسی وقت بیٹھیں یا اُتریں جب گاڑی یا ٹرام رُک جائے تو بہت سے ناگہانی حادثوں کی روک تھام ہو سکتی ہے۔

لیکن ریل یا ٹرام کے حادثات پھر بھی کم ہوتے ہیں، ان کے مقابل میں موٹر گاڑیوں کے حادثات کی تعداد تو اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ اُن کا سالانہ شمار ہزاروں تک پہونچ جاتا ہے۔ آئے دن ہم اخباروں میں پڑھتے رہتے ہیں اور کبھی کبھی اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیتے ہیں کہ بچے اور بوڑھے کس طرح سے موٹر گاڑیوں، موٹر سائیکلوں، موٹر بسوں، ٹیکسیوں اور لاریوں کی جھپیٹ میں آکر اپنی قیمتی جانیں کھو بیٹھتے ہیں۔ یہ حادثات سال بہ سال بڑھ ہی رہے ہیں، اس لئے کہ موٹروں اور لاریوں وغیرہ کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ ذرا شہر بمبئی کی حالت پر غور کیجئے، اسکی آبادی تیرہ چودہ لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ ۱۹۳۵ء میں یہاں ایکسو ایک آدمی سڑکوں کے حادثات کے نذر ہوئے تھے، زخمی ہونے والوں کی تعداد ۳۵۲۲ تک پہونچ گئی تھی۔ ان اعداد میں ۱۹۳۶ء

"Safety First." ؎

میں اچھا خاصہ اضافہ ہوگیا، اور مرنے والوں کی تعداد بڑھکر ایک سو ستائیس[۱۲۷] ہوگئی، گو زخمی اشخاص کی تعداد گھٹ کر صرف ۳۱۹۱ رہ گئی۔ اس زبردست اتلاف جان سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ "سیفٹی فرسٹ" کس قدر ضروری چیز ہے، اور ہم لوگ اس کی طرف سے کس قدر غافل ہیں!

اب یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ حادثات کیوں ہوتے ہیں؟ بمبئی پولیس کی سالانہ رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ موٹر گاڑیوں کی وجہ سے ایک سو ایک[۱۰۱] اشخاص کی موت بمبئی جیسے شہر کے لئے کچھ زیادہ نہیں معلوم ہوتی، جہاں ساٹھ فی صدی لوگ بازاروں میں نہایت بے پروائی کے ساتھ چلنے کے عادی ہیں۔ رپورٹ میں جو علاج تجویز کیا گیا ہے وہ بھی سن لیجئے، اوّل یہ کہ ملک میں موٹر چلانے کا معیار بلند کیا جائے۔ بہتر سڑکیں بنائی جائیں، اور آمد و رفت کے قواعد پر زیادہ سختی سے عمل کیا جائے۔ رپورٹ میں حادثات کی بڑی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ لوگوں کو چلنا نہیں آتا۔ یہ بات بالکل سچ ہے کہ لوگ نہ تو ٹھیک طریقہ سے چلتے ہیں اور نہ صحیح طور پر سڑکوں پر ایک طرف سے دوسری طرف جاتے ہیں۔ حالانکہ لاکھوں چلنے والے اشخاص ایسے ہیں جو چالیس چالیس پچاس پچاس سال سے چل رہے ہیں، پھر بھی انھیں چلنا نہیں آتا۔ میرا روزمرّہ کا مشاہدہ ہے اور ہر شخص اپنے طور پر اس کی تصدیق کرسکتا ہے کہ لوگ فٹ پاتھ یا پٹریوں سے پورا فائدہ نہیں اٹھاتے، اور سڑکوں پر اس طرح سے چلتے ہیں گویا وہ اپنے آگے پیچھے سے بالکل مطمئن ہیں۔ ایک شہر بمبئی میں کیا بلکہ تمام برطانوی سلطنت میں سڑک پر چلنے والوں کے لئے یہ اصول مقرر ہے کہ "بائیں طرف رہو"۔ جگہ جگہ موٹے موٹے حرفوں میں لکھ بھی دیا گیا ہے کہ "بائیں طرف کو چلو" لیکن لوگ اس ہدایت کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے اور ناحق حادثات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں جہاں اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنے والے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد ہزاروں تک پہونچتی ہے، یہ نہایت ضروری ہے کہ انھیں شروع سے سڑک کے مسلّمہ قاعدوں کے مطابق چلنا سکھایا جائے۔ تاکہ حادثات کی تعداد کم ہو جائے۔ یہ کام اسکولوں اور کالجوں میں اور ریلوں اور سینماؤں میں پوسٹروں وغیرہ کے ذریعہ انجام دیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ سڑکوں کے حادثات کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ موٹر چلانے والے بھی بعض اوقات بُری طرح موٹریں چلاتے ہیں اور موٹر چلاتے وقت یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ سڑکیں صرف انھیں کے لئے بنائی گئی ہیں اور پیدل چلنے والوں کا گویا اُن پر

کوئی حق ہی نہیں۔ حالانکہ یہ امر مسلمہ ہے کہ سڑک کے استعمال کا پہلا حق پیدل چلنے والوں ہی کو حاصل ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض موٹر ڈرائیور رات کے وقت شراب پی کر گاڑی چلاتے ہیں اور ایسی حالت میں سمجھ لیجئے کہ گاڑی کا خدا ہی حافظ ہے۔ ایسے موقعوں پر گاڑی کبھی تو درختوں سے ٹکرا جاتی ہیں اور کبھی روشنی کے کھمبوں سے، کبھی فٹ پاتھ یا پٹڑیوں پر چڑھ جاتی ہیں اور کبھی دریا یا سمندر میں گر پڑتی ہیں۔ اس طرح سے کئی تفریحی پارٹیاں ماتمی پارٹیوں میں تبدیل ہوگئی ہیں۔ لیکن پھر بھی ان حادثات سے کوئی سبق نہیں لیا جاتا۔ میں نے کئی دفعہ ایسے ڈرائیوروں کو پولیس کے حوالہ کیا ہے، جن کے متعلق مجھے یہ یقین ہوگیا کہ وہ شراب کے نشہ کی وجہ سے "وہیل" پر قابو نہیں رکھ سکتے تھے۔ افراد کا یہی فرض ہے اور انھیں ایسا ہی کرنا چاہیئے۔ بعض دفعہ یوں بھی حادثات ہو جاتے ہیں کہ ایک گاڑی یا موٹر دوسری گاڑی یا موٹر کو پکڑنے کی فکر میں رفتار کی قیود سے آزاد ہو کر چلتی ہے۔ ایسے تیز رفتار ڈرائیوروں کو کافی سزا ملنی چاہیئے تاکہ وہ انسانی جانوں کو اپنی بے پروائی سے خطرے میں نہ ڈالیں۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ حادثات واقع ہی نہ ہوں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کبھی نہیں ہو سکتا، خصوصاً موجودہ زمانے میں جب وقت اور فاصلہ پر فتح پانے کی اس قدر کوشش ہو رہی ہے۔ لیکن لگاتار کوشش کے بعد اتنا ضرور ہو سکتا ہے کہ حادثات کی رفتار کم ہو جائے۔ لیکن انسداد کلی قریب قریب ناممکن ہے۔ حادثات کم کرنے کی ایک ترکیب یہ ہے کہ ایسی سڑکوں پر جہاں پیدل چلنے والوں کا ہجوم رہتا ہے موٹروں اور گاڑیوں کی رفتار مقرر کر دی جائے تاکہ وہ پبلک کے لئے خطرہ کا باعث نہ ہوں۔ دوسری ترکیب یہ ہے کہ گنجان آبادی میں اُن کی اور آدمیوں کی آمد و رفت کے لئے راستے مقرر کر دیئے جائیں۔ اس سلسلہ میں بمبئی کی پولیس نے جو جدت طرازیاں دکھائی ہیں وہ اس قابل ہیں کہ یہاں پر اُن کا ذکر کیا جائے۔ اس نے بمبئی کے بعض تراہوں، چوراہوں اور بڑی بڑی شاہراہوں پر جو "جزیرے" (Islands) بنا دیے ہیں وہ یقیناً بہت مفید ثابت ہو رہے ہیں۔ یہ جزیرے ایسے مقامات پر بنائے گئے ہیں جہاں پیدل چلنے والوں کے علاوہ ہزارہا موٹروں کا گزر رہتا ہے۔ اس کے علاوہ پولیس جس مناسب سختی کے ساتھ نہ صرف راہگیروں سے بلکہ موٹر والوں سے سڑکوں کے قواعد کی پابندی کراتی ہے وہ بجائے خود قابل تعریف بات ہے۔ اگر کسی سے ذراسی بھی لغزش ہو جاتی ہے تو پھر آنریری مجسٹریٹ کی عدالت میں اُسے جواب دہی کے لئے ضرور آنا پڑتا ہے۔

قاعدہ بھی بنادیا گیا ہے کہ جب درمیانی اسٹیشنوں پر ٹریم سے مسافر اتر رہے ہوں اُس وقت گزرنے والی موٹریں ٹریم سے کم از کم ایک گز کے فاصلہ پر رہیں تاکہ مسافر بہ اطمینان تمام اتر سکیں۔ اس قاعدہ کی نہایت سختی کے ساتھ پابندی کرانے کی ضرورت ہے، اس لئے کہ اکثر اوقات اس کی خلاف ورزی سے حادثات واقع ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح پولیس نے بعض مقامات پر ٹریم کے درمیانی اسٹیشنوں پر چند گز تک پتھر لگوادیے ہیں تاکہ مسافر اطمینان سے اُتر جائیں۔ ابھی تک بمبئی کے سب علاقوں میں اس طریقہ کا رواج نہیں ہوا، لیکن ضرورت ہے کہ نہ صرف بمبئی بلکہ ہر شہر میں اس طریقے کو رواج دیا جائے، کیونکہ اس کی بدولت حادثات کی کافی حد تک روک تھام ہوجائے گی۔

مگر سڑکوں کے حادثات تمام و کمال محض موٹروں یا گھوڑے گاڑیوں ہی کی وجہ سے نہیں ہوتے۔ مثلاً بمبئی میں دو ایک تہواروں پر آتش بازی چھوڑی جاتی ہے، جو ہر سال کئی معصوم بچوں کی جانوں کی بھینٹ لے لیا کرتی ہے۔ کئی سال ہوئے میں نے ایک ہولناک واقعہ دیکھا تھا جس کا اثر آج تک میرے دل میں موجود ہے۔ چند نوعمر لڑکوں نے سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر بیٹھکر سوڈے کی بوتل میں پٹاس بھر کر اس میں آگ کی چنگاری چھوڑ دی، مگر اس سے پہلے کہ بوتل زمین پر پھینکی جاسکے وہ بڑے دھماکے کے ساتھ پھٹی اور چھوڑنے والے لڑکے کے دونوں ہاتھ اور کلائی تک الگ کرگئی۔ لڑکا اور اُس کی غریب ماں اس واقعہ پر جس دردناک طریقہ سے ماتم کر رہے تھے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ بہرحال میرا کہنا یہ ہے کہ آتش بازی بھی ایسی لعنت ہے جو ہر سال کئی جانیں لے لیا کرتی ہے۔ ہمارے لیڈروں اور اسکولوں کے استادوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی نصیحتوں کے ذریعہ اس رسم کو بند کرانے کی کوشش کریں۔

اِس سلسلہ میں یہ بھی ضروری ہے کہ جو لوگ حادثات میں مبتلا ہوجائیں اُن پر فوری توجہ دی جاسکے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ پولیس کے ہر آدمی کو "فرسٹ ایڈ" (First Aid) کی تعلیم دی جائے۔ معمولی ضربات میں ایسی وقتی امداد بہت کارگر ثابت ہوتی ہے۔ ڈیوٹی ادا کرنے والے سپاہیوں کے پاس فرسٹ ایڈ کا سارا سامان بھی موجود ہونا چاہیئے۔ تاکہ انھیں فوری امداد پہونچانے میں سہولت ہو۔ پولیس کو عوام کی خدمت کے جتنے موقعے حاصل ہیں کسی دوسرے طبقے کے لوگوں کو میسر نہیں۔ مگر اس کے لئے سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ پولیس کو

زیادہ سے زیادہ مفید بنا دیا جائے۔ تاکہ پبلک کی ہر ممکن خدمت وہ اپنا فرض سمجھیں اور اس فرض کو بہتر سے بہتر طریقے سے انجام دیں۔ یہ بات اطمینان بخش ہے کہ بڑے بڑے ریلوے اسٹیشنوں پر نہ صرف "فرسٹ ایڈ" کا انتظام ہے بلکہ چھوٹے چھوٹے اسپتال بھی قائم کئے جا رہے ہیں، تاکہ اگر کسی مسافر کو کوئی حادثہ پیش آجائے تو اُس کو فوراً کچھ نہ کچھ طبی امداد مل جائے اور ایسا نہ ہو کہ اسپتال پہونچتے پہونچتے وہ غریب ختم ہو جائے۔ سول اسپتال ذرا فاصلہ پر ہوا کرتے ہیں اور سخت حادثات میں مریض کا فوراً وہاں تک پہونچ سکنا آسان نہیں ہوتا۔

"سیفٹی فرسٹ" کی اور بھی شکلیں ہیں، مثلاً بیمہ کے ذریعہ اپنے بال بچوں کے مستقبل کی طرف سے اطمینان اور فراغت حاصل کرلی جائے وغیرہ۔ لیکن وہ طریقے فی الحال میرے موضوع سے خارج ہیں۔ مجھے اس وقت ریل اور سڑک کے حادثات کے متعلق یہ بات کہنی ہے کہ "سیفٹی فرسٹ" کا خیال لڑکوں اور لڑکیوں، جوانوں اور بوڑھوں، عورتوں اور مردوں غرض ہر طبقہ کے لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دینا چاہیئے۔ اور یہ بات ان کے ذہن نشین کر دینا چاہیئے کہ زندگی ایک خدائی امانت ہے جو اس قابل نہیں کہ اُس کے ساتھ بے پروائی برتی جائے یا اُسے ہیچ سمجھا جائے۔ زندگی کی حفاظت ایک مذہبی فرض ہے، اور ہر شخص کو چاہیئے کہ وہ اس فرض کو اچھی طرح سے ادا کرے۔

کوئل

کوئل، آسمان کے جھلملاتے ہوئے سمندر میں تیرنے والی زندگی۔ نغمہ کی بکھری ہوئی تحریک سے میرے جذبات میں ہلچل پیدا نہ کر۔ میری زندگی کی لہریں ساکت ہیں، کیا تیرے روحانی نغمہ کے چراغ روشنی اور اُمید کی کائنات میں میرے تیرہ و تار اور ہیجان و بےحس ارمانوں کو منور کر سکیں گے؟ تیرے مست کرنے والے نغموں اور ان کے ہزاروں لاکھوں اثروں میں، آسمان میں، ہواؤں میں فطرت کی لاتناہی رنگوں میں جو حُسن کی دنیا بےقرار ہے کیا تو اپنے ننھے سے گلے سے اُس کی صحیح ترجمانی کر سکے گی؟ جس وقت زندگی خاک بن کر اڑنے لگتی ہے۔ اُس کے ہیبت ناک مناظر میں کیا تیرا نغمہ موت اور اُس کے اندر چھپے ہوئے خدا کی مضحکہ خیز اور خوفناک ہستی کی ڈوبتی ہوئی آواز نہیں ہو جاتا؟

امرناتھ جوہری، بی۔ اے

اے دوست!

(از مسٹر یوسف ظفر بی۔ اے)

مجھ کو مایوس نہ کر، میری طرف آ، اے دوست
میری اُمید کے سجدوں کو نہ ٹھکرا، اے دوست!

دوست! میں اُٹھ کے ترے در سے کہاں جاؤنگا
کون ہے تیرے سوا میرا سہارا، اے دوست!

پوچھ جلتی ہوئی قندیل سے میری حالت
مَیں نے کس طرح گزارا ہے زمانہ اے دوست!

ڈوبتا جاتا ہے دل ورطۂ تنہائی میں
میری حسرت کی طرف تو نے بھی دیکھا اے دوست!

میری تاریک قسمت میں اُجالا تو ہے
زندہ رکھتی ہے مجھے تیری تمنا اے دوست!

میں تجھے کھو کے خدائی سے خفا ہو جاؤں؟
تجھکو منظور ہے، اے دوست! تو اچھا اے دوست!

(۲)

تیرے دل میں مری وقعت نہیں، کیا کچھ بھی نہیں؟
تجھکو کیا مجھ سے محبت نہیں، کیا کچھ بھی نہیں؟

کھا نہیں ڈوبتے تاروں کی قسم کھا اے دوست!
مجھ سے ملنے کی بھی حسرت نہیں، کیا کچھ بھی نہیں؟

یہ بتا، ہاتھ دھڑکتے ہوئے دل پہ رکھکر
تجھکو کچھ میری ضرورت نہیں کیا کچھ بھی نہیں؟

(۳)

کچھ نہیں، تو بھی نہ ٹھکرا، کہ بُرا لگتا ہے،
میں ترا ہو کے اگر اشک بہاؤں، اے دوست!

واقفِ حسرتِ پرواز نہیں میرا خیال
آ! تجھے عرشِ تخیل پہ بٹھاؤں، اے دوست!

لے چلوں سرحدِ ادراک سے بھی پار تجھے
اور وہاں گیت محبت کے سناؤں اے دوست!

تو جھکے خلق کے خود ساختہ قانونوں سے؟
تیرے قدموں پہ دو عالم کو جھکاؤں اے دوست!

دوست سمجھا ہوں، بُرا کیا ہے اگر سمجھا ہوں
کیسے سمجھا ہوں تجھے کیسے بتاؤں اے دوست!

مجھکو پامال نہ کر، دیکھ جوانی کو نہ دیکھ
مَیں کہیں جان پہ ہی کھیل نہ جاؤں اے دوست!

میری دُنیا

(از محترمہ فرحت ہاشمی صاحبہ (بدایونی)

بیخودی میں چھیڑ دیجے نغمہ ہائے سازِ دل
پھر انھیں موجوں پہ خود ہی رقص بہم کیجئے

وہ شباب کی پُر مسرت رنگینیاں تھیں یا میری دیوانگی کی جنون انگیزیاں جن کی یاد رہ رہ کے مجھے ستاتی ہے، میرے سازِ غم پر پیہم مضراب لگاتی ہے اور مجھے اس دنیائے ظلم شعار سے دُور اور بہت دُور لے جاتی ہے ...... لوگ مجھے دیوانہ کہتے ہیں، نہ معلوم کیوں؟ اگر دیوانگی یہی ہے کہ میں اپنی دنیا میں گم ہوں اور میرے جنون کی تعبیر فراموشیِ عالم ہے تو بس میرے لئے یہی پسندیدہ ہے۔ مگر آہ! دنیا والے اس کا کیا جواب دے سکتے ہیں۔

اِک نمودِ مضطرب، اِک جوشِ بیتابانہ ہے		عشق دیوانہ سہی، کیا حسن بھی دیوانہ ہے

ہاں وہ بھی ایک زمانہ تھا جب مجھ میں تعقل اور احساس کا مادہ تھا .... دنیا کی رنگینیوں میں ڈوب جاتی تھی اور پھر حباب کی طرح سطح پر آ جاتی تھی۔ اس تمام کائنات کو اپنی آغوش میں لے کر مُسکرا دیتی تھی ...... مگر یہ سب کچھ کب تھا؟ ..... اُس وقت کہ جب اِس بھیانک دنیا کے ہر نغمہ میں ایک کیف اور ہر کیف میں ایک جوش اور ہر جوش میں ایک نشہ سا تھا۔ جب اس دنیا کی ہر لوری میں سرور و طرب جھولا کرتے تھے۔ اسی سرور و طرب کے آغوش میں جوانی سوتی تھی .... جب سینوں میں دل تھے اور دلوں میں شباب کی گوناگوں تصویریں اور اُن تصویروں کے احساس سے ولولہ اور ولولوں میں آرزوئیں تھیں ...... جلوۂ حسن عام تھا۔ میرے شباب کا ایک رنگین عنوان تھا عشق و ہوس متجانس نہ تھے۔ محبت کے دامن پر معصیت کا دھبہ نہ تھا ... مجھے کائنات کا ذرہ ذرہ وجد کرتا ہوا نظر آتا تھا۔

ہماری شادی کو چار پانچ ماہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ میں بے ماں باپ کی تعلیم یافتہ بچی تھی جس کا تمام دنیا میں صرف ایک ہی سہارا بھائی نسیم تھا ..... اور اب وہی نسیم میری ٹوٹی ہوئی کشتی

کے ناخدا ہیں......! اکثر شام کو "وہ" اور میں ہاتھ میں ہاتھ لیکر گھنٹوں ٹہلا کرتے تھے ہماری چال میں انتہائی بے باکی اور وارفتگی ہوتی تھی۔ پھر ہم نہ معلوم کن خیالات میں ڈوب جاتے تھے۔ اِسی عالم میں اگر بادل چاند کے منور چہرہ پر سپید نقاب ڈال دیتا تھا تو وہ میرے چہرہ سے دوپٹہ سرکا کر کہتے تھے "دیکھو دنیا تاریک ہوئی جاتی ہے" مَیں شوخی سے مگر تبسّم کو متانت سے چھپاتے ہوئے کہتی "کیا آپ کی دنیا؟" تو وہ میرا ہاتھ دبا کر ایک خاص لہجہ میں کہتے "عقل والوں کی دنیا" میں طنزاً کہدیتی "عقل والے پاگل ہیں اور ظلوماً جہولا کا مصداق انھیں پر ہے" میں پھر ایک قہقہہ اور طویل قہقہہ لگاتی اور اُسی قہقہہ کی صدائے بازگشت میں ہم غرق ہوجاتے تھے۔"

فطرت نے میری طبیعت میں غور و تفکر کا مادّہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔ میں استغراق کے عالم میں گزار دیتی تھی۔ یہی خصوصیت میری عادت بن گئی تھی۔ ایک مرتبہ میں اپنے گھر تھی "وہ" باہر گئے ہوئے تھے، گلابی جاڑے کا موسم تھا اور نومبر کی ہلکی ہلکی خنک ہوائیں روح کو مسرور کر رہی تھیں شام کا وقت تھا کہ وہ آئے، میں گویا ایک خواب سے چونک پڑی اور مسکرا کر کہا۔

"آئیے آئیے میں آپ ہی کی منتظر تھی"۔

وہ بولے "خیریت" اور میرے برابر صوفے پر اطمینان کا سانس لیتے ہوئے بیٹھ گئے۔

مجھے یوں خاموش دیکھکر اُن سے نہ رہا گیا، اور عجیب اضطرابانہ لہجہ میں بولے "کہو۔ کہو کیسی خاموش اور غیر معمولی ساکت ہو؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں..... یونہی سی ایک بات ہے جس نے اُلجھن میں ڈال دیا ہے۔ اچھا آپ کی کیا رائے ہے، آیا عشق حسُن پیدا کرتا ہے یا حسُن عشق؟"

" واللہ کس خبط میں پڑگئی ہو، آخر یہ تو بتلاؤ کہ تم کو یہ سوجھا کیوں؟" وہ بولے۔

"نہیں آپ کا خیال ہے!..... یہ مسئلہ تو قابلِ حل ہے" میں نے دبی زبان سے کہا۔

وہ ہنس دیے اور کہنے لگے "تمھارا سوال دلچسپ بھی ہے اور مبہم بھی، تم ایسے نتیجہ پر پہونچنا چاہتی ہو جس کو دنیا تسلیم کرلے - یہ غیر ممکن ہے.... مگر تم مجھ سے پوچھتی ہو تو میرا یہ خیال ہے کہ عشق حسُن پیدا کرتا ہے۔"

میں نے فوراً کہا "وہ کیونکر؟"

بولے "یہ امر تو مشاہدہ پر مبنی ہے، تمھیں کسی شے سے خواہ وہ انسان ہو یا جانور.... جاندار

یا بے جان، اگر دلبستگی پیدا ہو جائے تو تم یقیناً اُس کے ہر ہر پہلو میں خوبیاں ہی خوبیاں دیکھو گی
گو حقیقت یہ ہے کہ کوئی چیز مطلقاً نہ بالذات اچھی ہے نہ بُری، صرف فرق یہ ہے کہ جس چیز سے ہماری طبیعت نفرت اور غیر پسندیدگی کا اظہار کرتی ہے وہ ہمارے لئے بُرائیوں کا مرکز ہو جاتی ہے، اور جس شے سے ہم کو دلبستگی ہوتی ہے اُس میں حُسن ہی حُسن نظر آتا ہے۔ اور ممکن ہے کہ جو چیز ہمارے لئے غیر دلکش ہے وہ دوسرے شخص کو مرغوب ہو۔ در اصل" حسن "عشق کی حسین نظر کا منت کش ہے مثل مشہور ہے "لیلیٰ را بہ چشم مجنوں باید دید"

میں بولی کہ" میرا نظریہ آپ کے زاویۂ خیال سے مختلف ہے۔ عشق بنفسہٖ کوئی چیز نہیں، حُسن عشق پیدا کرتا ہے۔ جب تک کوئی شے بالذات حسین نہیں ہوتی ہے' دل میں اس کی طرف سے کوئی دلبستگی اور کشش کی لہر پیدا نہیں ہوتی۔ مثال میں لے لیجئے ایک گلاب کا پھُول کیوں دیکھنے والوں کی نظروں کو اپنے میں سمو لیتا ہے۔"

وہ مُسکرا کر کہنے لگے" تم غلطی پر ہو کوئی پھُول خود حسین نہیں ہوتا ہے، یا بالفاظ دیگر حُسن کا سرچشمہ نہیں ہوتا ہے، یہ نظر بازوں کی سحر آفریں تار نظر ہوتی ہیں جو عشق کے نور سے اُس میں حُسن پیدا کر دیتی ہیں

خود اپنے حُسن کی تاثیر کو وہ کیا جانے تری نگاہ ہے ظالم، مری نگاہ نہیں

یا یوں سمجھو

عشق، رنگِ حُسن سے ہے بے نیاز حُسن، کیف عشق سے خالی نہیں

اصلیتِ "حُسن" صرف اس قدر ہے کہ تم "حسن" کو فریب نظر سے تعبیر کرتے ہیں یا ذوق نظر" کو "حُسن" قرار دیدیتے ہیں۔ حُسن در اصل خالق نہیں مخلوق ہے۔۔ تم نے کبھی خوبصورت یا حسین چیز کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی، ہم اُسی شئے کو حسین کہتے ہیں جو ہمارے احساس جمال کو تسکین بخشے اور ہمارے معیارِ حسن کے مطابق ہو۔"

میں نے کہا" تو آپ کے ذوقِ وجدانی کا نام حُسن قرار دیا جائے؟"

اُنھوں نے کہا" یہ حسن کی مہمل تعریف ہے"۔ دنیا میں حُسن کے معیار بھی مختلف ہیں، اور جس صورت سے نغمہ کا تعین غیر ممکن ہے اسی صورت سے حُسن کا تعین بھی ناممکن ہے۔"

"اس کی تائید؟" میں نے دریافت کیا۔

"تو سنو" وہ بولے

زندگی کیا ہے نمودِ عاشقی عشق کیا ہے حسن کا آغاز ہے

ہاں وادیِ ایمن کے معلوم ہیں سب قصے موسیٰ نے فقط اپنا اِک ذوقِ نظر دیکھا

ہو نور پہ کچھ اور ہی اک نور عالم اُس رخ پہ جو چھا جائے مرا کیف نظر بھی

عشق خود حسن ہے خود جلوہ ہے خود ذات و صفات

اِک یہی لفظ حقیقت ہے کل افسانوں کی

اور اسی طرح شعرا نے اپنے اپنے رنگ اور طرزِ ادا میں حقیقتِ عشق و حسن کو دکھایا ہے۔"

"ذرا حافظؒ کا شعر بھی ملاحظہ کر لیجیے" میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا ؎

در ازل پرتوِ حسنت ز تجلی دم زد عشق پیدا شد و آتش بہمہ عالم زد

تو آپ کا نظریہ غالباً اس شعر کی رو سے بدل جائیگا۔"

"معاف کرنا" وہ بولے "میرا مبحث حسنِ حقیقی یا حسنِ مطلق نہ تھا، میرا موضوع صرف مادی اور مجازی حسن تھا اور بفرضِ محال تمھاری اس تعبیر کو صحیح بھی مان لیا جائے تو

عشق اگر حسن کے جلوؤں کا ہے مرہونِ کرم حسن بھی عشق کے احساس سے سبکدوش نہیں

اور اگر شعراء کے اس POETIC PHILOSOPHY سے قطع نظر کر لیا جائے تو ہم فلسفہ کے باوا آدم سقراط کے اس قول سے کسبِ معنی کر سکتے ہیں:۔

A thing is not loved by those who love it because it is in a state of being loved but it is in a state of being loved because it is loved"

(Trial and death of Socretes)

یعنی کہ ہم کسی چیز سے اس بنا پر محبت نہیں کرتے کہ وہ خود قابلِ محبت ہے بلکہ وہ صرف اِس لئے قابلِ محبت ہے کہ ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔"

"خیر" میں نے کہا ع

"اب یہ بازی رہنے دو ہم ہار گئے تم جیت گئے"

اس کے بعد اور ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور ہم لوگ آرام کرنے کو اُٹھ گئے

اِسی طرح ایک عرصہ گزر گیا۔ ہم یوں ہی شرابِ محبت میں سرشار تھے کہ واقعات نے دوسرا رُخ پلٹا۔ کچھ دنوں سے "اُن" کو معمولی بخار کی شکایت ہو گئی تھی، اور اب نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ بہت زیادہ نحیف و مضمحل ہو گئے تھے۔ اُن کی وہ تمام شوخیاں اور تبسم آمیز باتیں ختم ہو چکی تھیں

ایک صبح میں "اُن" کے پاس بیٹھی تھی۔ یکایک اُن کا چہرہ تمتما اُٹھا اور غیر معمولی لہجہ میں (جس سے میں کبھی آشنا نہ تھی) بولے "اس تجاہل کا مطلب"

میں نے کہا ـــــ "تجاہل..... آخر تم کو اس قدر بدگمانی کیوں ہے، کہو تو کیا حال ہے کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔"

آبدیدہ ہوکر بولے "مجھے تم سے تجاہل نہیں بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تم کو مجھ سے تجاہل ہے...... تم کو یاد ہوگا کہ تم نے ایک دفعہ کہا تھا 'مرد سب کچھ کرسکتا ہے مگر محبت نہیں کرسکتا'..... آہ تم مجھے نہ سمجھ سکیں اور یہی غم آج مجھے موت کے گھاٹ اُتار رہا ہے۔"

"ہرگز نہیں، قطعی نہیں" میں نے کہا "میرا مطلب یہ نہ تھا۔"

ہونٹوں پر تبسم لانے کی کوشش کرتے ہوئے بولے "عورت کا دل بھی محبت سے لبریز ہے اور مرد کا دل بھی اُسی آگ سے مشتعل رہتا ہے، فرق یہ ہے کہ عورت کا دل ایک آبگینہ ہے جو ذراسی ٹھیس سے فوراً چور چور ہو جاتا ہے۔ اور مرد کا دل ایک شمع ہے جو پگھل پگھل کر ختم ہو جاتا ہے۔ یا یوں سمجھو کہ جس طرح دو مختلف رنگ کے سپید اور نیلے شیشوں میں شراب ہو ایک جگہ رنگ نمایاں اور دوسری جگہ نظروں سے مستور..... محبت سب کچھ ہے اور سب کچھ کرسکتی ہے۔"

اتفاقاً اُن کے آنسو میرے زانو پر گرے، ایک تیر تھا جو جگر کے پار ہوگیا، میں بے اختیار رونے لگی۔ مجھے حسرت سے دیکھکر کہنے لگے "تم بھی رو رہی ہو"

"للہ اب آپ ان باتوں کو دماغ سے نکال دیجئے اور سو جایئے" میں نے کہا "میں سمجھ گئی مرد بھی محبت کرسکتا ہے۔"

کچھ وقفہ کے بعد بولے "میری آخری..... اور حقیر سی التجا ہے کہ تم مجھے بھول جانا.... دیکھو میرے تصور کو بھی اپنے خیال میں نہ آنے دینا۔"

اُن کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے، میں حیرت کے عالم میں مبہوت تھی اور اپنی غلط فہمی پر دل ہی دل میں اپنے آپ کو ملامت کر رہی تھی..... مگر آہ وہ وقت گذر چکا تھا.... اور اُن کے سرہانے بھیانک موت کی بے ربط آوازیں میرے دماغ میں گونج رہی تھیں۔

آہ! موت نے اُن کو ہمیشہ کے لئے مجھ سے چھین لیا۔

اب بھی پہلے کی طرح سورج نکلتا ہے۔ شام ہوتی ہے، وہی رات کی تاریکی ہوتی ہے

اور وہی چاند کی کرنیں. مگر میری دنیا ہمیشہ کے لئے تاریک ہو چکی ہے۔ آہ! اب مجھے خود بھی احساس نہیں کہ میں زندہ ہوں یا مُردہ. مگر عقل والے مجھے "دیوانہ" کہتے ہیں..... میرے سامنے جب دنیا کا نام لیا جاتا ہے تو میں گھنٹوں استغراق کے عالم میں ڈوب جاتی ہوں، وہ استغراق نہیں جو پہلے تھا بلکہ ایک جمود اور بے حسی کا عالم..... بے اختیار میری زبان سے نکل جاتا "دنیا ہائے دنیا! میری دنیا تو ختم ہو گئی، تصویر تھی جو مٹ گئی اور اب صرف حسرت ہی حسرت رہ گئی!

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

غزل

حضرت اقبال ورما سحر ہتگامی

کسی رنگ میں دلستانی نہیں ہے — کوئی شے یہاں جاودانی نہیں ہے

ہے ٹھہراؤ بھی، صرف فانی نہیں ہے — حقیقت ہے دنیا کہانی نہیں ہے

خیالات کی حیرت انگیز دنیا — کسی طرح بھی آنی جانی نہیں ہے

یہ ہے ہاں یہ ہے ماجرائے حقیقت — نہیں ہے یہ افسانہ خوانی نہیں ہے

لہو ہے لہو سب یہ تو یہ کا دل میں — سبو میں مے ارغوانی نہیں ہے

عجب ہے یہ حالت مرے آنسوؤں کی — نری آگ ہے اُن میں پانی نہیں ہے

یہ کیا ہو گیا ہائے قلب و جگر کو — کہ آنکھوں کی وہ خونفشانی نہیں ہے

ارے مجھ میں چھپ کے یہ کیا کہہ رہے ہو — میری بات میری زبانی نہیں ہے

بسی دل میں ہے ایک دنیا کہ جس میں — کہیں کوئی رازِ نہانی نہیں ہے

نہ جینا خوشی کا نہ مرنا خوشی کا — خوشی تو ہے جب زندگانی نہیں ہے

روانی میں ہے عمر رُکتی ہوئی سی — مگر یہ تو کوئی روانی نہیں ہے

زمیں پر ہے پورا اثر آسماں کا — محبت نہیں مہربانی نہیں ہے

خدائی میں جنسِ وفا کیوں گراں ہے — خدائی میں جس کی گرانی نہیں ہے

سکت پائے جس سے نہ پیری نہ طفلی — جوانی وہ کوئی جوانی نہیں ہے

خدا خود میں ہے آپ اپنی نشانی — غلط ہے کہ اُس کی نشانی نہیں ہے

بھرے ہیں دلوں میں گماں کیسے کیسے — یہ کیا ہے اگر بدگمانی نہیں ہے

جو اس صنف میں سحر ہے مشق کم کم — غزل میں وہ جادو بیانی نہیں ہے

سہرے

۱۱۔ دسمبر کو ہمارے پُرانے محب اور پنجاب کے نامور شاعر منشی تلوک چند صاحب محروم کے صاحبزادے عزیزی جگناتھ آزاد کی شادی خانہ آبادی ہوئی۔ عزیز موصوف خود بھی اُردو کے اچھے شاعر ہیں، اس لئے اس خوشی کے موقعہ پر انکی سہرا خوانی کی محفل میں شعرائے نامدار نے اپنی سحر بیانی سے اچھا سماں باندھا مکرمی محروم صاحب کو بھی احباب کے اصرار پر چند اشعار لکھنا پڑے لیکن پچھلے خانگی حادثات کی خلش ابھی تک اُن کے دل سے مٹی نہیں ہے اس لئے اس خوشی کے موقعہ پر بھی دل میں وہی مضمون پیوست تھا جو موقعہ و مقام کے لحاظ سے اُس وقت تو چھپا رہا مگر انکے اشعار میں اس کی جھلک نمایاں ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ چنانچہ اب یہ سہرا مکمل صورت میں ہدیۂ ناظرین کیا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی دو اور سہرے بھی جو حضرت منور لکھنوی اور جیمنی سرشار صاحب کے فکر رسا کا نتیجہ ہیں درج ذیل ہیں۔ "زمانہ" کے صفحات پر محروم صاحب کے خاص حقوق ہیں، لیکن شاعرانہ حیثیت سے بھی یہ سہرے قدر دانی کے مستحق ہیں۔ (ا - ز)

سہرا

(شادی خانہ آبادی جگناتھ جی آزاد۔ نتیجۂ فکر والد بزرگوار منشی تلوک چند صاحب محروم)

نظر افروز ہوا نورِ نظر کا سہرا — رشکِ انجم ہے مرے رشکِ قمر کا سہرا
نہیں پروا، جو نہیں لعل و گہر کا سہرا — حق نے بخشا ہے تجھے علم و ہنر کا سہرا
تیرے سہرے کی جھلک نے مجھے دکھلایا ہے — ظلمتِ شام میں انوارِ سحر کا سہرا
بھول سکتا نہیں احسان میں اُن پھولوں کے — بن گئے جو مرے نوشاہ کے سر کا سہرا
محو دل سے ہوئے تیرے ستم، اے دورِ فلک — کہ دکھایا ہے مجھے لختِ جگر کا سہرا
یادِ ودیا[1] کی مگر مجھکو رُلاتی ہے لہو — اشکِ خونیں ہیں مرے لعل و گہر کا سہرا

شوق سے اہلِ سخن دیکھیں گے اسکو محروم
کہ یہ سہرا ہے سخن سنج پسر کا سہرا

---

[1] یہ شعر جو اس وقت موزوں ہوا تھا محفلِ سہرا خوانی میں نہیں پڑھا گیا تھا لیکن اب شامل کر دیا گیا ہے۔ ودیا محروم صاحب کی نوجوان بچی کا نام تھا جو بچپن ہی میں ماں کی نعمت سے محروم ہو گئی تھی، اور باپ نے بڑے چاؤ سے پالا پوسا تھا۔ مگر وہ بھی نو عمری ہی میں داغِ مفارقت دے گئی۔

(۲) (از نتیجۂ فکر منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی)

تاروں کی چھٹکتی ہوئی تنویر ہے سہرا
پھولوں کی مچلتی ہوئی تقدیر ہے سہرا

ہر شکل سے آمادۂ تسخیر ہے سہرا
خود نور جہاں، خود ہی جہانگیر ہے سہرا

محروم کے جذبات کی تصویر ہے سہرا
آزاد کے احساس کی تفسیر ہے سہرا

مطرب کے ترانوں کا تسلسل ہے دلآویز
شاعر کی پھڑکتی ہوئی تحریر ہے سہرا

ہے اس کی صباحت کہ فصاحت ہے سخن کی
گویا لبِ گلرنگ کی تقریر ہے سہرا

پنجاب میں کیسر کی ہے پھولی ہوئی کیاری
اک نقشِ سرِ دامنِ کشمیر ہے سہرا

انوارِ سحر شام کے دامن میں نہاں ہیں
اک موجۂ دریائے طبا شیر ہے سہرا

روکے ہوئے تھامے ہوئے شدیز نظر کو
اک سلسلۂ شوق عناں گیر ہے سہرا

بیدار ہے نوشاہِ جواں سال کی تقدیر
کیا جانیئے کس خواب کی تعبیر ہے سہرا

منظور دعا ہو کے رہی ہر کہ و مہ کی
یعنی ہمہ تن جلوۂ تاثیر ہے سہرا

آج اس پہ جگن ناتھ کا قبضہ ہے مسلّم
محروم کے فرزند کی جاگیر ہے سہرا

حاصل اسی رشتہ سے ہے اعزاز دُلھن کو
دُولھا کے لئے باعثِ توقیر ہے سہرا

ہر شعر میں تاثیر کچھ ایسی ہے منوّر
مقبول برنگِ سخنِ میر ہے سہرا

(۳) (از مہا شے جیمنی سرشار، خیر پور سادات)

پھولا جامہ میں سماتا نہیں یکسر سہرا
ہے جواں بخت جگن ناتھ کے سر پر سہرا

بہر نوشہ بنی ہر تارِ شعاعِ خورشید
کہکشاں، انجمِ تاباں، مہِ انور سہرا

شکرِ خالق ہے کہ آج آپ نے خود دیکھ لیا
اپنے دلبند کا محروم سخنور سہرا

لگ نہ جائے کہیں بدبیں کی نظر دولھا کو
بن گیا اس سے نقابِ رُخِ انور سہرا

کل تلک آزاد تھا آزاد، ہوا آج اسیر
اپنی کوشش میں ہے منصور و مظفر سہرا

ہو رہائی نہ کبھی اس سے میاں بیوی کو
ایسی زنجیرِ محبت بنے گز بھر سہرا

دیدنی ہے یہ تری تابِ رخِ رنگ و شباب
لے بلائیں ترے عارض کی نہ کیونکر سہرا

ہے جگن ناتھ سے نوشاہ کے سر کی زینت
دیکھ پروینِ فلک تجھ سے ہے بہتر سہرا

توڑ لا عرش کے تاروں کو برادر کے لئے
گوندھ سرشار نہ لے کر گل و گوہر سہرا

تنقید کتب

دیر و حرم

یہ چودھری منظور احمد بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ وزیر آبادی سکرٹری میونسپل بورڈ لائلپور (پنجاب) کے دلآویز کلام کا مجموعہ ہے جس میں غزلوں کے علاوہ نظمیں اور گیت بھی ہیں۔ منظور صاحب کو نہ صرف اردو زبان بلکہ ہندی پر بھی بے تکلف عبور حاصل ہے۔ چنانچہ زبان کی سلاست، لفظوں کی روانی، ترکیبوں کی چستی اور روزمرہ کی درستی کے ساتھ اچھے سے اچھے اور بلند پایہ خیالات کو بے ساختگی کے ساتھ نظم کر دیتے ہیں اور یہی بات ایک فطری شاعر کی خصوصیت ہے۔

جہاں تک غزلوں کا تعلق ہے فاضل مصنف نے جدید رنگِ تغزل کی خوب دادِ سخن دی ہے۔ ان کی نظمیں بھی خوش آیند و کیف پرور ہیں، اور بعض نظموں کی سلاست و روانی خاص طور پر قابل تعریف ہے۔ آپ کی منظر نگاری اور شاعرانہ اداکاری کے چند نمونے درج ذیل ہیں:۔

جب شام و سحر کے چکر میں ہر سال بہاریں آتی ہیں ۔۔۔ جب کالی گھٹا کے دامن میں بگلوں کی قطاریں آتی ہیں
جب کوئل کوکو کرتی ہے، جب بوندا باندی ہوتی ہے ۔۔۔ جب آم کا ٹپکا پڑتا ہے، جب گھر گھر شادی ہوتی ہے
جب کہرا خیمہ تنتا ہے، جب سرد ہوائیں آتی ہیں ۔۔۔ تھولی میں موتی لاتی ہیں، چاندی کا فرش بچھاتی ہیں

خیالات گو سطحی ہیں مگر دلآویزی اور بے ساختگی کے ساتھ نظم کئے گئے ہیں جس کی بدولت اشعار میں برسات کی تصویر کھینچ دی گئی ہے۔

غزلیات میں بھی آپ نے اپنے جولانیٔ طبع کا ثبوت دیا ہے، مثلاً

یہ شوخ نظر توبہ، یہ چال معاذ اللہ ۔۔۔ اڑتے ہوئے شعلے ہیں، بہتا ہوا پانی ہے
اک گوشۂ عزلت میں، اک بام تماشا پر ۔۔۔ یہ میری تمنا ہے، وہ تیری جوانی ہے
اک دودِ چراغِ دل، اک بوئے گلِ رعنا ۔۔۔ یہ میرا فسانہ ہے، وہ تیری کہانی ہے

تینوں شعر عمدہ ہیں اور تخئیل بھی پاکیزہ ہے، البتہ لف و نشر مرتب کرتے ہوئے آپ "یہ" اور "وہ" کی ضمیریں اتفاق سے غلط استعمال ہو گئیں۔ مثلاً پہلا مصرعہ ہے "اک گوشۂ عزلت میں، اک بام تماشا پر" اس میں "گوشۂ عزلت" دور کی چیز ہے کیونکہ مصرعہ میں سب سے پہلے ہے اور "بام تماشا" قریب کی چیز ہے، اس لئے دوسرا مصرعہ یوں ہونا چاہیئے تھا۔ "وہ میری تمنا ہے، یہ تیری جوانی ہے" پورا شعر اس طرح ہونا چاہیئے۔

اِک گوشۂ عزلت میں، اِک بامِ تماشا پر وہ میری تمنا ہے، یہ تیری جوانی ہے

اِسی طرح دوسرے اشعار بھی ترمیم طلب ہیں۔

فارسی اور برج بھاشا بڑی شیریں اور رسیلی زبانیں ہیں، اس لئے اگر اِن زبانوں کے لفظوں سے کوئی خوبی پیدا ہو سکے تو انھیں ضرور استعمال کرنا چاہیئے۔ مگر اس بارے میں ٹھونس ٹھانس جائز نہیں ہے منظور صاحب نے بھی بعض نظموں میں ہندی الفاظ استعمال کئے ہیں جو بہت لطف دیتے ہیں۔ البتہ بعض جگہ ایسے غیر مانوس الفاظ آگئے ہیں جو ذرا اُکھڑے سے معلوم ہوتے ہیں۔ دونوں کے نمونے ملاحظہ ہوں:۔

"جب سے گئے پردیس" نامی گیت میں منظور صاحب لکھتے ہیں:۔

پھر بوندوں نے کان میں کہہ دی بھولی بسری بات ناگن بنکر ڈسنے آئی دُکھ کی کالی رات

رِم جھم رِم جھم میگھا برسے، بھیگی ہے برسات پھر چھلکا ہے آنکھ کا ساگر، پھر کانپی ہے گات

یہ بند بہت اچھا ہے اور ہندی کے سب لفظ اپنی اپنی جگہ لطف دے رہے ہیں۔ اگر "دُکھ" کی جگہ "برہ" اور "میگھا" کی جگہ "مینہا" لکھدیا جاتا تو زیادہ فصیح ہو جاتا۔ دوسرا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

بیتی جائے عُمریا فانی لُٹتا جائے روپ جوانی

اُلفت کے پتوار بنائیں اپنی نیّا پار لگائیں

اِن شعروں میں "فانی" اور "الفت" ذرا بے جوڑ سے معلوم ہوتے ہیں۔

بہر حال منظور صاحب کا کلام قابلِ تعریف ہے، اور دوسرے شاعروں کے کلام میں جو لغویات پائے جاتے ہیں اُن سے یہ مجموعہ بڑی حد تک پاک ہے۔ کتاب کے شروع میں علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی کا تعارف اور محترمہ حجبہ تصدق بی۔ اے بی۔ ٹی کا دیباچہ ہے۔ جن میں آپ کے کلام کی خصوصیات اُجاگر کی گئی ہیں لکھائی چھپائی جلد بندی وغیرہ سب بہت عمدہ ہے۔ ضخامت دوسو صفحات قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ: لاہور بک شاپ بنسبت روڈ لاہور

شمعِ ازل[1]

اس زمانہ میں جبکہ شعر و شاعری حُسن نگاری، بادہ خواری سے بڑھکر اشتراکیت، کمیونزم، وطنیت و دین فراموشی کا ترجمان بنگئی ہے حضرت اثر زبیری نے اپنے لئے ایک نیا میدان پیدا کیا ہے یعنی ابتدائے اسلام کے جو مشہور لوگ گزرے ہیں اُن کی مدح و ستائش میں اپنے زورِ طبیعت کو صرف کیا ہے اور محمد صاحب اُنکے جانشینوں اُنکی بیویوں اور اُنکے صحابیوں کی شان میں عمدہ نظمیں لکھی ہیں۔ اثر صاحب کی بعض سیاسی نظمیں بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں جیسے "فرانس کے مظالم" لیکن اگر کسی واقعہ سے ہٹکر بھی کوئی نظم لکھی ہے تو اسمیں بھی عہدِ رسالت کے حوالے دیئے ہیں۔ جہاں جہاں کوئی شعر تلمیح طلب آگیا ہے وہاں فٹ نوٹ دے کر تشریح کر دی گئی ہے۔

---

[1] لکھائی چھپائی عمدہ کاغذ نفیس حجم ۲۲۶ صفحات قیمت ایکروپیہ جو کچھ زیادہ نہیں ملنے کا پتہ: زبیر منزل پاٹا نالہ لکھنؤ۔

رفتارِ زمانہ

ممالکِ غیر

پچھلی مرتبہ جب اِن صفحات میں واقعاتِ جنگ کا ذکر کیا گیا تھا اُس وقت یونان پر جرمن حملے کا اندیشہ کیا جا رہا تھا۔ بلغاریہ پورے طور سے جرمنی کے اثر میں آچکا تھا۔ روس کی خاموشی پریشانی کا باعث ہو رہی تھی۔ ترکی نے بلغاریہ سے غیر جارحانہ معاہدہ کرکے اس بات کو واضح کر دیا تھا کہ وہ یونان کی جنگ میں شامل ہو کر اپنی جان جوکھوں میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ البانیہ میں یونان اٹلی کو برابر شکست پر شکست دے رہا تھا، اور اٹلی کے لئے جرمنی سے امداد لینے کے سوا اور چارہ نہ تھا۔ چنانچہ ہٹلر نے اپنی پوری طاقت سے یوگوسلافیہ اور یونان پر قریب قریب ایک ساتھ حملہ کر دیا، دونوں جگہ اُسے غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ ان دونوں ملکوں کے ساتھ بھی اُس نے وہی رویہ اختیار کیا جو پچھلے سال یورپ کے دوسرے چھوٹے چھوٹے ملکوں کے ساتھ اختیار کیا تھا یعنی اُس نے یوگوسلافیہ کو محوری قوتوں کے ساتھ نئے نظام میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ چنانچہ شاہزادہ پال نائب السلطنت نے یوگوسلافیہ کی طرف سے محوری معاہدہ پر دستخط کر دیئے۔ مگر عوام نے یہ کارروائی پسند نہ کی اور اُس کے خلاف جگہ جگہ مظاہرے شروع ہو گئے۔ فوج بھی بگڑ گئی۔ یہ حالت دیکھکر شاہزادہ پال تو ملک سے فرار ہو گئے اور فوجی افسروں نے تین ہی دن کے اندر نوعمر پرنس پیٹر کو تختِ سلطنت پر بٹھا کر شاہزادہ پال کے تمام وزیروں کو گرفتار کر لیا اور فوج کا بھی اجتماع شروع ہو گیا۔ ہٹلر کو یہ ناگوار ہوا اور اُس نے اپنے معاہدہ کی تصدیق کے علاوہ مطالبہ کیا کہ یوگوسلافیہ اپنے فوجی اجتماع کو منتشر کر دے، اور جب یہ مطالبہ منظور نہ کیا گیا تو جرمنوں نے یوگوسلافیہ اور یونان دونوں پر حملہ کر دیا۔ یوگوسلافیہ پر تو چاروں طرف سے حملہ کرکے بلغراد کو دم کی دم میں تباہ و برباد کر دیا گیا، یونان پر دو طرف سے حملہ ہوا۔ حملہ آور فوجیں ایک طرف تو مغربی تھریس سے سالونیکا کی طرف بڑھیں، دوسری طرف بحیرۂ ایجین کے ساحل سے حملہ کرکے یونان اور ترکی کے تعلقات منقطع کر دیئے گئے۔ برطانیہ نے یونان کی امداد کا وعدہ کیا تھا۔ چنانچہ یونان کی درخواست پر برطانیہ کو شمالی افریقہ کے میدان سے بہت سی فوج بلقان کے محاذ پر بھیجنا پڑی۔ برٹش فوج نے یونانیوں کے ساتھ ملکر مناستر کے قریب مورچے قائم کئے۔ لیکن مغربی تھریس پر اس زور شور سے جرمن حملہ ہوا کہ کوئی مقابلہ کارگر ثابت نہ ہوا اور یونانیوں کو تھریس خالی کر دینا پڑا۔ مناستر کے قریب بھی جرمنی کی مشینی فوج نے اپنے اندھا دھند حملوں سے یوگوسلافی مورچوں میں ایسے رخنے ڈال دیئے کہ یونان کی مشرقی فوج سے ان کا سلسلہ بالکل ٹوٹ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف مناستر پر اور دوسری

طرف سالونیکا پر دشمن کا قبضہ ہوگیا۔ یوگوسلاوی فوجوں نے ہر مقام پر غیر معمولی بہادری سے مقابلہ کیا لیکن وہ جرمنی کے اعلیٰ سامان جنگ اور کثرت فوج کی تاب نہ لاسکیں اور مناستر، پایہ تخت بلغراد، سراجیو وغیرہ بڑے بڑے شہر یکے بعد دیگرے دشمن کے قبضے میں چلے گئے۔ اسی درمیان میں کروٹ قوم کے لوگوں نے شاہ پیٹر کے ساتھ دغا کی، اور جرمنی کی سرپرستی میں اپنی آزادی و خود مختاری کا اعلان کردیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یوگوسلافیہ کی کثیر فوج نے دو محاذوں پر ہتھیار ڈال دیئے جس سے یوگوسلافیہ کی کمر ٹوٹ گئی اور اس کے مقابلہ کا خاتمہ ہوگیا۔ شاہ پیٹر کو اپنے وزیروں کے ساتھ یروشلم میں پناہ لینا پڑی۔ یونانی اور برطانوی فوجوں نے اسکے بعد اپنا محاذ از سر نو درست کرنا چاہا لیکن نئے مورچوں پر بھی جو کوہ اولمپس سے لیکر البانیہ کی سرحد تک پھیلے ہوئے تھے جرمنوں نے ایسے سخت اور شدید حملے کئے کہ یہ بھی قائم نہ رہ سکے۔ مگر ان اندھا دھند حملوں میں جرمنوں کا نقصان عظیم ہوا۔ امریکن اخبارات کا بیان ہے کہ یونان کی جنگ میں ساٹھ ہزار جرمن جان سے مارے گئے اور ڈھائی لاکھ جرمنوں کے قریب زخمی ہوئے، اتحادیوں کا نقصان بہت کم ہوا۔ لیکن جرمنی کی کثیر موٹر سوار فوجوں اور بیشمار ہوائی جہازوں نے مدافعت و مقابلہ کا کوئی انتظام قائم نہ رہنے دیا۔ یہ مقابلہ اتنا نابرابر ثابت ہوا کہ یونانی اور برطانوی فوج کو برابر پیچھے ہٹنا پڑا اور شاہ یونان کو اپنی گورنمنٹ کے ساتھ اپنے پایۂ تخت سے ہٹ کر کریٹ چلا جانا پڑا۔ برطانوی فوجیں اپنے اپنے مقامات پر واپس پہونچا دی گئیں کہتے ہیں کہ اس وقت تک برطانیہ کے ساٹھ ہزار سپاہی یونان پہونچ چکے تھے جن میں کم سے کم ۴۵ ہزار سپاہی صحیح سلامت یونان سے واپس پہونچا دیئے گئے۔ تھرماپلی کی مشہور گھاٹی میں جو جنگ ہوئی اس میں انگریزوں کے تین ہزار سے زیادہ سپاہی قتل اور زخمی نہیں ہوئے مگر یہ لوگ ایسی بہادری سے لڑے کہ جرمنی کی پانچ گنی فوج کو بھی ایک ایک مقام پر دو دو دن تک رکے رہنا پڑا اور ہر جگہ کثیر نقصانات اٹھانا پڑے۔ برطانیہ کا جنگی سامان ضرور بہت کچھ پیچھے پڑا رہ گیا۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ اس میں زیادہ تر وہ چیزیں تھیں جن کی جرمنوں کے پاس کمی نہیں ہے۔
اس وقت اصلی یونانی گورنمنٹ تو کریٹ میں ہے لیکن جرمنوں نے پایہ تخت ایتھنس میں ایک کٹھ پتلی گورنمنٹ جنرل اسلوکیجو کے ماتحت قائم کردی ہے۔ یہ شخص ایپرس کی فوج کا کمانڈر تھا اور اسی کے حکم سے ایپرس کی یونانی فوج نے جرمنوں کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

ان دو ملکوں کے زیر ہوجانے کے بعد ترکی کے رویہ سے بھی کمزوری کا اظہار ہورہا ہے چنانچہ اس نے چپ چاپ جرمنی سے ایک تجارتی معاہدہ کرلیا ہے جس کی رو سے ترکی جرمنی کی بنائی ہوئی مشینوں کے عوض اسے تمباکو مہیا کریگا۔ اس معاہدہ کے مطابق ایک کرور دس لاکھ ترکی پاؤنڈ کا لین دین ہوگا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ترکی اور جرمنی کے درمیان ایک اور تجارتی معاہدہ کی بات چیت ہورہی ہے جس کی رو سے چالیس لاکھ ترکی پاؤنڈ کی زراعتی پیداوار جرمنی بھیجی جائیگی ترکش پارلیمنٹ نے بھی ۲۹۔ اپریل کو اس معاہدہ پر اپنی منظوری دیدی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس معاہدہ کی تہ میں

روس کا دباؤ ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بلقان میں جرمن فتوحات نے ٹرکش مدبروں کو اپنے رویہ پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کیا۔ بہر حال جو کچھ ہو مگر یہ بات صاف طور پر ظاہر ہو رہی ہے کہ ترکی میں برطانوی اثر کم کرنے کی زور شور سے کوشش ہو رہی ہے اور عجب نہیں کہ ترکی اس اعتماد کو قائم نہ رکھ سکے جتنا کہ ابتک برطانیہ کو اسکے ساتھ تھا۔ ہٹلر مارشل پٹیان اور جنرل فرانکو پر بھی دباؤ ڈال رہا ہے۔ فرانس سے جنگی جہازوں کا مطالبہ ہے اور اسپین سے جبر الٹر کے حملے میں امداد دینے کی فرمائش ہے۔ مصر پر بھی حملے کی دھمکیاں ہیں اور نہر سویز پر قبضہ کرنے کی فکر ہے۔ اور عراق وغیرہ پر بھی اقتدار جمانے کی کوشش ہے۔ ترکی یونان و یوگوسلافیہ کا ساتھ دیتا اور روس بلغاریہ کی مدد کرتا تو ہٹلر کے لئے بلقان پر اس قدر جلد قابو پا لینا ذرا مشکل کام ہوتا۔ لیکن حالات نے اس وقت آزادی کے لئے جان دینے والوں کا ساتھ نہیں دیا بلکہ ظلم و تشدد کرنے والی طاقتوں ہی سے موافقت کی۔ مگر یونان میں جرمنوں کو اپنے مقابل فوجوں کی بہادری اور پامردی کا حال بھی معلوم ہو گیا۔

ہٹلر نے شمالی افریقہ میں بھی انگریزوں کے خلاف اٹلی کو مدد دینا شروع کر دیا ہے۔ اس نے اٹلی کے جزیرہ سسلی پر تسلط حاصل کر لیا ہے، اور وہاں اپنے ہوائی اور سمندری اڈے قائم کر لئے ہیں اور ان کے ذریعہ اس نے ایک طرف تو بہت سا جنگی سامان اور فوجیں لیبیا کی بندرگاہ طرابلس میں پہونچا دیں، دوسری طرف اس نے جزیرہ مالٹا پر روزانہ ہوائی حملے کرنا شروع کر دئے ہیں تاکہ کم سے کم مالٹا کی طرف سے جرمن فوج کی آمد و رفت میں کوئی مزاحمت نہ ہو سکے ممکن ہے ٹیونس علاقہ فرانس کے ساحل سے مدد لی گئی ہو۔ خیر کچھ ہو یہ واقعہ ہے کہ جرمنی نے نہایت خاموشی سے ہزارہا آہن پوش توپ گاڑیاں اور دوسرا سامان جنگ طرابلس پہونچا دیا۔ اور جب برطانیہ کو اپنی فوج کا ایک معقول حصہ لیبیا سے ہٹا کر بلقان بھیجنا پڑا اس وقت جرمنوں نے برق رفتاری کے ساتھ حملہ کر کے پہلے کئی چھوٹی چھوٹی چوکیاں اور پھر بنغازی۔ درنہ۔ غزالہ اور آس پاس کے مقامات لے لئے۔ طبروق میں ابھی تک برطانوی فوج موجود ہے جو دشمن کا سختی سے مقابلہ کر رہی ہے مگر دشمن نے اس کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے، اور مصر سے بھی وہ طبروق کا راستہ بند کر دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ چنانچہ تھوڑا سا چکر کھا کر بردیہ اور لیبیا کے قلعہ قپازو پر قبضہ کر لیا ہے، اور الادم اور مصر کی بندرگاہ سولم پر بھی دشمن کا قبضہ ہو چکا ہے۔ اس طرح جس تیز رفتاری سے برطانوی فوج نے بنغازی تک لیبیا کا علاقہ فتح کر لیا تھا، اس سے بھی زیادہ جلد اس علاقے پر اب جرمن قابض ہو گئے ہیں۔ مگر جب تک بحیرۂ روم پر برطانیہ کا قبضہ ہے لیبیا کی حالت زیادہ تشویش ناک نہیں سمجھی جا سکتی ہے۔ طرابلس سے لیکر سولم تک ہزار ڈیڑھ ہزار میل کا فاصلہ ہے اور اگر رسد اور سامان جنگ کے لئے سمندری راستے میسر نہ ہوں خشکی کی راہ سے مدد پہونچانا بہت دشوار ہے۔ یہ تو شمالی افریقہ کا حال ہوا۔ مشرقی افریقہ میں اطالوی سمالی لینڈ فتح ہو چکا ہے۔ برٹش سمالی لینڈ واپس لے لیا گیا ہے۔ اریٹیریا پر بھی برطانوی قبضہ ہو گیا ہے اور ملک حبش پر تیزی کے ساتھ قبضہ ہوتا جا رہا ہے،

اس طرح کم سے کم مشرقی افریقہ میں تو اٹلی کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔



مگر اس جنگ میں افریقہ کی فتوحات کی خاص برطانیہ کی لڑائی اور اٹلانٹک کی بحری جنگ کے سامنے کوئی حقیقت نہیں۔ اسی لئے اٹلانٹک میں برطانوی جہازوں کے ڈبونے کی مہم اس زور شور سے جاری ہے۔ کیونکہ ہٹلر خوب جانتا ہے کہ جب تک برطانیہ اس کا مقابلہ کرنے کو موجود ہے اس کی ساری فتوحات بیکار رہیں گی، اور برطانیہ اسی وقت مجبور و معذور ہو سکتا ہے جب اس کی ناکہ بندی کر کے اس کو خود اس کے گھر میں تباہ و برباد کر دیا جائے۔ اسی لئے موسم بہار کے شروع ہوتے ہی لندن، اس کے مضافات اور تمام مشہور اور اہم مقامات میں بڑی شدت سے ہوائی حملے کئے جا رہے ہیں۔ ان حملوں سے جان و مال دونوں کا نقصان ہو رہا ہے۔ مگر برطانیہ کے دلاور باشندے جس بہادری پامردی اور اولوالعزمی سے ان حملوں کا مقابلہ کر رہے ہیں وہ دنیا کی تاریخ میں آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ ہوائی حملوں کی شدت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آخر مارچ ۱۹۴۱ء تک برطانیہ کے انتیس ۲۹ ہزار آدمی جان سے مارے گئے اور چالیس ہزار زخمی ہوئے۔ یہ ہوائی حملے کیسے بے محابا اور بیدردانہ کئے گئے ہیں اس کے متعلق یہ بتا دینا کافی ہوگا کہ برطانوی اسپتالوں کے دو سو پینتیس ۲۳۵ مریض بھی ہوائی حملوں سے ہلاک ہو گئے۔ تاریخی عمارتیں، گرجا گھر، کتب خانے اور ہوٹل، تھیٹر سبھی کو ان سے نقصان عظیم پہونچا ہے۔ برطانیہ بھی ان حملوں کا ترکی بہ ترکی جواب دے رہا ہے۔ اور اس کی ہوائی طاقت پچھلے سال کے مقابلے میں بہت زیادہ بڑھ گئی ہے، اور جرمنی کے اہم فوجی مقامات اور صنعتی کارخانوں کو کثیر نقصانات پہونچائے گئے ہیں اس وقت تک جرمنی میں بھی ہزارہا ٹن گولے برسائے جا چکے ہیں۔

حال میں انسٹر کے جنوبی ساحل پر بھی جرمنی نے شدید گولہ باری کر کے نقصان عظیم پہونچایا، لیکن ابھی تک اسکو خود برطانیہ پر حملہ کرنے کی ہمت نہیں پڑی، اور یہ حملہ ہٹلر کے لئے بھی ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ اسی لئے وہ برطانیہ کی ناکہ بندی کرنے کی انتہائی کوشش کر رہا ہے جس کے لئے وہ چاروں طرف ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ کیونکہ جب تک بحیرۂ اطلانٹک سے جنگی سامان آتا رہیگا ہٹلر کی خیر نہیں ہے۔ پریسیڈنٹ روزویلٹ اور اُن کے وزیر بار بار کہہ چکے ہیں کہ امریکہ اس بات کو کبھی گوارا نہ کریگا کہ اس کا قیمتی مال جو وہ برطانیہ کی امداد کے لئے شبانہ روز محنت کر کے تیار کر رہا ہے برطانیہ پہونچنے کے بجائے سمندروں کی تہ تک پہونچا دیا جائے۔ امریکن سینیٹ کی کمیٹی نے بھی پریسیڈنٹ روزویلٹ کو پورے اختیارات دے رکھے ہیں اور پریسیڈنٹ موصوف نے تہیہ کر لیا ہے کہ جنگی سامان لیجانے والے جہازوں کے ساتھ مسلح جہازوں کا ایک دستہ بھی امریکن ساحل سے دو ہزار میل تک ان کی حفاظت کے خیال سے بھیجا جایا کریگا۔ جنگی سامان کی تیاری میں بھی امریکہ اپنی پوری طاقت صرف کر رہا ہے۔ غرض محوری طاقتوں کے ظلم و تشدد کو ختم کرنے کیلئے امریکہ اور برطانیہ کے عزم مصمم میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ اس عرصہ میں امریکہ کے

باشندے بھی پہلے سے کہیں زیادہ جوش کے ساتھ اپنے پریسیڈنٹ کے ساتھ ہیں اور مسٹر چرچل کہتے ہیں کہ جب کبھی ہوائی حملوں کے شکار لوگوں سے بات چیت کرتے ہیں یا مسمار و برباد شدہ مقامات کا معائنہ کرتے ہیں تو عوام کی ہمت اور مستقل مزاجی دیکھکر ان کی روح تازہ اور بشاش ہو جاتی ہے۔ مسٹر چرچل نے اپریل کے آخری ہفتہ میں اپنی براڈکاسٹ اسپیچ میں بلقان کے واقعات اور ہٹلر کی فتوحات بیان کرنے میں جس صاف گوئی اور راستبازی سے کام لیا ہے اس سے بھی یہ بات بخوبی ثابت ہوتی ہے کہ برطانیہ کے لوگ اس جنگ میں ہمت ہارنے والے نہیں ہیں اور خواہ کچھ ہو مگر ہٹلرازم کو ختم کئے بغیر دم نہ لیں گے۔ اس وقت بلقان میں جرمن اقتدار قائم ہو جانے کے بعد بھی برطانیہ کی صورت حال جون ۱۹۴۰ء کے مقابلے میں کہیں زیادہ اچھی ہے۔ اور اگر چند ماہ بھی جنگ کھنچ گئی تو پھر پالسہ پلٹ ہی کر رہے گا۔

ہندوستان

جنگ کی وجہ سے یورپ میں انقلابی تبدیلیاں ہو رہی ہیں لیکن ہندوستان میں حکومت کے رویہ میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ البتہ ہماری خانہ جنگی میں ترقی ضرور نظر آ رہی ہے "پاکستان" کی پرزور حمایت نے کچھ دنوں سے ہندو مہاسبھا میں ایک نئی جان ڈال دی ہے۔ اس لئے مدراس اور صوبہ متحدہ میں مسٹر جناح کے مجوزہ تقسیم ہندوستان کی تائید میں دھوم دھامی کانفرنسیں ہوئیں۔ لاہور میں بنگال۔ پنجاب۔ سندھ اور صوبہ سرحد کے قلیل التعداد ہندوؤں کی ایک اہم کانفرنس بھی ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی کی صدارت میں ہوئی۔ پنجاب کے نوجوان ہندوؤں کی انجمن نے ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی کے اعزاز میں ایک اہم خیر مقدمی جلسہ کیا۔ کانفرنس میں راجہ نریندرناتھ صاحب کول صدر استقبالیہ کمیٹی نے اپنی تقریر میں اس مسئلہ کی مفصل تاریخ بیان کی اور ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی نے اپنی صدارتی تقریر میں گورنمنٹ کی پالیسی پر پرزور نکتہ چینی کی۔ آپ نے ہندو مہاسبھا کی طرف سے کہا کہ ہم ہندوستان کے سب باشندوں کو بلا تفریق مذہب و ملت یکساں حقوق دینے کو تیار ہیں، شرط صرف یہ ہے کہ وہ بلا استثنا ہندوستان کے رنج و راحت کے شریک بنے رہیں اور اسی سرزمین کو اپنا مادری ملک سمجھیں۔ اصل ریزولیوشن میں بھی جو اس کانفرنس میں پاس ہوا، وطن پرستی پر خاص زور دیا گیا اور آئندہ آئین ہند سے فرقہ وارانہ جذبات کو بالکل مٹا دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ اس کے محرک نے کمیونل ایوارڈ کی سخت مذمت کرتے ہوئے کہا کہ محب وطن ہندو سب کے لئے انصاف و مساوات کا طلبگار ہے اور کسی کے لئے کوئی خاص رعایت نہیں چاہتا ایک ایسے صوبے میں جہاں ہندوؤں کی تعداد قلیل ہے یہ ایک اہم اعلان ہے۔

مسلم لیگ نے اپنے اجلاس مدراس میں اپنے اغراض و مقاصد میں یہ اصولی تبدیلی منظور کر لی ہے کہ اس نے ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کرنا ہی اپنا مقصد قرار دیا ہے۔ صوبہ متحدہ میں مسٹر جناح نے

حال میں جو تقریریں کیں ان میں بھی اُنھوں نے اسی بات کو بار بار دُہرایا کہ جب تک پاکستان کا اُصول تسلیم نہ ہو جائے گا وہ مستقل طور پر کوئی آئین مرتب و منظور نہ ہونے دیں گے۔ عجیب بات ہے کہ ابھی تک اس تقسیم کے اُصول اور تفصیلات واضح نہیں کی گئی ہیں اور نہ کسی کو یہ معلوم ہے کہ سیاسی۔ اقتصادی اور جغرافیائی حیثیت سے یہ تقسیم کس طرح عمل میں آئیگی۔ مختلف اسکیمیں ضرور شائع ہو چکی ہیں۔ مگر کسی میں ان اہم مسئلوں کو قابلِ اطمینان طریقے سے حل کرنے کی کوشش نہیں ہوئی ہے۔ اسی سبب سے بابو راجیندر پرشاد کو یہ کہنا پڑا کہ جب تک کوئی مستند و مفصل اسکیم سامنے نہ آئے۔ کانگریس کے لیڈران اس کی بابت کوئی رائے نہیں دے سکتے۔ البتہ کانگریس اس خیال کو ملک کی ترقی اور سلامتی کے لئے مہلک سمجھتی ہے۔ مسٹر جناح نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ کانگریس کو پہلے اُصولی حیثیت سے اس مطالبے کو منظور کر لینا چاہیئے اس کے بعد تفصیلات طے ہوتی رہیں گی ظاہر ہے کہ کانگریس جو ملکی اتفاق و یگانگت کے لئے پچاس سال سے زیادہ عرصے سے سرتوڑ کوشش کر رہی ہے اپنا کیا دھرا دم زدن میں کیسے ملیامیٹ کر سکتی ہے۔ خصوصاً جبکہ وہ اسد دنیا دیکھ رہی ہے کہ آج اسی باہمی نفاق کی بدولت یورپ کے چھوٹے چھوٹے ملکوں کی کیا حالت ہو رہی ہے خود انگریزوں کے آنے سے پہلے چھوٹی چھوٹی دیسی ریاستوں کی کیا حالت تھی۔

بہرحال مدراس اور صوبہ متحدہ میں پاکستان کی موافقت میں ریزولیوشن پاس ہوئے اور مظاہرے کئے گئے۔ مسٹر جناح اس اسکیم کی خاطر ان صوبوں کے مسلمانوں سے بقیہ ملک کے مسلمانوں کی خاطر ایثار و قربانی طلب کر رہے ہیں لیکن ہم کو یہی یقین ہے کہ جلد یا دیر میں اسبارے میں عوام کا مغالطہ دور ہو جائیگا اور حقیقت حال واضح ہو جائیگی لیکن اس وقت اطرافِ ملک میں اس تحریک سے جو ہیجان پیدا ہو گیا ہے اس سے اکثر مقامات پر باہمی تعلقات بہت تلخ ہو گئے ہیں۔ چنانچہ ڈھاکہ۔ احمد آباد بمبئی۔ کانپور وغیرہ میں اسی ماہ ہولناک فسادات ہوئے جن میں کشت و خون۔ لوٹ مار سے دریغ نہیں کیا گیا۔ اورنگ دنامو میں پر بھی حملے ہوئے۔ یہ واقعات فریقین کے لئے شرمناک ہیں۔ اور ہر شخص کو ان پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے گورنمنٹ کو پاکستان اور اینٹی پاکستان دونوں قسم کے مظاہروں کو یک لخت بند کر دینا چاہیئے۔ اگر یہ مظاہرے امن و امان میں خلل ڈالنے والے ثابت ہوتے ہیں۔ خصوصاً اس وقت جبکہ جنگ کے شعلے ہندوستان کے پھاٹک تک پہنچ چکے ہیں۔ گورنمنٹ کو ہندوستان کے آئینی مسئلہ کو بھی طے کر ڈالنا چاہیئے۔ مارچ میں ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو صاحب کی صدارت میں بمبئی میں اعتدال پسند ملکی لیڈران کی ایک اہم کانفرنس ہوئی جس نے مرکزی گورنمنٹ کے متعلق چند اہم تجویزیں پیش کی تھیں۔ ہر چند کہ یہ تجویزیں کسی طرح انتہائی نہیں کہی جا سکتی ہیں تاہم مسٹر ایمری وزیر ہند نے ۲۲۔ اپریل کو ان تجویزوں کو بھی پایہ لیمنٹ میں نامنظور کر دیا

اور ایک مرتبہ پھر اس پرانے قصّے کو دُہرایا کہ جب تک کانگریس و مسلم لیگ کا باہمی سمجھوتہ نہ ہو جائے کوئی نیا قدم نہیں اُٹھایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے ایک طرح سے بمبئی کانفرنس کی تجویزوں کو ناقابلِ عمل بتاتے ہوئے یہ بھی کہا کہ شاید تیج بہادر انتہا پسندوں کے جال میں پھنس گئے ہیں۔ کانفرنس کمیٹی اور سر سپرو دونوں نے وزیر ہند کی تقریر کا مفصل اور مکمل جواب دیا ہے ملک میں بھی عام طور پر اظہارِ ناراضگی کیا گیا ہے۔ مہاتما گاندھی کے بیان سے ان کا انتہائی غصّہ ظاہر ہوتا ہے۔ اُن کے علاوہ دوسرے لیڈروں نے بھی اس پر علانیہ مایوسی کا اظہار کیا ہے۔ اور سر سٹیلوا و مسٹر سری نواس آئر، مسٹر چندر وارکر پریسیڈنٹ لبرل فیڈریشن، پنڈت ہردے ناتھ کنزرو جیسے اعتدال پسندوں نے اس تقریر سے یہی مراد لی ہے کہ برٹش گورنمنٹ ہندوستانیوں کو حکومت کا کوئی اصلی دخل دینے کو تیار نہیں ہے حالانکہ جیسا کہ سر راد ھا کرشنن نے لکھا ہے "اب بھی ملک میں برطانیہ عظمیٰ کے واسطے کافی ہمدردی موجود ہے اور عام لوگوں کی خواہش ہے کہ وہ اس جنگ میں دل کھول کر برطانیہ کا ساتھ دیں لیکن وزیرِ ہند نے بمبئی کانفرنس کی تجویزوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نازک وقت میں بھی برطانیہ ہندوستان کو خود مختار بنانے کو آمادہ نہیں ہے۔ آپ کی رائے ہے کہ ممکن ہے شروع میں اہلِ ملک ایک خالص غیر سرکاری وزارت کا بھی زیادہ ساتھ نہ دے سکیں لیکن خود مہاتما گاندھی اس کو برطانوی حکمرانوں کے قلب کی تبدیلی کا ثبوت سمجھیں گے۔

بہر حال اس وقت اُولو العزمی بلند نظری اور انصاف پروری کی ضرورت ہے۔ پارلیمنٹ میں جو مباحثہ ہوا ہے اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انگلستان کے بڑے بڑے مدبران بھی وزیر ہند کے رویہ سے خوش نہیں ہیں۔ بعض صاحبوں نے کئی دور رس تجویزیں بھی پیش کیں۔ انگلستان کے بعض مقتدر اخبارات بھی حکومت برطانیہ پر زور ڈال رہے ہیں کہ وہ ہندوستان کے متعلق اپنی پالیسی پر فراخ دلی سے نظر ثانی کرے۔ لندن ٹائمس، مینچسٹر گارجین، نیو اسٹیٹسمین وغیرہ نے اس کا پر زور مطالبہ کیا ہے۔ ہماری بھی یہی دلی تمنا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ اربابِ حکومت اگست ہی کے اعلان پر اڑے رہتے ہیں یا ضرورتِ وقت اور مقتضائے زمانہ کا کچھ لحاظ کرتے ہیں

اس غیر اطمینانی زمانہ میں بھی ملک میں جنگی امداد کے لئے کروڑوں روپیہ جمع ہو چکا ہے۔ اگر آئینی مسئلہ طے ہو جائے اور ہندوستانیوں کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ جنگ ختم ہوتے ہی ان کو بھی اپنے ملک میں وہی حیثیت حاصل ہوگی جو دوسرے ملکوں کی ہے پھر دیکھئے عام جوش و خروش کی کیا حالت ہوتی ہے۔

علمی خبریں اور نوٹ

تصنیف و تالیف و تعداد اشاعت کے لحاظ سے اس وقت اُردو کی سب سے زیادہ ترقی پنجاب میں ہو رہی ہے کسی زمانہ میں صوبہ متحدہ اور دہلی اردو کا قلعہ سمجھا جاتا تھا، مگر ایک عرصہ سے اضلاع آگرہ و اودھ اور دہلی میں ہندی زبان کا رواج غیر معمولی طور پر بڑھ رہا ہے۔ اور سالہا سال سے یہاں اُردو کی بہت ہی کم نئی کتابیں شائع ہو رہی ہیں صوبہ متحدہ کے اُردو اخبارات کی حالت بھی اچھی نہیں ہے، بہت کم اخبارات ایسے ہونگے جن کی اشاعت دو ہزار کاپی سے زائد ہو۔ لیکن پنجاب میں اچھے اچھے اُردو اخبارات نکل رہے ہیں اور اُن کی اشاعت بھی بہت معقول ہے چنانچہ پچھلے سال جون سنہ ۱۹۴۰ء میں ہمعصر "ملاپ" کی اشاعت اٹھارہ ہزار ساڑھے چھ سو کاپی تھی۔ اس کے بعد ہمعصر پرتاپ کا نمبر تھا جس کا اوسط اشاعت پندرہ ہزار کاپی تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ دہلی کا ہمعصر "تیج" روزانہ بھی دس ہزار روزانہ نکلتا ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تینوں پرچے روزانہ اخباروں کے بہترین نمونے ہیں۔ صوبہ متحدہ کے لئے تازہ ترین خبروں کے لحاظ سے ہمعصر "تیج" انگریزی کے کسی روزانہ اخبار سے کم نہیں ہے۔ صوبہ متحدہ میں اپریل لغایت جون سنہ ۱۹۴۰ء کی سہ ماہی میں اُردو کی کل اکسٹھ (۶۱) کتابیں شائع ہوئیں جس میں شاعری کی ۱۹ زبان کے متعلق ۱۱ تاریخ و جغرافیہ کی ۵ سوانحی دو تھیں۔ اسی عرصہ میں ہندی کی ۳۸۴ کتابیں چھپیں اس کے برعکس انھیں تین مہینوں میں پنجاب میں اُردو کی ۲۳۶ کتابیں چھپیں اور ہندی کی صرف ۶۹۔ یہی حال دوسری سہ ماہیوں کا سمجھنا چاہیئے۔ مثلاً سنہ ۱۹۴۰ء کی آخری سہ ماہی میں صوبہ متحدہ میں اردو کی صرف ۴۸ نئی کتابیں چھپیں۔ اور ان میں بھی شوکت صاحب تھانوی کی مزاحیہ کتاب "منشی جی" اور دو ایک درسی کتابوں کے علاوہ کوئی کتاب ایک ہزار سے زائد نہیں شائع ہوئی۔ اسی مدت میں ہندی کی ۳۱۳ کتابیں شائع ہوئیں اور زیادہ تر کتابیں دو ہزار کی تعداد میں طبع ہوئی ہیں۔ بعض کتابوں کے چھ چھ ایڈیشن شائع ہوئے ہیں

ہم اس کے معنی یہ لیتے ہیں کہ ہمارے صوبے میں اُردو کی ترقی رکی ہوئی ہے۔ اور ہمارا خیال ہے کہ حالات بد سے بدتر ہو رہے ہیں، حالانکہ مشاعروں کی تعداد اور رونق میں بظاہر کوئی کمی نہیں معلوم ہوتی اور اُردو کی حمایت و ہمدردی میں اکثر دھوم دھامی جلسے بھی ہوتے رہتے ہیں جن میں وقتی جوش کے ماتحت دھواں دھار تقریریں کیجاتی ہیں، مگر عوام اور نہ خواص ٹھنڈے دل سے اُردو کی ترویج و اشاعت کے لئے کوئی مستقل مالی بار اپنے ذمہ لینے کو تیار ہیں۔ یہاں تک کہ صوبے کے اکثر متمول و مقتدر اصحاب اُردو کتابوں رسالوں اور اخباروں کی خریداری ایک بار گراں سمجھتے ہیں بلکہ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ زیادہ تر اصحاب اس مد کو فضول یا ناقابل برداشت خیال کرتے ہیں۔

THE ZAMANA MAY 1941 Regd. No. A147.

زمانہ

مرتبہ دیا نراین نگم

جلد ۷۶ | مئی سنہ ۱۹۴۱ء | نمبر ۵

فہرست

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

نمونہ سات آنہ ۷ر

(جملہ حقوق محفوظ)

زمانہ

جلد ۷۶ — مئی سنہ ۱۹۴۱ء — نمبر ۵

ہندی مصوّری کا نیا دور

(از مسٹر جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی بی۔اے۔ایل ایل۔بی)

مغلوں کے زمانہ میں جس نئے طرز کی مصوری کی داغ بیل پڑی اُسے بقول ڈاکٹر کمارسوامی "ہندی پارسی" فنِ تصویر کہا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی تصویریں جہانگیر کے ابتدائی عہد حکومت تک عام رہیں اور انھیں مغل اسکول کا طرۂ امتیاز سمجھنا چاہیئے۔ اس مصوری کے تمام نمونے عموماً چار طرح کے بتائے جاتے ہیں:-

(۱) ایران کی مشہور عشقیہ داستانوں (لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد وغیرہ) کی رنگین تصویریں اور

(۲) ان کی نقلیں،

(۳) اسی طرز کی تمام دوسری تصویریں جو ہندوؤں کی قدیم تصانیف کے فارسی ترجموں مثلاً راماین، یوگ وششٹ، کلیلہ دمنا اور سوز و گداز وغیرہ کے باتصویر ایڈیشنوں کی زینت ہیں۔

(۴) ہندی پارسی طرز کی شبیہیں،

مغل اسکول در اصل سترھویں صدی کی چیز ہے، اور کوئی شک نہیں کہ اس عہد کی خالص ایرانی مصوری ہندی فن تصویر سے بہت کچھ متاثر ہوئی ہے۔ سترھویں صدی کے شروع میں مغل اسکول کے تار و پود بکھرنے شروع ہو گئے تھے، اور اس زمانہ کے ہندو مصور اپنی

ملکی خصوصیات کی نمایندگی کرنے لگے تھے۔ چنانچہ ان کے بنائے ہوئے تمام تخیلی و رومانی منظر خالص ہندی نژاد ہیں، گو ان کے لباس اور متعلقہ عمارتوں وغیرہ سے کسی قدر اجنبیت ترشح ہوتی ہے۔ لیکن بعض خاص خاص شبیہیں ایسی بھی ہیں جو خد و خال اور وضع قطع کے اعتبار سے بالکل غیر ملکی ہیں۔

اٹھارھویں صدی کے آغاز سے پہلے ہی مغل اسکول کا خاتمہ ہوگیا اور راجپوت مصوری کا آفتاب کمال طلوع ہوا۔ ہندی اور ایرانی فن میں جو اہم فرق ہے اس کا خود ابو الفضل نے ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے کہ "ہندی مصوری کا پایہ ہمارے وہم و گمان سے بھی بلند تر ہے۔ جذبات کی بلندی اور مضامین کا تنوّع ہندی فنِ تصویر کی اہم صفات فارسی غزلیات کی ہیجان انگیزی اور شکار کے خشک مناظر کی دسترس سے باہر ہیں۔ یہی نہیں بلکہ مغلوں کی کردار نگاری بھی وہاں تک پہونچنے سے قاصر رہی"۔

راجپوت اسکول دراصل اجنتا ہی کے سلسلۂ رنگین کی ایک کڑی ہے۔ حالانکہ اس کا ہر نقش معیار قدیم کے زوال و ادبار کا زبانِ حال سے فریادی ہے۔ ڈاکٹر کمار سوامی کی طرح بعض دیگر مشرقی مفکرین کی بھی یہی رائے ہے کہ ہندی مصوری اجنتا کے غاروں سے نکل کر بھی معدوم نہ ہوسکی۔ بلکہ یہ سلسلہ مدتوں تک برابر جاری و ساری رہا۔ حالانکہ اس کے آخری زمانہ کے نقش و نگار اب ناپید ہیں، پھر بھی باغ (مالوہ) سیتنا نواس (مدراس) اور شری گری (لنکا) کے غاروں میں اب تک بعض ایسے نقوش موجود ہیں جو بلاشبہ اجنتا کی فن کاری کے مقلد ہیں۔

ہندی مصوری جس زمانہ میں اجنتا کے غاروں میں روپوش ہوکر معراج کمال کو پہونچ چکی تھی یورپ اس وقت تک اِس فنِ لطیف کے نام سے بھی ناواقف تھا۔ اس لئے ہمیں ہندی فنِ تصویر کے عالمگیر اثرات کا پتہ لگانے میں چنداں دقت درپیش نہیں آتی۔ پہلی اور دوسری صدی عیسوی کی ترکستان۔ تبت۔ چین۔ جاپان وغیرہ کے تمام فنِ لطیف پر اجنتا کا رنگ غالب ہے۔ اسی اجنتا کی بنیادوں پر ہماری مصوری کے نئے اسکول کی شاندار عمارت کی تعمیر شروع ہوئی۔

پہلے پہل ۱۸۲۴ء میں مسٹر جیمس نے اجنتا کا پتہ لگاکر اس کا اجمالی تذکرہ قلمبند کیا۔ اس کے بعد ۱۸۴۳ء میں مسٹر فرگوسن نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور ایک مفصل تبصرہ لکھکر ایسٹ

انڈیا کمپنی کے حوالہ کر دیا۔ ۱۸۴۴ء میں کمپنی نے میجر آر۔ جل کو اجنتا کی تصاویر کی نقلیں لینے کے لئے روانہ کیا اور میجر موصوف ۱۸۵۵ء تک اس کام میں مشغول رہے۔ ۱۸۶۶ء کی آتشزدگی کے بعد بمبئی آرٹ اسکول کے پرنسپل گرفتھ نے اس طرف توجہ کی اور ۱۸۷۲ء سے ۱۸۸۵ء تک اسکول مذکور کے طالب علموں کی مدد سے وہ مختلف تصویروں کی نقلیں حاصل کرتے رہے۔ ۱۹۱۵ء میں لیڈی ہیرنگھم نے ہندی مصوروں کو اس کام پر مقرر کیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد نظام گورنمنٹ نے یہ کام سید احمد کے سپرد کیا۔ ۱۹۲۶ء میں بالا صاحب نے ہندوستان بھر کے چیدہ چیدہ مصوروں کو اسی مقصد سے اجنتا روانہ کیا۔ اس طرح اجنتا کے سہارے ہندی مصوری کے نئے دور کی شروعات ہوئی۔

یوں تو انیسویں صدی کے اوائل ہی میں انگریز مصوروں کی نگرانی میں ہندوستان میں مصوری کے کئی اسکول کھل چکے تھے۔ لیکن خالص ہندی مصوری کی روح کو سب سے پہلے پوری کامیابی کے ساتھ نئے قالب میں ڈھالنے کا فخر بنگال کے سپوت اونیندر ناتھ ٹیگور ہی کا حصہ ہے۔ اونیندر بابو جس زمانہ میں ہندوستان کی مصوری کا نام روشن کرنے میں مصروف تھے انھیں دنوں ہاویل صاحب کلکتہ آرٹ اسکول کے پرنسپل ہو کر ہندوستان آئے اور ٹیگور کی قلمکاری کا معجزہ دیکھ کر ہندی فنِ تصویر کی فضیلت و برتری کے قائل ہو گئے۔ اونیندر نے اجنتا کے رنگ میں نئے نئے گل کھلائے اور نندلال بوس، اسِت ہالدار، شاردا چرن اکیل، سریندر ناتھ گنگولی، این۔ این گپت، شیلیندر ناتھ ڈے، گگیندر ناتھ ٹھاکر، کشتیندر ناتھ مجومدار، راول اور حکیم محمد خاں وغیرہ جیسے ماہرینِ فن کی رہنمائی کر کے اپنے مشن کی تکمیل کی۔

ٹیگور کے شاگردوں میں نندلال بوس سب سے زیادہ کامیاب اور مشہور ہوئے۔ حالانکہ اکیل اور ہالدار بھی انھیں کی ٹکر کے ہیں، لیکن تخیّل کی بلندی اور جدّت (اوریجنیلٹی) کے اعتبار سے ان کا پایہ اپنے معاصرین سے بہت بلند ہے۔ اونیندر بابو کی طرح حکیم کو چھوڑ کر ان کے دیگر نامور شاگرد بھی بنیادی طور پر بودھ اسکول کے پیرو ہیں۔ بوس اور ہالدار نے تو اجنتا کی نقلیں اتارنے میں غیر معمولی شہرت و کامیابی حاصل کی ہے۔ بوس نے متعدد دیواروں اور چھتوں کو اجنتا کا مدِ مقابل بنانے کے علاوہ سات سو سے زائد خیالی تصویریں بنائیں، جن میں ایک سے ایک بڑھ کر ہیں۔ بوس شانتی نکیتن میں اور ہالدار لکھنؤ آرٹ کالج میں نو آموز طلبار کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے جوہر ذاتی کی نمائش کر رہے ہیں۔

ڈے۔ ٹھاکر۔ بوس۔ ہالدار۔ اکیل۔ گپت۔ گنگولی اور مجومدار کی فنی خصوصیات کے ملے
میں ارتقائی مدارج کے تفاوت کو نظر انداز کر کے بلا مبالغہ وہ تمام باتیں دہرائی جا سکتی ہیں جو اجنتا
کی مصوری کا طرۂ امتیاز ہیں۔ ان حضرات کی تصویریں اتنی بلند پایہ اور کثیر ہیں کہ ان کے نام گنانا
یا ان کا انتخاب کرنا مشکل ہے۔ بوس نے ڈاکٹر ٹیگور کے ساتھ چین اور جاپان میں اپنے کمالات
کی نمایش کی اور دنیا پر اپنے زور قلم کی دھاک بٹھائی۔

اکیل بنگال میں پیدا ہوئے اور دہلی میں مرے، یہیں انھوں نے اپنا آرٹ اسکول قائم کیا
جو اب ان کے چھوٹے بھائی بارودا اکیل کی زیر نگرانی ترقی کر رہا ہے۔ اکیل نے تقریباً ایک ہزار
تصاویر اپنی یادگار چھوڑی ہیں جو ان کی بلندی تخئیل اور کمالِ فن کا ثبوت ہیں۔ انھوں نے اپنے
اُستاد ٹیگور کی کورانہ تقلید نہیں کی بلکہ اپنے لئے ایک نیا راستہ نکالا اور رنگ آمیزی و وضع خطوط
کے وہ وہ کمالات دکھائے کہ لوگ دنگ رہ گئے۔ یوں تو ہر صناع کا انداز جداگانہ ہوتا ہے لیکن
اکیل نے شروع ہی سے بڑی کامیابی کے ساتھ ایک اصطلاحی انقلاب کا علم بلند کیا۔ انھوں نے
اپنے حریری نقوش (جن کا پس منظر ایک بالکل نئی چیز ہے) اور پنسلی خاکوں میں اس نئے طرز کے
جوہر دکھائے ہیں اور چین و جاپان کی صنعت سے بالکل مختلف ایک نئی چیز پیدا کر کے رکھدی ہے
نہایت ہلکے رنگ استعمال کر کے اکیل نے حریری مجسموں میں چار چاند لگا دیے ہیں۔

اکیل کی رنگ آمیزی کے حیرت انگیز کمال کا یہ عالم ہے کہ جزئی تفصیلات کا فقدان ہوتے
ہوئے بھی ان کی تصویریں حسن کاری کا جامع و مکمل اور بہترین نمونہ ہیں۔ ان کے اس رنگ کی کامیابی
کا بین ثبوت یہ ہے کہ پرمود بابو جیسا آرٹسٹ بھی انھیں کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کر رہا ہے
اکیل نے ابتداءً دیہاتی زندگی کے خیالی نقوش پیش کر کے اپنے زورِ قلم کی دھاک بٹھائی اور پھر بدھ
کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پینتیس ۳۵ تصویروں میں نمایاں کیا۔ اور جس موضوع پر قلم اُٹھایا اُسے
پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا۔ ان کے "عالمگیر" "شو کا ملال" "ماں"، مردہ بچہ" اور "بدھ کے حضور میں" ایسے
زبردست کارنامے ہیں جنھیں دیکھکر بڑے بڑے مبصروں کو کہنا پڑا کہ ان میں خطوط و رنگ کی
حسن آفرینی کے علاوہ بہشتی چمک بھی موجود ہے۔ شاعری کا حسین رنگ اور موسیقی کی رنگین ترنگ
اکیل کی تصویروں کی روح رواں ہے۔ پیرس اور لندن میں تین بار اکیل نے اپنے کمال کا
مظاہرہ کر کے نہ صرف خراج تحسین وصول کیا بلکہ اپنے عزیز وطن کا بھی نام روشن کیا۔ سری گوپال
جی کے مندر میں اکیل کی اکتیس ۳۱ بڑی تصویریں ان کے کمال فن کا جلوہ دکھا رہی ہیں۔ بندا بن

کی گایوں کا گلہ" کے عنوان سے اکیل ایک سلسلۂ تصویر کی تکمیل میں محو تھے کہ ایک قسم کے زہریلے رنگ کے اثر سے ایک مہینہ کی مسلسل جدوجہد کے بعد ان کی دُور رس آنکھیں ہمیشہ کیلئے بند ہوگئیں۔ یہی سلسلہ اکیل کا آخری سرمایہ ہے۔ بوس بابو کی طرح ان کے شاہکار عرض وطول ہند میں جھلملاتے ستاروں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں "کالی" "ترشت سورگ میں" لافانی محبوب "راس لیلا" وشوروپ تانڈونرت وغیرہ وغیرہ اکیل کی بہترین تصویریں شمار کی جاتی ہیں۔ ہندوستانی راجاؤں، امیروں اور نوابوں کے علاوہ ان کی کئی تصویریں لارڈ زیٹ لینڈ (Lord Zetland) اور ریمزے میکڈانلڈ (Ramsay Macdaland) نے بھی خرید کی تھیں اپنے آخری ایام میں اکیل سری کرشن کی بندرابن کی زندگی اور دوارکا لیلا کا نقشہ اُتارنے کی کوشش میں منہمک تھے۔ ان کے تمام خاکے تیار ہو چکے تھے۔ صرف رنگ بھرنا باقی تھا کہ بلاوا آگیا اور وہ داغ مفارقت دیکر بھری محفل سے اُٹھ گئے۔ ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

بوس بابو کی ہر کوشش جذبات و محسوسات کا آئینہ ہوتی ہے، وہ ہمیشہ ایک نئے موضوع پر قلم اُٹھاتے ہیں اور ظاہرداریوں سے دامن بچا کر دل کی دنیا کو اتنا نمایاں کر دیتے ہیں کہ پھر کسی عنوان کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہ جس ڈھنگ کی تصویر بناتے ہیں اُسے اُسی رنگ میں اتنا مکمل کر دیتے ہیں کہ اصطلاحی باریکیاں خود منھ سے بول اُٹھتی ہیں۔ پہاڑی، مغل، راجپوت اور بودھ اسکول کی طرح چینی، جاپانی اور رومی طرز کی ہو بہو عکاسی اُن کے موئے قلم کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ فن کا ایسا عالمگیر ادراک دنیا میں شاید ہی کسی دوسرے مصوّر کو نصیب ہوا ہو۔ جاپان سے واپسی پر انھوں نے ریشم پر چینی رقاصہ کی ایک قدِ آدم تصویر بنائی تھی، یہی اُن کا شاہکار ہے۔ باغ کی کُنج میں ایک دفعہ اُنھوں نے پٹی کھول کر انگلیوں ہی سے ایک ایسی حسین تصویر بنا دی جسے دیکھ کر ان کے ہاتھ کی روانی اور صفائی کا بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

بوس بابو خانہ ساز خالص دیسی رنگوں کا استعمال کرتے ہیں۔ ہالدار کے موضوعات مقابلتاً سطحی اور پامال ہوتے ہیں۔ بوس بابو کے تخیل کی رفعت اور ان کے اختراع کی گرمجوشی ان کی دسترس سے باہر ہیں۔ ہالدار رنگ و نور کے طوفانوں میں کھوئے سے رہتے ہیں۔ پھر بھی ان کی ہر کوشش میں جذبات نگاری کی شان موجود رہتی ہے۔

لکھنؤ کے حکیم محمد خاں نے مغل اسکول کے انداز میں ہندوؤں کی جذبات نگاری اور

مغرب کی رنگ آمیزی کو یکجا کرکے ایک نئی طرز کی داغ بیل ڈالی، اور ان کی "نادر شاہ" نامی تصویر نے ثابت کر دیا کہ وہ اپنے فن کے واقعی استاد ہیں۔ ان کی اس تصویر کو دیکھکر ارونڈو گھوش نے انھیں روفیل کا ہمپایہ قرار دیا ہے۔ گنگولی کی شاگردی میں رہ کر حکیم نے ہندوؤں کی مخصوص جذبات نگاری کا بھی بڑی کامیابی کے ساتھ تتبع کیا ہے۔ ان کی تصویروں میں "رکمنی کا خط" "نادر شاہ" "سرما" "بیربل کی بیٹی" "اکبر" تاج محل کا خواب" "سمن برج میں جہانگیر اور نورجہاں" گلاب کی کلی، محمد شاہ رنگیلے کا دربار" ہمایوں کی وفات، سکندرہ کی تعمیر، سکندر کی پیدائش، لیلیٰ مجنوں، قیدی دارا، اور مولانا روم کے مسدس کے پہلے شعر کی تفسیر بالکل نئے ڈھنگ کی ہونے کے باعث خاص طور سے مشہور ہیں۔ حکیم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے بنگال اسکول کی اندھی تقلید نہیں کی۔ حالانکہ وہیں سے انھوں نے فن مصوری کی تعلیم حاصل کی۔ چغتائی نے بھی حکیم کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی ہے، مگر ان کی تصویروں کی وضع قطع شکل وشباہت بالکل ایرانی ہوتی ہے۔ لیکن جذبات نگاری کے میدان میں قدم رکھتے ہی وہ بنگال اسکول کے ریلے میں بہہ جاتے ہیں۔ چغتائی کے پاس بوس اور حکیم وغیرہ کی طرح کوئی روح کا پیغام نہیں ہے۔ اسی لئے انھیں خیام، غالب اور اصغر وغیرہ کا دست نگر رہنا پڑتا ہے
بنگال اسکول کے باغیوں میں سب سے پہلا نام پرمود کمار چٹرجی کا آتا ہے۔ ان کی ابتدائی کوششیں شبیہ سازی تک ہی محدود تھیں۔ رفتہ رفتہ انھیں جذبات نگاری کا چسکا پیدا ہوا۔ اسی دوران میں وہ ہمالیہ پربت پر چلے گئے، جہاں قدرتی مناظر کے ساتھ ساتھ مذہبی تصویروں کی طرف بھی ان کی توجہ مبذول ہوئی اور آہستہ آہستہ وہ بنگال اسکول کے زبردست حامی بن گئے قدرتی مناظر کی مغربی ڈھنگ کی بیشمار تصویریں ان کی یادگار ہیں لیکن بنگال اسکول کے رنگ میں انھوں نے جو تصویریں بنائی ہیں ان میں "شیو اور پاربتی" ان کی بہترین تصویر مانی جاتی ہے انھوں نے کچھ تصویریں ستیندر ناتھ سین کی شرکت میں بھی بنائی ہیں۔

بنگال کی طرح بمبئی میں بھی انیسویں صدی کے آغاز ہی سے نئے طرز کی مصوری میں کمال حاصل کرنے کی متعدد کوششیں ہوئیں۔ لیکن ابتدائی گمراہی کے باعث وہ کامیاب نہیں ہوئیں آجکل بمبئی اسکول کے نام لیواؤں میں کلا دھی سب سے آگے ہیں۔ خطوط کی سحر کاری ان کے موئے قلم کا ادنیٰ معجزہ ہے۔

ٹیگور اسکول کے عالمگیر اثرات سے گجرات میں بھی فن مصوری کے از سر نو زندہ کرنے کی تحریک

شروع ہوئی جس کے بانی میانی رنجیت رام اور معاونین پرشوتم ماوجی اور دُھرندھر جیسے صاحب نظر محبانِ وطن ہیں۔ اس تحریک کے آغاز سے چالیس برس پیشتر بمبئی میں آرٹ اسکول قائم ہو چکا تھا اُس وقت دُھرندھر بمبئی کے چوٹی کے مصوّروں میں شمار ہوتے تھے لیکن روی ورما کی طرح وہ بھی بمبئی آرٹ اسکول کے مقلد تھے۔ اور مغربی ڈھنگ کی تصویریں بنانے ہی کو سب سے بڑی کامیابی سمجھتے تھے۔ مہاراشٹر میں بھی ان کے ہم خیال چند مصوّر موجود تھے۔ لیکن انھیں دنوں بمبئی آرٹ اسکول میں ایک ایسا شخص بھی تربیت حاصل کر رہا تھا جس نے آگے چل کر ٹیگور کی مشعلِ ہدایت سے اپنا چراغ روشن کیا۔ اور گجرات کے نئے اسکول کا صحیح معنوں میں افتتاح کیا۔ یہ ہونہار نوجوان روی شنکر راول تھا۔

۱۹۱۵ء میں سورت میں جو نمایش ہوئی اُس میں راول کی گرجری سندری (حسین گوجری) کو طلائی تمغہ انعام ملا۔ جذبات کی نمایندگی اور خط و خال کی ہم رنگی راول کی امتیازی خصوصیت ہے۔ اُن کے ہم نام و ہمعصر روی شنکر پنڈت بھی اعلیٰ درجہ کے مصور ہیں۔ مناظر کی عکاسی اور جانوروں کی منھ بولتی تصویریں بنانے میں انھیں غیر معمولی مہارت حاصل ہے۔ ان کی تصویریں خطوط کی جادوگری کا نادر نمونہ ہوتی ہیں۔

راول کے شاگردوں میں کنو دیسائی نے خوب نام پیدا کیا ہے۔ عکسی تصویریں یا چھایا چتر بنانا ان کا مخصوص مشغلہ ہے۔ اور سلہٹ یا سیاہ دھبّوں سے شبیہ سازی میں تو انھیں کمال حاصل ہے۔ سلہٹ کی تیاری میں مصوّر کے لئے خطوط کا استعمال ممنوع ہوتا ہے۔ اس لئے ایک ہی رنگ سے جذبات اور چہرے مُہرے کے انقلابات ظاہر کرنا پڑتے ہیں جو بہت مشکل کام ہے لیکن ڈیسائی کے لئے یہ ایک معمولی سی بات ہے۔ ان کا ہر نقش سُبک اور سُگھڑ ہوتا ہے اور اس میں تنوع کے ساتھ ساتھ تخیل کی بلندی بھی موجود رہتی ہے۔ کنو دیسائی نے ہندوستان کے نامور مصور نند لال بوس بابو کے آگے بھی زانوئے ادب تہہ کیا ہے اور اپنی تصویروں میں وہی رنگ بھر کر اُنھیں اُجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

نئی دہلی کی سرکاری عمارتوں میں جن لوگوں نے اپنے کمالِ فن کے جوہر دکھائے ہیں، ان میں ایک جگناتھ اہیواسی بھی ہیں جو گجرات اسکول کے نمایندہ ہیں اور ایک بلند پایہ مصوّر مانے جاتے ہیں۔ پرمود کمار چٹرجی کے گجراتی شاگردوں میں سومالال شاہ اور کرشن لال بھٹ نیز راول اور دیبی پرشاد رائے (مدراسی) کے شاگرد رسک لال پریکھ بھی اسی زمرے میں آتے ہیں

واقعاتی تصویروں میں درگا شنکر پانڈیا نے اچھا نام پیدا کیا ہے۔

گجرات کی طرح مدراس۔ میسور۔ اور آندھرا میں بھی بنگال اسکول کی تقلید سے انقلاب عظیم کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے یو۔ پی۔ پنجاب اور بہار وغیرہ اس دوڑ میں بہت پچھڑے ہوئے ہیں۔ یو۔ پی میں حکیم صاحب کے علاوہ مشہور مصور ایشری پرشاد کے صاحبزادے رامیشور پرشاد ورما اور پریم بہادر مدھوار بریلوی بھی ہونہار ہیں۔

خیر مقدم

(نتیجۂ فکر حضرت مدہوش)

۲۷۔ اپریل ۱۹۴۱ء کو ریڈ کراس فنڈ کی امداد میں کانپور میں ایک مشاعرہ ہوا، جس میں اطراف ملک کے نامور شعرا رونق افروز تھے۔ مشاعرہ کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے ایڈیٹر "زمانہ" کو ان معزز مہمانوں کے خیر مقدم کا فرض ادا کرنا تھا۔ چنانچہ عین تاریخ مشاعرہ کی شام کو مکرمی مدہوش صاحب سے جو خود بھی اس بزم سخن کی شرکت کے لئے کانپور تشریف لائے تھے چند اشعار بطور خیر مقدم کہنے کی فرمایش کی گئی۔ ممدوح نے صرف چند منٹ کے غور و فکر میں مشاعرہ کمیٹی کے دلی جذبات کے اظہار میں مصرع طرح پر یہ پر لطف قطعہ نظم فرما دیا۔ (مصرعۂ طرح یہ تھا "دستِ سوال میرا اونچا ہے آسماں سے") صدر نے مختصر ریمارکس کے ساتھ مشاعرہ کے آغاز میں ان اشعار آبدار سے ارباب کمال کا خیر مقدم کیا۔ یہ قطعہ کیا ہے اردو شاعری کے متعلق ہمارے دلی جذبات کا آئینہ ہے۔ اس لئے ہم اس سے ناظرین "زمانہ" کو بھی لطف اندوز ہونیکا موقعہ دیتے ہیں۔ ایڈیٹر

ایوانِ شاعری میں ان کاملانِ فن کی — تعظیم و داد و تحسیں ممکن نہیں زباں سے
ہیں آج زیبِ محفل وہ ہستیاں کہ جن کے — اشعار کو ہے نسبت دراصل کہکشاں سے
وابستہ اور بھی ہے اُمید ان سے ہم کو — اظہار گو کہ اُس کا دشوار ہے زباں سے
تنقید زندگی میں وہ وہ بلندیاں ہوں — جو شعر کی زباں ہے بڑھ جائے آسماں سے
ٹوٹی ہوئی سی لے ہے ٹوٹا ربابِ عالم — بے نظمیاں ادب میں ہیں شورشِ جہاں سے
کھوئے ہوئے وہ نغمے مِل جائیں کاش اس کو — سازِ سکوں ہو پیدا ہنگامۂ جہاں سے

پیدا ہو شعریت سے حسنِ عمل کی صورت
تعمیر ہو جہاں کی سوزِ غمِ نہاں سے

شیخ سے خطاب

(حضرت جوشؔ ملیح آبادی)

اے شیخ شہر! خرقۂ سالوس اُتار دے
دل کو بھی مثل کاکل شبگوں سنوار دے

بنیاد کاروبار ہے جس ماہ وش کا نام
اس ماہ وش کو خلوت جاں میں بھی بار دے

ہر دل پہ کندہ کرتا ہے جو نقش دل نشیں
خود اپنی لوح دل پہ بھی وہ نقش ابھار دے

تا چند دوسروں کے نکھارا کرے گا رنگ
اپنے بھی دل کا رنگ خدارا نکھار دے

تا چند منعموں کے لئے مژدۂ چمن؟
بے زر کو بھی پیام نسیم بہار دے

اس ظاہری کلاہ کی تزئین تا کجا؟
باطن کے تاج کو بھی دُر شاہوار دے

تو مسکرا کے جوشؔ دیا شیخ نے جواب
یہ نشہ وہ نہیں جسے ترشی اُتار دے

رُباعی

حق کا کوئی پابند نہیں ہے واللہ
حق سے کوئی خورسند نہیں ہے واللہ
اخلاص و شرافت کا نمونہ ہے جو شخص
آدم کا وہ فرزند نہیں ہے واللہ

دیگر

تجرید کے دائرہ میں کثرت کیسی؟
اطلاق کے میدان میں وحدت کیسی؟
اللہ کو اے احد بتانے والو!
اللہ کے اندر عددیت کیسی؟

دیگر

ابکی بھی کٹی بہ آہ و زاری برسات
لائی نہ پیام کامگاری برسات
افسوس کہ اس بار بھی اے جان بہار
روتے ہی گذر گئی ہماری برسات

زبان کے پیچیدہ مسئلہ کا حل

(از خواجہ غلام السیدین ایم۔اے، ڈائرکٹر تعلیمات ریاست جموں وکشمیر)

بدقسمتی سے ملک کی قومی زبان کے مسئلہ کے بارے میں لوگوں میں بڑی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اور بعض لوگ اس پر بحث کرتے وقت اپنے من مانے اور بے بنیاد خیال کو ثابت کرنے کے لئے تاریخ کے اٹل اُصولوں اور فیصلوں کو بھول جاتے ہیں، اُنھیں یہ معلوم نہیں کہ کسی قوم یا ملک کی زبان اُس کے صدیوں کے تاریخی حالات و واقعات کا نتیجہ اور مختلف جماعتوں کے میل جول اور تہذیبی لین دین کی یادگار ہوتی ہے، وہ کسی ریزولیوشن کے پاس کرنے سے نہ بن سکتی ہے نہ بگڑ سکتی ہے نہ بدل سکتی ہے۔ اور اگر اس کو زبردستی بدلنے کی اور تاریخ کے دھارے کا رخ کاٹنے کی کوشش کی جائے تو اس میں سیکڑوں برس کی تہذیب و تمدن کی عزیز یادگاریں تباہ ہوجانے کا اندیشہ ہوتا ہے نامور شاعر میر نے دل کی بستی کے بسنے اور اُجڑنے کے بارے میں ایک بڑے پتہ کی بات کہی تھی جو میرے خیال میں زبان کے معاملے پر بھی ٹھیک بیٹھتی ہے ؎

دل کی بستی کھیل نہیں ہے بستے بستے بستی ہے
دل کا اُجڑنا سہل سہی، بسنا سہل نہیں ظالم

زبان کی بستی کا بھی یہی حال ہے۔ ہمارے دیس کے سچے خیر خواہ جو لوگوں کے دلوں کو ملانا اور اس میل اور محبت کے ذریعہ اس ملک میں امن اور آشتی کی بستی بسانا چاہتے ہیں، اُنھیں ٹھنڈے دل سے اس مسئلہ پر سوچ بچار کرنا اور اس کو سیاسی جھگڑوں اور مخالفتوں کی لپیٹ سے بچانا چاہیے تاکہ صدیوں کا بنا بنایا کھیل ہماری ہٹ دھرمی یا ناسمجھی کی وجہ سے بگڑ نہ جائے۔ آپس میں لڑنے جھگڑنے کے لئے سیاست، تجارت، صنعت و حرفت کا بہت بڑا میدان پڑا ہوا ہے، لڑنے والے سورماؤں کو اس میدان میں کشتی کرنے دیجیے، مگر تعلیم اور زبان کے باغ کو ان کانٹوں سے پاک رکھیئے جو اس میدان میں پیدا ہوتے ہیں۔ زبان کے بارے میں دو تین باتیں اس قدر صاف اور سچی ہیں کہ اگر لوگ ان کو

ؔ۱ یہ مضمون پرنس آف ویلز کالج جموں کے کنووکیشن ایڈریس کا درمیانی جزو ہے جس میں خواجہ غلام السیدین صاحب ڈائرکٹر تعلیمات ریاست جموں وکشمیر نے مشترکہ زبان کے اہم مسئلہ پر اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔

سمجھ لیں تو بہت سے جھگڑے مٹ جائیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ مثلاً مصر میں لاکھوں عیسائی عربی بولتے ہیں، لیکن وہ مسلمانوں کی نہیں اپنی زبان سمجھتے ہیں، البانیہ اور چین میں لاکھوں مسلمان ان ملکوں کی زبان بولتے ہیں۔ لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے کہ یہ زبان ان کی نہیں ہے۔ یہ کہنا کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے یا ہندی ہندوؤں کی زبان ہے ایک بے معنی بات ہے زبان اُس شخص کی ہے جو اس کو بولے اور خدا کا شکر ہے کہ زبان کی بستی میں سرمایہ داری کا سکہ نہیں چلتا جس زبان میں شمالی ہندوستان کے کروڑوں ہندو مسلمان روزمرہ بات چیت کرتے ہیں اُس کو صرف ہندوؤں یا صرف مسلمانوں کی زبان قرار دینا قومی میل جول کے راستے میں روڑا اٹکانا ہے۔ یہ وہی زبان ہے جسے آپ سب لوگ اپنی بول چال اور تحریر و تقریر میں استعمال کرتے ہیں، جب اپنی خاص مقامی بولی نہیں بولتے ہوتے۔ کشمیر میں کشمیری مسلمان آپس میں اکثر کشمیری بولی میں بات چیت کرتے ہیں اور جموں میں بہت سے لوگ آپس میں ڈوگری بولتے ہیں لیکن جب ایک ڈوگرہ کشمیری سے گفتگو کرتا ہے تو وہ یہی زبان بولتا ہے۔ اسی طرح پنجاب میں ہندو مسلمان سکھ آپس میں روزمرہ کی بات چیت پنجابی میں کرتے ہیں اور مثلاً بہار میں بعض جگہ میتھلی بولی بولتے ہیں۔ لیکن جب پنجابی، بہاری سے ہم کلام ہوتا ہے تو اسی زبان میں باتیں کرتا ہے جو ہم اور آپ استعمال کرتے ہیں۔ یہ زبان کہیں باہر سے نہیں آئی۔ اسی ملک میں پیدا ہوئی، اسی میں پروان چڑھی، اس کے بنانے اور سنوارنے میں، اس کی نوک پلک درست کرنے میں، اس کو آب و تاب دینے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا برابر کا حصہ ہے۔ اور اس کی تاریخ میں دونوں جماعتوں کے ادیبوں کے نام ستاروں کی طرح چمکتے ہیں اسی زبان کو کبھی ہندی کہا گیا ہے کبھی اُردو، کبھی ہندوستانی۔ مگر جب تک ملک میں یہ زبانوں کی جنگ شروع نہیں ہوئی تھی ان سب ناموں کا مفہوم ایک ہی سمجھا جاتا تھا۔ یعنی شمالی ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کی بول چال کی زبان۔ لیکن اب ناسمجھ سورماؤں نے زبان کے نام اور مفہوم دونوں کے بارے میں لڑنا شروع کر دیا ہے۔ یعنی انھیں نہ آم کھانے سے مطلب ہے نہ گٹھلیاں گننے سے بلکہ محض گٹھلیوں کے ذریعہ عقل اور رواداری کا سر توڑنا منظور ہے!

زبان کے بارے میں ایک اور بات یاد رکھنی چاہیئے، اور وہ یہ ہے کہ ہماری زبان کے مختلف سُر ہیں۔ آپس کی روزمرہ کی بات چیت میں اس کا ایک سُر ہوتا ہے، بازار کے لین دین اور بیوپار میں دوسرا اور علمی و ادبی مجلسوں میں تیسرا۔ اسی طرح گاؤں کا سُر شہر کے سُر سے مختلف ہوتا ہے، اور عورتوں کی بول چال کا سُر مردوں سے الگ اور زیادہ سُریلا ہوتا ہے۔ لیکن یہ شکایت کی بات نہیں یہ تو زبان

کی لچک اور وسعت کا ثبوت ہے اور اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ مختلف میدانوں میں پہونچ کر اس علم زبان کے جدا جدا روپ نظر آتے ہیں۔ جب یہ زبان فلسفے، مذہب یا ادب کی سرزمین میں قدم رکھتی ہے تو آپ اس کا درشن ان نئے نئے روپوں میں کر سکتے ہیں۔ جب کوئی ادیب یا ودوان اپنی تعلیم اور مذاق کے مطابق ہندی اور سنسکرت کے خزانوں سے مدد لیتا ہے تو وہ ہندی ساہتیہ کی زبان بن جاتی ہے جب وہ فارسی اور عربی کے خزانوں کی طرف توجہ کرتا ہے تو وہ اردوئے معلیٰ بن جاتی ہے اور یہ بات بھی قابل اعتراض نہیں، کیونکہ:-

The wind of genius bloweth where it listeth.
And one knoweth not whence it cometh nor whither it goeth.

ہندوستان کے سینے میں اتنی فراخی اور رواداری ہے اور ہندوستانیوں کے دل میں اتنی گنجائش ہونی چاہیئے کہ وہ اردو ادب اور ہندی ادب دونوں کی ترقی کے لئے کوشش کریں اور دونوں کی ترقی سے خوش ہوں۔ کیونکہ یہ دونوں زبانیں ہمارے ملک کی پیاری زبانیں ہیں اور ہمیں ان کا پھولنا اور پھلنا بھلا معلوم ہونا چاہیئے۔ اور انھیں دونوں زبانوں کا کیا ذکر ہے، ہندوستان کے مختلف صوبوں میں اور جتنی بڑی بڑی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ہمیں ان کو بھی علم اور ادب سے مالا مال کرنا چاہیئے۔ البتہ آپس کی صوبائی بول چال کے لئے ایسی زبان کرنی چاہیئے۔ جو زیادہ سے زیادہ لوگ بول اور سمجھ سکیں۔ اور اس معاملہ میں ہندو اور مسلمانوں کو عربی اور سنسکرت، گھر کے لفظوں اور باہر کے لفظوں کا تعصب بھلا دینا چاہیئے کیونکہ یہ ملک کے ایکے کا سوال ہے جس کے مقابلہ میں اس قسم کے جھگڑے بے کار ہیں۔

جہاں تک ادب اور شاعری کا معاملہ ہے یاد رکھیئے کہ ہر اچھا ادیب یا شاعر یا مصنف اپنے لئے وہی زبان پسند کرتا ہے جس کے ذریعہ وہ سب سے زیادہ کامیابی کے ساتھ اپنے من کی بات اپنے پڑھنے والوں تک پہنچا سکتا ہو۔ کوئی باہر کا اثر اُسے مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی زبان میں کون سے لفظ استعمال کرے اور کون سے لفظ استعمال نہ کرے۔ اس بارے میں اس کی اپنی طبیعت اور خوش مذاقی ہی چراغ راہ کا کام دے سکتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر وہ کسی خاص جماعت یا طبقہ کا نام لیوا نہیں بننا چاہتا بلکہ عام لوگوں کی خاطر لکھتا ہے تو اُسے وہی زبان استعمال کرنا ہوگی جسے قبول عام حاصل ہو۔ اس لئے میرے خیال میں یہ کہنا درست ہوگا کہ اس شرط کے اندر اندر شاعر اور ادیب تو اپنی حدیں خود قائم کرتے ہیں، لیکن جہاں تک عام بول چال اور لین دین کا تعلق ہے ہمارا

فرض ہے کہ ہم آسان اور سلیس زبان بولیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ہم اپنا مطلب سمجھا سکیں
ایسی زبان کی جانچ یہی ہے کہ ہم وہ لفظ استعمال کریں جن کا سکہ چالو ہے۔ جو لوگ بےضرورت
بڑے بڑے نامانوس لفظ استعمال کرتے ہیں وہ اپنی قابلیت سے دوسروں پر جھوٹا رعب ڈالنا
چاہتے ہیں لیکن در اصل یہ ان کی زبان دانی کی کمی ہے جسے وہ بھاری بھاری لفظوں کے پردے
میں چھپانا چاہتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لیجئے کہ اعتراض کی بات بڑے بڑے لفظوں کا استعمال
نہیں بلکہ نامانوس لفظوں کا استعمال ہے۔ یعنی وہ لفظ جن کی صورت اور معنی کو زیادہ تر لوگ نہ پہچانتے
ہوں۔ بعض لوگ بے سمجھے بوجھے یہ حکم لگا دیا کرتے ہیں کہ ہمیں اپنی زبان میں عربی اور فارسی یا ہندی
اور سنسکرت کے لفظ نہ لانا چاہئیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ جو زبان ہم اور آپ بولتے ہیں اُس کے
زیادہ تر لفظ انھیں زبانوں سے لئے گئے ہیں۔ یہ سب نہایت ترقی یافتہ زبانیں ہیں اور اگر آپ
ان کے تمام لفظ اپنی زبان سے نکال دیں تو زبان بالکل کنگال ہو جائے گی۔ در اصل ہندوستان
کی تہذیب اور ہندوستان کی زبان دونوں کی سب سے بڑی صفت یہی رہی ہے کہ انھوں نے
ہمیشہ بہت کھلے دل سے اپنے اندر ان چیزوں کو جذب کیا ہے جو انھیں دوسری تہذیبوں یا زبانوں
سے حاصل ہوئی ہیں۔ اسی رواداری کی وجہ سے ہماری زبان اور ہماری تہذیب مختلف اثروں کا خوبصورت
گنگا جمنی سنگھم بن گئی ہے۔ اسی لئے اب کسی لفظ یا اندازِ بیان یا کسی سماجی اثر یا علمی تحریک کو صرف
اس وجہ سے رد کرنا کہ وہ ابتدا میں کسی غیر ملک یا غیر قوم سے تعلق رکھتی تھی، اپنی تاریخ کو
جھٹلانا اور اپنی تہذیب کے ساتھ دھوکہ کرنا ہے۔ اگر شدھ ہندی کے پرچارک ملک کی زبان سے
ان حسین الفاظ اور خیالات کو نکالنا چاہیں جو فارسی اور عربی زبانوں یا اسلامی تہذیب کے ساتھ
تعلق رکھتے ہیں تو یہ بہت بڑی تنگ نظری اور ملکی ایکے کے ساتھ دشمنی ہوگی۔ اسی طرح اگر اردو
کے طرفدار ان لفظوں کے برتنے سے پرہیز کریں جو ہندی یا سنسکرت سے نکلے ہیں یا ان عمدہ تمدنی
اثرات کو مٹانا چاہیں جن کا رشتہ پُرانی ہندوستانی تہذیب سے ملتا ہے یا جو ہندو مسلم تہذیب
کے میل جول سے پیدا ہوئے ہیں تو وہ بھی اتنے ہی قابل الزام ہیں۔

لفظوں کی کسوٹی صرف ایک ہی ہے، یعنی زبان میں ان کی کھپت اور قبولِ عام، جو لفظ شروع
میں ہماری زبان میں مہمانوں کی طرح داخل ہوئے اور پھر اسی میں گھل مل کر گھر والے بن گئے وہ
اب ہماری زبان کے لفظ ہیں خواہ وہ بچپن میں ہندی اور سنسکرت کی زبان میں پلے ہوں یا عربی
اور فارسی کے چشم و چراغ رہ چکے ہوں۔ جو لفظ کئی سو برس کے میل جول کی وجہ سے ہماری زبان

میں رچ گئے ہیں انھیں زبان سے نکالنے کی کوشش نامبارک ہے۔ اور اگر انصاف کوئی چیز ہے اور تاریخ کا فیصلہ کوئی معنی رکھتا ہے تو اس میں کامیابی نہیں ہو سکتی۔ ہمارے نوجوانوں کا فرض تو یہ ہے کہ وہ اُن تمام لفظوں کا سواگت کریں جو ہماری زبان کے ساتھ میل کھاتے ہیں لیکن زبان کو ایسی بے تکی ٹھانس سے بچائیں جو اس کی جینیس (Genius) کے خلاف ہو۔ اگر وہ اپنی قوم اور اپنی زبان اور ادب کے سچے خیر خواہ ہیں تو وہ نہ پریم اور سندر اور سماج اور روپ اور درشن جیسے خوبصورت لفظوں پر ناک بھویں چڑھائیں گے نہ مزاج شریف اور آداب عرض اور تہذیب و شرافت سے خفا ہونگے۔ ہماری زبان کے نغمے میں بہت سے سُر بھرے ہوئے ہیں، ان میں سے بعض کو نکال کر نغمہ کی مٹھاس کو کیوں کم کیا جائے؟ ہاں اگر روزمرہ کی بول چال میں ہم جان بوجھکر تعصب اور تنگ نظری سے کام لیں اور مگر کے بجائے پرنتو، اور کے بجائے تتھا، فائدہ کے بجائے اپیوگ، سوال کے بجائے پرشن اور جواب کے بجائے اتر، مدد کے بجائے سہاتا، جوں ہی کی بجائے جھٹ تو یکہ، دیر لگانے کے بجائے معرض التوا میں ڈالنا، بات ماننے کے بجائے اعتراف حقیقت اور رائے دینے والوں کے بجائے رائے دہندگان پر اصرار کریں گے تو زبان کی موسیقی ہٹ دھرمی کی بھینٹ چڑھ جائے گی اور کچھ عرصے کے بعد ہم لوگوں کو جو آج کم و بیش ایک زبان بولتے ہیں ایک دوسرے سے بات چیت کرنے کے لئے ترجمہ کرنے والوں کی ضرورت ہوگی۔ خدا کرے کہ ہم زبانوں اور دلوں کی اس جدائی سے بچے رہیں!

شاید مجھ سے پوچھا جائے کہ میں جس قومی زبان کا ذکر کر رہا ہوں۔ اس کا کہیں وجود بھی ہے یا وہ ابھی تک محض ایک خواب ہے جس کی بوجھ معلوم نہیں۔ وہ زبان بے شک موجود ہے اور اس کے اچھے نمونے آپ کو بہت سے ہندو اور مسلمان لکھنے والوں کی کتابوں میں ملیں گے۔ لیکن شاید اس کا سب سے اچھا نمونہ وہ زبان ہے جس میں حالی نے اپنی مشہور مثنوی "بیوہ کی مناجات" لکھی ہے اور جس کے متعلق ڈاکٹر عبدالحق نے مہاتما گاندھی سے کہا تھا کہ اگر کبھی اس بدقسمت ملک کی ایک مشترک زبان بنی تو وہ "مناجات بیوہ" کی زبان ہوگی۔ دیکھیئے اس سیدھی سادی اور آسان زبان میں جس میں ہندی سنسکرت۔ عربی۔ فارسی سب کے اچھے اچھے الفاظ سموئے گئے ہیں، ایک باکمال شاعر خدا کی حمد کے مشکل میدان میں کیا جوہر دکھاتا ہے۔

سب سے انوکھے، سب سے نرالے　　آنکھ سے اوجھل، دل کے اُجالے
ناؤ جہاں کی کھینے والے　　دکھ میں تسلی دینے والے

جب، اب، تب، تجھ سا نہیں کوئی،
تجھ سے ہیں سب، تجھ سا نہیں کوئی،

جوت ہے تیری، جل اور تھل میں
باس ہے تیری پھول اور پھل میں

ہر دل میں ہے تیرا بسیرا
تو پاس اور گھر دور ہے تیرا

دل میں ہے جن کے تیری بڑائی
گنتے ہیں وہ پربت کو رائی

تو ہی ڈبوئے، تو ہی ترائے
تو ہی بیڑے پار لنگھائے

تو ہی پلائے زہر کے پیالے
تو ہی پھر امرت زہر میں ڈالے

تو ہی دلوں میں آگ لگائے
تو ہی دلوں کی لگی بجھائے

چمکارے، چمکار کے مارے
مارے مار کے پھر چمکارے

اور پھر اس میٹھی زبان میں وہ ایک بدنصیب بیوہ کے دکھی دل کی پکار کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ پتھر کا کلیجہ پانی ہو جائے، ذرا لفظوں کے انتخاب کو دیکھیے :-

ہیرا بخشا کان کو تو نے
مشک دیا حیوان کو تو نے

جگنو کو بجلی کی چمک دی
ذرے کو کندن کی دمک دی

عام ہے سب پر تیری رحمت
ہیں محروم مگر بد قسمت

سب کو تیرے انعام تھے شامل
میں ہی نہ تھی انعام کے قابل

تھی نہ کمی کچھ تیرے گھر میں
نون کو ترسی میں سانبھر میں

آن کے آخر میں نے لیا کیا
مجھ کو مری قسمت نے دیا کیا!

نین دیئے اور کچھ نہ دکھایا
دانت دیئے اور کچھ نہ چکھایا

سیلانی جب باغ میں آئے
پھول ابھی تھے کھلنے نہ پائے

پیت نہ تھی جب پایا پیتم
جب ہوئی پیت گنوایا پیتم

دل پہ ہے جب کوئی برچھی چلتی
آہ کلیجہ سے ہے نکلتی

ورنہ ہے اس دنیا میں دھرا کیا
خواب کا سا ہے اک یہ تماشا

عیش کی یاں مہلت ہے نہ غم کی
سب یہ نمائش ہے کوئی دم کی

آنی جانی چیز ہیں خوشیاں
چلتی پھرتی چھاؤں ہیں ارماں

ریت کی سی دیوار ہے دنیا
اوچھے کا سا پیار ہے دنیا

ہار کبھی اور جیت کبھی ہے
اس نگری کی ریت یہی ہے

سات سہاگ اور سوگ ہے یاں کا — ناؤ کا سا سنجوگ ہے یاں کا
اُٹھ نہیں سکتے مجھ سے اب اک دم — یہ دنیا کے ناشدنی غم!

دل میں لگن بس اپنی لگادے
سارے غم اپنے غم میں کھپادے

یہ وہ زبان ہے جو نہ ہندو کی زبان ہے نہ مسلمان کی، یہ ہندوستان کے دکھے ہوئے دلوں اور گھٹے ہوئے جذبات کی زبان ہے جو اسی ملک کی خاک میں پیدا ہوئی اور یہیں پروان چڑھی اس کی بے لاگ خدمت کرنا ملک کا بھلا چاہنے والوں کا فرض ہے۔ اس کو اُردو بولنے والے اور ہندی بولنے والے دونوں اپنا سکتے ہیں اور اسی کو اگر آپ چاہیں تو ہندوستانی یعنی ہندوستان والوں کی زبان کا نام دے سکتے ہیں۔

پست قوم

(جوش ملیح آبادی)

اپنے خلاف بات سُنیں اور خوش رہیں — ذہنوں میں وہ طہارت و وسعت کہاں ہے، جوش!
چلتی ہے کوہ و بحر کو جو روندتی ہوئی، — اہلِ جمود میں وہ محبت کہاں ہے جوش!
اپنی اہانتوں کا کچھ احساس کر سکیں — اتنا دلوں میں جذبۂ غیرت کہاں ہے، جوش!
اہلِ نظر کی قدر کریں حسب مدّعا — ابنائے ملک میں وہ بصیرت کہاں ہے جوش!
گردن کا طوق، پاؤں کی زنجیر کاٹ دے — اِتنی غلام قوم میں ہمت کہاں ہے، جوش!
اپنی تباہیوں پہ کبھی غور کر سکے — اِتنی ذلیل قوم کو فرصت کہاں ہے جوش!
اِک حرفِ گرم سنتے ہی لو دے اُٹھے دماغ — ہندوستان میں وہ حرارت کہاں ہے جوش!

(نیا ادب)

من مندر کی دیوی

(از مسٹر فیاض الدین احمد خاں، فیاض، بی ۔ اے)

وہ مست نظر، چال وہ اٹھلائی ہوئی سی
آنکھوں میں محبت کی چمک آئی ہوئی سی
بجلی وہ چمکتی ہوئی لہرائی ہوئی سی

لپٹا ہوا اِک سرمئی ساری میں بدن سب
جس طرح چھپا ہو کسی بادل میں چمن سب
جس طرح کلی کنج میں شرمائی ہوئی سی

مندر میں وہ اُس کے رُخِ روشن سے اُجالا
یا نُور کا چمکا ہے شوالے میں شوالا
اِک شمع ہے چمکی ہوئی چمکائی ہوئی سی

ملتے ہی نظر مجھ سے وہ چونکی ہوئی تصویر
جس طرح اچانک ملے اِک خواب کی تعبیر
آنکھوں میں لگاوٹ لیئے گھبرائی ہوئی سی

مندر کی فضاؤں میں ہے اِک برق سی مضطر
محبوب اداؤں میں ہے اِک برق سی مضطر
لپٹی ہوئی ۔ سمٹی ہوئی ۔ تھرّائی ہوئی سی

ہنگامِ طواف آہوئے رَم خوردہ کا انداز
بھٹکی ہوئی نظروں کا وہ بھٹکا ہوا انداز
وحشت پہ وہ شوخی کی ادا چھائی ہوئی سی

اندازِ پذیرائیِ اُلفت سے حسیں اَور
پڑتا ہے کہیں پاؤں تو نظریں ہیں کہیں اَور
کچھ کھوئی ہوئی چیز ہے کچھ پائی ہوئی سی

وہ چاند سے مکھڑے پہ بکھرتے ہوئے گیسو
قامت میں جوانی کا وہ چلتا ہوا جادو
ہر گام پہ جھومی ہوئی لہرائی ہوئی سی

پیغام نگاہوں کا بڑی غور سے پڑھنا
افسانۂ ارمانِ دلی غور سے پڑھنا
ہونٹوں پہ کوئی راز کی بات آئی ہوئی سی

وہ کیف مسلسل ہے نہ وہ جلوۂ بیتاب
اِک خواب تھا، اِک خواب تھا، اِک خواب!
تعبیر ہے تقدیر سے شرمائی ہوئی سی

پھرتی ہے نگاہوں میں مگر اب بھی وہ تصویر ہے دل میں ترا زو ترا چھوڑا ہوا ہر تیر
سینے میں تمنّائیں ہیں اِترائی ہوئی سی
اب محوِ پرستش کسی مندر میں کہاں تو مندر وہ ترا مَن میں ہے رہتی ہے جہاں تو
ہر صبحِ تخیّل پہ مرے چھائی ہوئی سی

اللہ اللہ

(از حضرت سرشار کسمنڈوی)

تجلّی کی گُل کاریاں اللہ اللہ! ہر اک سُو شرر باریاں اللہ اللہ
وہ آنکھوں میں دلمیں کھٹک سی چُبھن سی وہ راتوں کی بیداریاں اللہ اللہ
گلستاں گلستاں، نشیمن نشیمن، یہ شعلے، یہ چنگاریاں اللہ اللہ
مرا گریۂ غم ہے، یا ابرِ رحمت تبسّم کی پُھلواریاں اللہ اللہ
یہ آنکھوں میں تسنیم و کوثر کی لہریں یہ معصوم سرشاریاں اللہ اللہ
محبت جوانی، جوانی محبت نظر کی غلط کاریاں اللہ اللہ
ارے بے مروت، ارے بے مروت یہ نخوت، یہ خودداریاں اللہ اللہ
دوائیں منافق، دعائیں مخالف محبت کی بیماریاں اللہ اللہ
کبھی مسکرانا، کبھی رُوٹھ جانا حسینوں کی دلداریاں اللہ اللہ
نگاہوں کی سازش، قیامت کی سازش بظاہر طرفداریاں اللہ اللہ
سُنا ہے کہ دنیا میں غم اور بھی ہیں وفا کی گرانباریاں اللہ اللہ
سُنہری فضاؤں میں ٹھنڈی ہوائیں یہ برکھا کی تیاریاں اللہ اللہ
زمانہ ہے سرشار آفت رسیدہ
ہماری بھی لاچاریاں اللہ اللہ



تنقید حیات کی کوشش

(۲)

(پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری ایم۔ اے)

(۲۱) دیکھئے کب شام نظمِ زندگی کی صبح ہو — آسمانوں کو بھی جیسے آرہی ہو نیند سی

(۲۲) دیکھ رفتارِ انقلاب فراق — کتنی آہستہ اور کتنی تیز

پہلا شعر اس وقت کہا گیا تھا جب انگلستان نے روس کی مدد سے چکوسلیویکیا کو بچانے کے بجائے چکوسلیویکیا کے ساتھ دغا کی تھی۔ اور چمبرلین نے اُس ملک پر جرمنی کا قبضہ ہوجانے دیا جس پر خود انگلستان کے بعض وزرا مستعفی ہو گئے تھے۔ چکوسلیویکیا کی راجدھانی پراگ پر جرمن فوج کے حملہ کے دردناک تصوّر کے ماتحت یہ شعر کہا گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کائنات کی رگیں شل پڑگئی ہیں اور آسمانوں کو نیند سی آرہی ہے۔ صبح ہونے کے معنی خاتمہ ہونے کے بھی ہیں۔ مشہور عالم فرانسیسی شاعر روماں رولاں نے (جو نوبل پرائز حاصل کرچکے ہیں اور اشتراکی مصنفوں کے صفِ اول میں ہیں اور جنھوں نے گاندھی جی اور رام کرشن پرم ہنس کی سوانح عمری لکھی ہے) انقلاب فرانس کے متعلق ایک ڈراما لکھا ہے جس میں ایک جگہ یہ منظر دکھایا گیا ہے کہ انقلاب فرانس ہونے کے چند لمحے پہلے تک جمہور کو یقین ہی نہ آتا تھا کہ انقلاب ہونے والا ہے۔ اس موقع پر اس ڈراما میں یہ ناقابل فراموش فقرہ آیا ہے کہ انقلاب ہونے والا ہوتا ہے تو انقلاب سے زیادہ کوئی چیز انہونی یا غیر متوقع نہیں معلوم ہوتی۔* دوسرا شعر اسی جملے کے مطالعہ کا اثر ہے۔ دوسرے مصرع میں اس زبردست حقیقت کی ترجمانی کی گئی ہے "کتنی آہستہ اور کتنی تیز" کتنی غیر متوقع اور کتنی قریب

(۲۳) حیاتِ عشق کے ہاتھوں ابھی حیات نہیں — غم و خوشی کے لئے آدمی کی ذات نہیں

زندگی نہ ہو تو نہ غم ہو نہ خوشی نہ اُداسی نہ شگفتگی، لیکن ان لوازمات غم اور خوشی، نیکی اور بدی سب سے زندگی بالاتر ہے۔ اس شعر میں عشق سے یہ شکایت کی گئی ہے کہ اس نے زندگی کو غم اور خوشی کا شکار بنادیا۔ دوسرے مصرع میں آدمی کی تقدیر کو اس کے مقصد وجود کو غم و خوشی سے بلند بنایا گیا ہے،

Nothing is more unexpeted than a revolution on the eve of a revolution.

یہی وہ زندہ بے حسی ہے جو غالباً حیات کے مادی عناصر کی آخری منزل ہے۔ لیکن زندگی کے اس داخلی ارتقا یا انقلاب کو ترکِ دنیا والی بے حسی ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے۔ بقول اصغر گونڈوی:

رنج و تعب اُٹھایا، رنگِ نشاط دیکھے آئے نہیں ہیں یوں ہی انداز بے حسی کے

(۲۴) دیکھ تو ابتدا نہیں، سوچ تو انتہا نہیں درد حیات الاماں اُٹھ کے جو اُٹھ چکا نہیں

زندگی اور وجود کے سکون کا تصور ناممکن ہے، سکون بھی ریاضیات کی اصطلاح میں ایک متوازن حرکت (Uniform motion.) ہے۔ زندگی اور موت، ازل اور ابد، دنیا، محشر اور جنت سب اس ازلی اور لاانتہا حرکت کے وقفے ہیں۔ یعنی "آگے چلیں گے دم لے کر"۔

(۲۵) اس سے تو کفر ہی بھلا جو ہے اسی جہان کا ایسے خدا سے کیا جسے فرصتِ ماسوا نہیں

جگر مراد آبادی کا مطلع تھا:۔

یہ تو نہیں کہ عرضِ غم درخورِ اعتنا نہیں عالمِ حسن کو مگر فرصتِ ماسوا نہیں

میرے شعر کو "عالمِ حسن" کی اس بے نیازی کے خلاف جہاد اور بغاوت سمجھیئے۔ عالمِ حسن یا حسنِ حقیقی یا خدا کی بے نیازی کا کوئی ٹھکانا ہے؟ بقول مومن:۔

خدا کی بے نیازی آہ مومن! ہم ایماں لائے تھے جورِ بتاں سے!

گنا ہگار کا تو یہ عقیدہ ہے کہ خدا کا وجود اور خدا کی بے نیازی یعنی عالمگیر وجود کے محرکات سے متاثر ہونے کی عدم صلاحیت ایک متناقض تصور ہے۔ بے نیازی محض ایک نفی صفت ہے، گو اضافیاتی نظریہ سے بظاہر بے نیازی ہر ذرہ اور ہر جاندار میں تصور کی جا سکتی ہے۔ لیکن ہر شے پر سبب اور علت کا اثر ہونا ایک عالمگیر حقیقت ہے جس سے "عالمِ حسن" بھی مستثنیٰ نہیں سمجھا جا سکتا۔ بقول عزیز لکھنوی: "کشش ہر ایک ذرہ کی زمیں سے آسماں تک ہے" ہاں عاشق سے حسن کی بے نیازی تجاہل اور تغافل کی اور بات ہے۔ پہلے مصرع میں "جو ہے اسی جہاں کا" والا ٹکڑا قابلِ توجہ ہے۔

(۲۶) نہ ازل ہے کچھ نہ ابد ہے کچھ یہی موت ہے یہی زندگی
جسے وقت کہتے ہیں اہلِ دل وہ فنا بھی ہے وہ بقا بھی ہے

(۲۷) یہ اجل بھی کیا یہ فنا بھی کیا کبھی دیکھ آ کے فراق کو
اسی زندگی کی تجھے قسم کہ جو درد بھی ہے دوا بھی ہے

(۲۸) جسے دیکھ فکرِ دوام ہے کوئی آشنائے فنا بھی ہے

یہ پیامِ بادِ خزاں بھی سُن کہ گلوں میں بوئے وفا بھی ہے

پہلے شعر کے متعلق جرمن شاعر کا یہ مقولہ قابلِ غور ہے کہ "وقت کے رخنوں سے ابد جھانکتی ہے"
وقت ایک بیکراں حقیقت کا تموج ہے۔ مخصوص لمحات کے لحاظ سے فنا ہے اور کاروانِ وجود
کی رفتار کے لحاظ سے بقا ہے۔ بقا زمانی چیز نہیں ہے بلکہ وجود کل سے احساس وحدت کا نام
بقا ہے، جزویت اور کلیت، انفرادیت اور آفاقیت کی پُراسرار نسبتوں کی روشنی میں فنا اور بقا
کا سمجھنا ممکن ہوتا ہے۔ دوسرے شعر میں موت اور فنا کو غم ہستی کا علاج سمجھنے والے فلسفۂ شکست
کی غلطی بتائی گئی ہے۔ "اسی زندگی کی تھکے قسم کہ جو درد بھی ہے دوا بھی ہے" تیسرے شعر کی شانِ
نزول زیب المنسا کا یہ فارسی شعر ہے:۔

نہال سرکش و گل بے وفا و لالہ دو رنگ درایں چمن بہ چہ امید آشیاں بستم

یہ نازک شعر اور اتنی نرم بات شاید ایک عورت ہی کہہ سکتی تھی۔ لیکن اگرچہ گل دو دن کے
لئے کھل کے مرجھا جاتے ہیں۔ پھر بھی اس کی عارضی شگفتگی میں دوام کی شان ہے، اس میں
بوئے وفا بھی ہے۔ کسی چیز یا حالت کا وقوع میں آ جانا ایک اٹل حقیقت ہے۔ لوگ خارجی
دوام یا زمانی دوام کی تمنا کرتے ہیں۔ فنا کے راز سے آشنا ہو جائیں تو فنا ہی دوام ہے۔ دائمی
وہی ہے جس کی حقیقت فنا ہو، نہ بدلنے کی صفت حقیقتاً فنا نہیں ہے۔ اس سلسلے میں اقبال
کی وہ نظم بھی قابلِ غور ہے جس میں حسن خدا سے پوچھتا ہے "جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا"

(۲۹) اُجڑنا سیکھ دنیا میں اگر سرسبز ہونا ہے گلستاں لہلہائے بارہا نذرِ خزاں ہو کر
(۳۰) انھیں بہار کی آنکھوں نے بھی نہیں دیکھا جو گل چمن کو مٹا کر کھلا کے جاتے ہیں

اِن دونوں اشعار میں نعرۂ انقلاب بلند کیا گیا ہے، تخریب کے بغیر تعمیر ممکن نہیں ہے۔ کوئی
باغ محض جاروب کشی سے یا کھ شاخیں اور پتیاں قلم کرنے سے دوسرا جنم نہیں لے سکتا۔ اُسے خزاں
کی تپتی ہوئی اور جھلس دینے والی ہواؤں کے جھونکوں اور جھکڑوں سے برباد ہونا پڑتا ہے پہلے باغ
میں چنگاریاں اُڑتی ہیں تب پھول کھلتے ہیں۔ اصلاح اور انقلاب میں فرق ہے۔ ارتقا کی مخصوص اور
اہم منزل کا نام انقلاب ہے۔ دوسرے شعر میں "بہار" سے اس ظاہری چمک دمک کی طرف اشارہ
ہے جو استداد زمانہ سے اب چھوٹی پڑ چکی ہے۔ اِس مرگِ حیات نما کو مٹانے ہی سے وہ سچی
زندگی حاصل ہوتی ہے جسے "بہار کی آنکھوں نے بھی نہیں دیکھا، پھر کیا موجودہ جنگ "چمن کو مٹا کر"
کہیں نئے نظام زندگی کا گل تو نہیں کھلا رہی ہے؟

(۳۱) اُجڑنا تھا جنھیں اُجڑے بھرے گلزار کے ہاتھوں مبارک برق کو غارت گرِ صد آشیاں ہونا

(۳۲) انھیں تنکوں میں ڈھونڈھا اے بلبل بجلیاں بھی ہیں آشیانوں میں

بسا اوقات آفت اور مصیبت عروج اور اقبال مندی کا پیش خیمہ ہوتی ہے (اجڑے بھرے گلزار کے ہاتھوں) اس فقرے میں اپنی عشقیہ زندگی کی طرف اشارہ ہے۔ جیسے فارسی کا یہ مصرع ظاہر کر رہا ہے "بلائے فرقتِ لیلیٰ و قربتِ لیلیٰ" اور میرا یہ شعر بھی:-

اس درجہ ربط اور پھر اتنی مغائرت تو میرے اور اپنے کبھی درمیاں بھی ہو

خارجی اور ظاہری مصائب کی بجلیوں کو غارت گرِ صد آشیاں ہونا مبارک، میں تو سب کچھ دے کے لٹا گیا ہوں، میرا بسا بسایا اُجڑنا ہو گیا، دوسرا شعر بھی انھیں تاثرات کے ماتحت ہے۔ بقول غالب:-

مری تعمیر میں مضمر تھی اک صورت خرابی کی ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

لیکن یہ اشعار زندگی کے متعلق آخری حکم نہیں ہیں، آخر کار مایوسی کی اس عارضی منزل سے گذر کر غالب نے بھی یہ کہتے ہوئے حوادثِ عالم سے ہم آہنگی کا اعلان کیا۔

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالب خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیئے

خدا اور ناخدا ضروری نہیں کہ دو ہوں،

(۳۵) ہم بہار سے خزاں لوٹتی تا بہ کے چمن آج خزاں کے بھیس میں آئی ہوئی بہار دیکھ

(۳۶) سنا ہے بادِ خزاں کے ہاتھوں چمن کا دونا نکھار ہو گا اثر سے اس شعلۂ نہاں کے کچھ اور رنگِ بہار ہو گا

اِن دونوں اشعار میں بھی تخریب اور انقلاب، آگ اور تلوار کے خلاقانہ اثرات (Creative Revolution) کی طرف اشارہ ہے۔ جرمن فلسفی نطشہ کا قول ہے کہ تمام ترقی درد کے لطیف اور روحانی بن جانے سے ہوتی ہے۔ All progress is the Spiritualization of pain.

(۳۷) منازلِ ارتقا کے دھوکے زمانہ پہلے بھی کھا چکا ہے کسی کو جس کی خبر نہیں ہے وہ انقلاب ایک بار ہو گا

(۳۸) نہ خونِ منصور ہے شفق میں نہ قتلِ سرمد کی داستاں ہے اب اس سے اوروں کی صبح ہو گی جو نعرۂ گیر و دار ہو گا

لوگ سہل پسندی کے دھوکے میں سمجھتے ہیں کہ اصلاح اور ارتقا کی سلامت روی تاریخ کے مقاصد اور تمام دیگر منازل طے کرنے کے لئے کافی ہے۔ لیکن تاریخ نازک اور اہم موقعوں پر جست کرتی ہے۔ دنیا کی کایا پلٹ جاتی ہے اور انسان خون میں نہاتا ہے۔ ارتقا کی انھیں غیر معمولی منازل کو انقلاب کہتے ہیں جب پرانا نظم و نسق کا تہس نہس ہو کر نئے نظام کے ساتھ نئی دنیا بنتی ہے

کہاں یہ نظمِ زندگی کہاں یہ دورِ آسماں کہ لاکھوں ایسی محفلیں وہ آنکھیں لے اڑیں کہیں

دوسرے شعر میں یہ کہا گیا ہے کہ مذہب اور شرع کے نام پر اب کشت و خون کا بازار گرم نہ ہوگا
ب اس سے اوروں کی صبح ہوگی جو نعرہ گیر ودار ہوگا یعنی حکمراں طبقہ اہل دولت اور سرمایہ دار
وئی باقی نہ رہیں گے

نہیں صدائے انا الحق ہیں اب کوئی خطرہ انا الجہاں کے ہیں نعرے پیام دار و رسن (فراق)

۳۹) خیال کو بے اثر نہ سمجھو عمل کی چنگاریاں ہیں اس میں کہ آج ظلمت سرائے دل میں جو نور ہے کل وہ نار ہوگا

دنیا کا وہ ادب جسے سُن سُن کر اور پڑھ پڑھ کر کروڑوں آدمی جھومتے رہے کوئی انقلاب پیدا
کر سکا بلکہ وہ صرف رنگِ نشاط اور کیفِ غم تک محدود رہا۔ لیکن تاریخ ادب میں صدیوں کے بعد کبھی
بھی وہ خیال موجزن ہوتا ہے جو بے اثر نہیں رہتا۔ اور جس میں عمل کی چنگاریاں چھپی ہوتی ہیں
روسو کا سماجی راضی نامہ (Social Contract) اور مارکس کا سرمایہ (Das Capital)
وہ کتابیں ہیں جن میں ایسی چنگاریاں دبی ہوئی ہیں۔ یہ خیالات پہلے ظلمت سرائے دل میں نور پیدا
کرتے اور پھر آگ لگاتے ہیں جس سے پرانی دنیا بھسم ہو جاتی ہے اور اس کی خاکستر سے نئی دنیا کی
تعمیر ہوتی ہے۔ اسی تخریبی اور تعمیری اثر کو مدنظر رکھتے ہوئے شاید گیٹے نے کہا تھا کہ "لفظ ایک عمل ہے"
(A word is an Ac

۴۰) سر بسر غرقِ نور ہو لیکن زندگی اکتسابِ نار بھی ہے

۴۱) نار کی منزلوں میں نور بھی ہے زیرِ دوزخ فرازِ طور بھی ہے

استغراق اور مراقبے، گیان دھیان، سرور، جمالیات اور فنون لطیفہ کے کیف و اثر سے
ممکن ہے آدمی کچھ دیر کے لئے اپنے کو غرق نور سمجھے، لیکن یہ فردوس خیالی بھرپور زندگی نہیں ہے کیونکہ
جہنم داخل ہوئے جنت نہیں ملتی اور زندگی زندگی نہیں ہوتی۔ سنسکرت کا ایک مقولہ ہے کہ حقیقی زندگی
انسانیت کا درد اور انسانی فلاح کے مسائل کے احساس سے حاصل ہوتی ہے۔ اس احساس کی
آزمائشوں سے گذرنا اکتساب نار ہے۔ اس کے بعد یعنی اجتماعی زندگی سے ہم آہنگی کے مرتبہ سے
اتر کر مجازی عشق کا مرتبہ ہے۔ دوسرے درجہ پر حقیقی زندگی عاشق کی ہوتی ہے۔ جہاں باوجود "غرق نور"
ہونے کے اکتسابِ نار بھی ضروری ہے۔ نشاط کے نور اور غم کی آنچ کو ایک کرنا زندگی ہے۔

دل کو فراق آنچ دے سوزِ نشاطِ عشق کی حاصلِ شعلۂ الم خاک ہے کیمیا نہیں

یعنی نشاط کی ٹھنڈک اور تراوت کو سوزِ نشاط سے بدل لو۔ اسی طرح دوسرے شعر میں
یہ کہا گیا ہے کہ حقیقی نور التہاب کی جلن کی ایک منزل ہے۔ قعر جہنم کی تہوں میں وہ بلندیاں ہیں جہاں

شمع سرِطور جگمگا رہی ہے۔ ان اشعار میں ٹھنڈک اور جلن، خوشی اور غم کی یکساں ماہیت کو جدلیت (Dialectics) کے اصولوں کے مطابق بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔ احساس ضدین کا اتحاد ہی اصل زندگی ہے۔ لیکن زہد و اتقا و سجدہ اور نماز ریاضت اور تپسیا، فقر و فاقہ سے اس اکتساب نار کو کوئی واسطہ نہیں۔ یہ چیزیں ہمیں اکثر اصلی زندگی سے الگ کر دیتی ہیں نفس کشی کا ڈھونگ اہل حکومت اور اہل دولت کے وظیفہ خوار مذہبی پیشواؤں نے اس لئے رچایا ہے کہ عوام جسمانی تکلیف کو روحانی لذت سمجھیں اور مادی تنزلی کو روحانی ترقی سمجھیں اور اس طرح بغاوت اور انقلاب کا خیال ان کے اندر پیدا ہی نہ ہو۔

(۴۱) نہ سمجھنے کی یہ باتیں ہیں نہ سمجھانے کی زندگی اچٹی ہوئی نیند ہے دیوانے کی

زندگی کی اور بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں، ایک یہ بھی سہی،

(۴۲) بچھڑے ہوئے اب اور ہی ڈھونڈھیں دلیل راہ اتنی بلند گردِ رہِ کارواں نہیں

(۴۳) بچھڑے ہوؤں کو دھیان ہزاروں طرح کے ہیں دل محوِ نالۂ جرسِ کارواں نہیں

پہلے شعر میں گردِ رہِ کارواں کے بجائے کسی اور چیز کو رہنما بنانے کی ترغیب ہے کیونکہ ہر دور کو رہنمائی کے لئے نئی سوجھ بوجھ کی ضرورت ہوتی ہے، نیا دور نیا روش چاہتا ہے، ہر دور کو ایک نئی خود اعتمادی کی ضرورت ہے۔ دوسرے شعر کے ساتھ حالی کا یہ شعر بھی ذہن میں رکھئے:۔

یارانِ تیز گام نے منزل کو جالیا ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

حالی نے بڑی اہم بات کہہ دی ہے، بڑھنے والے بڑھ جاتے ہیں اور لوگ دنگل کی آواز ہی میں محو رہ جاتے ہیں۔ مگر میرے شعر میں دوسری طرح کے بچھڑے ہوؤں کا ذکر ہے جو یکسوئی سے نغمۂ جرس سننے سے محروم ہیں۔ ان کی پریشان خیالی "ہزاروں طرح کے دھیان" انہیں سکتے کے عالم میں رکھتی ہے۔ میرے شعر میں ایک دوسری کیفیت کی طرف اشارہ ہے جس میں بعض افراد اور بعض گروہ محض مجہولیت کے شکار ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو نہ "چلتے ہیں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ" کو اپنا رویہ بناتے اور نہ "محوِ نالۂ جرس کارواں ہی رہتے ہیں بلکہ سفر کا دوسرا نظریہ رکھتے ہیں، اور گو بظاہر بچھڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں لیکن غالباً نئی منزل کی طرف بڑھنے کے مسائل طے کر رہے ہیں۔ ان کی پریشاں خیالی غرقِ خیالِ منزل ہونے کی وجہ سے ہے۔ اور وہ نئے سفر اور نئے کاروان کی تنظیم کی تیاری میں ہیں

(۴۴) ہر آوازِ جرس پر اک صدائے بازگشت آئی بہت ہے اس قدر بھی خیر یادِ رفتگاں ہونا

وقت نکل جاتا ہے بات رہ جاتی ہے۔ کارواں کالے کوسوں نکل گیا لیکن یہ سوچ کر کچھ سوز و ساز

ضرور پیدا ہو جاتا ہے کہ جہاں سے چلے تھے وہ مقام اور وہ لوگ چھوٹ گئے، اور ایسے چھوٹے کہ "ہر آوازِ جرس پر اک صدائے بازگشت آئی" پچھلی منزلوں کے اس سناٹے سے متاثر ہو کر صدائے بازگشت ہی کو یہ سمجھ لیا کہ کارواں کے آواز دینے پر پچھلی منزلیں آواز دیتی ہیں اتنی بھی یادِ رفتگاں بہت ہے۔ جان بوجھ کر یہ خود فریبی عجیب چیز ہے۔

(۴۵) نہ ذکرِ موجِ فنا کر کہ غم کے بیڑوں کو گدازِ سینۂ ساحل ڈبو چکا کب کا

کسی ٹریجیڈی کے لئے بیرونی اور خارجی سانحات ہی کافی نہیں اور نہ ڈوبنے کے لئے سمندر کی تہ میں جانے کی ضرورت ہے۔ وجود پر گہری نظر ڈالنے والوں کو ذرہ ذرہ ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ دکھ اور سکھ دونوں کے تصور سے سوز و گداز کا عالم پیدا ہو جاتا ہے اور دلوں پر ایک لطیف غم چھا جاتا ہے۔ چنانچہ میرا ایک دوسرا شعر ہے:۔

یہی ہوا کہ ترے غم زدوں پہ کچھ نہ ہوا جو آ کے لفظ و بیاں میں وہ واردات نہیں

مشہور لاطینی شاعر ورجل کے ایک مصرعے میں انسان کے متعلق ہر شے میں احساسِ سرشک The sense of tears in things human. کا ذکر آیا ہے۔ انگریزی شاعر ورڈسورتھ کہتا ہے کہ ہر پھول ان خیالات کا حامل ہے جن کی گہرائیوں تک آنسوؤں کی بھی رسائی نہیں ہے مانڑلنک نے بھی ٹریجیڈی کا یہی نظریہ پیش کیا ہے۔ کشتیاں ساحل سے لگی ہوئی سلامت کھڑی ہیں لیکن سینۂ ساحل کا گداز انھیں کب کا ڈبو چکا ہے، ان کی ظاہری سلامتی پر مت جاؤ لیکن غم کا یہ احساس مجہولیت آموز نہیں بلکہ حیات آور ہے اس تصور سے نئی زندگی ملتی ہے جس سے ہم آہنگ ہو کر ہمیں وہ وسعت اور گہرائی ملتی ہے۔ اور ان محرکات کا احساس ہوتا ہے جو سطحی رجائیت اور سطحی واقعیت ہمیں کبھی نہیں دے سکتی۔ مفکرانہ غم قنوطیت نہیں بلکہ یہ شعور کی سنجیدگی ہے۔

(۴۶) مستی ہو یا خمار ہو کرمے پرستیاں بے سود رفعتیں ہیں نہ بیکار پستیاں

مستی رفعت اور خمار اُتار یعنی پستی ہے۔ انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کی زندگی کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ان کا وہ توازن ٹوٹ جائے جو جمود کی طرح ہے "کرمے پرستیاں" تاکہ اس جمود کی بنیادیں ہل جائیں، نئی بلندیوں اور نئی پستیوں کا احساس ہو۔ زندگی میں انقلاب آئے۔ پھر اس چڑھاؤ اور اُتار کو سمیٹتی ہوئی زندگی آبِ رواں کی طرح ایک نئی سطح حاصل کر لے گی۔

(۴۷) شاید یہی حیات کی منزل کا راز ہے تنہا چلو، جہان کو لیکن لئے چلو

نہ ترکِ دنیا سے حیات کی منزلیں طے ہوتی ہیں نہ بھیڑیا دھساں چال سے۔ پیشوایانِ انقلاب

اپنے تصورات کی خلوتوں میں اُس نئی روش کا پتہ چلا لیتے ہیں، اور اس تنہا روی کا راز دریافت کر لیتے ہیں جب سے دنیا منزل مقصود کی طرف گام زن ہو جاتی ہے۔ سائبیریا کے سنسان خطہ میں نظر بندرہ کر لینین نے انقلاب کا پروگرام مرتب کیا تھا۔ مارکس نے جلا وطن ہو کر برٹش میوزیم میں تنہا اس نئے انقلاب کا فلسفہ مرتب کیا تھا جس کی آواز پر اس وقت دنیا گامزن نظر آتی ہے، حقیقی رہبر سچے ہادی سے زیادہ کوئی شخص تنہا نہیں ہوتا ہے اور نہ کسی اور کے اتنے ساتھی ہوتے ہیں۔ قدیم تاریخ میں بھی اس کی مثالیں ملیں گی۔ بہر حال "تنہا چلو جہان کو لیکن لئے چلو"

(۴۸) اے ساکنانِ دہر یہ کیا اضطراب ہے — اتنا کہاں خراب جہانِ خراب ہے

(۴۹) کیسی فنا کہاں کی بقا یہ کوئی بتائے — دنیا میں زندگی بھی کہیں دستیاب ہے

پہلے شعر میں "اتنا کہاں خراب" کا ٹکڑا قابل توجہ ہے۔ زندگی کے حادثات اور سانحات اور آزمائشوں کا وجدانی تصور کیا جائے تو ایک تشفی آمیز غم کا احساس ہوگا، ایک درگذر کا جذبہ پیدا ہو جائے گا۔ شدتِ احساس میں ایک خاص نرمی پیدا ہو جائے گی۔ اور زندگی میں قبولیت کی صلاحیت آ جائے گی۔ پھر اس کے بعد خارجی معنوں میں بھی، دنیا مبدل ہو جائیگی پہلے جہانِ خراب پر ایمان تو لائیے اس سے ہم آہنگ ہو جیئے، کچھ سنبھلیئے، پھر دنیا کی کایا پلٹ کیجئے۔ انقلاب کا گہوارہ قنوطیت نہیں بلکہ حساس رجائیت ہے۔ دوسرے شعر میں فنا اور بقا کی روایتی تقسیم سے قطع نظر کر کے اہل دنیا کو زندگی تلاش کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

(۵۰) کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا — کچھ فضا کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کرو

موجودہ نظام نے دنیا والوں کی زندگی کو ایک قیدِ قفس بنا دیا ہے۔ لیکن اس قفس کی تیلیوں سے کچھ نور سا چھن رہا ہے۔ کچھ زندگی کے وسیع امکانات کا پتہ مل رہا ہے۔ اے اہل قفس "کچھ فضا کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کرو" یعنی اس انقلاب کی باتیں کرو۔ جب زندگی آزاد فضا میں بسر ہو گی۔ شعر میں جذبات نگاری اور درسِ عمل دونوں موجود ہیں۔ عمل کی جڑیں بھی نفسیات ہی میں ہیں۔

التماس

کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اپنے حلقہ احباب میں زمانہ کی توسیع اشاعت کی کوشش فرمائیں؟۔ اگر آپ زمانہ کی ادبی خدمت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو اپنے علم دوست احباب سے اسکی خریداری کی سفارش کرنے میں کیوں پس و پیش کرتے ہیں۔

منیجر زمانہ

تضادِ فطرت

(نتیجۂ فکر حضرت فطرت واسطی)

رقص میں ہے لیلیٰ شب بال بکھرائے ہوئے
بین کی لے پر ہو جیسے ناگ بل کھائے ہوئے

ہے زمیں سے آسماں تک بادشاہی رات کی
اک مکمل سحر ہے، کافر نگاہی رات کی

اُف یہ تاریکی کہ نظارہ بھی ہے زیر و زبر
کھوئے کھوئے ہیں مناظر، بھولی بھٹکی ہے نظر

ساقیِ شب نے پلائی ہے عجب مے وقت کو
زیست دم سادھے ہوئے ہے، چپ لگی ہے وقت کو

رات کا یہ رنگ اور اس پر ہوائے تیز تیز
اک عذابِ مستقل میں اک مسلسل رستخیز

کب سے سرگرداں ہوں میں بھی جستجوئے راہ میں
کوئی شنوائی نہیں ہے رات کی درگاہ میں

چلتے چلتے دفعتاً پیدا ہوا ہے انقلاب
ہو رہے ہیں سامنے جلووں پہ جلوے بے نقاب

مسکراتی ہے فضا کیچل بدلتی ہے زمیں
میں بھی اب دنیا میں ہوں مجھکو یقیں ہوتا نہیں

میں کنارِ راپتی ساکت کھڑا ہوں رات میں
گا رہی ہیں کوئلیں کچھ دور پر باغات میں

سامنے پیپل ہے، پیپل پر ہے جل پریوں کا تخت
جگنوؤں کا تاج پہنے مسکراتا ہے درخت

ٹہنیوں پر ناچ رہے ہیں شادیانے رات کے
مست ہو کر گا رہے ہیں دیوتا ظلمات کے

بڑھتی ہی جاتی ہے باہم گرمیِ دورِ نشاط
پتے پتے ٹہنی ٹہنی میں ہے جوشِ اختلاط

مطربانِ خوشنوا ہیں ساز بھی ہے چنگ بھی
تالیاں بھی بج رہی ہیں، رقص بھی ہے رنگ بھی

ایسے طوفاں اور ایسی شب میں یہ جشنِ بہار
حیرتِ نظارہ ہے، نیرنگِ زارِ شاخسار

یہ طلسمِ شب اگر ہے ہوش اُڑانے کے لئے
میں بھی اک عنوانِ حیرت ہوں زمانے کیلئے

میرا ظاہر شادماں ہے، میرا باطن دردمند
میں طرب گاہوں کا شیدا، میری فطرت غم پسند

لب پہ ہے موجِ تبسم، دل غموں سے چور ہے
چشمِ نم آلودہ ہے۔ لیکن نظر مسرور ہے

عمر بھر میں نے چھپائی بے گناہی عشق کی
دفن ہے پھر بھی مرے دل میں تباہی عشق کی

روح میں ہے کفرِ غم لب پر ہے انجیلِ شباب[1]
میری ہستی کا بھی عنواں ہے تضاد و انقلاب

---

[1] انجیلِ شباب میرا دوسرا مجموعۂ کلام ہے جو آجکل زیرِ ترتیب ہے۔

مسولینی کی چند باتیں

(از ایمل۔لڈوک ترجمہ از حضرت سہیل عظیم آبادی)

ایمل لڈوک دنیا کا سب سے بڑا سوانح نگار سمجھا جاتا ہے، کیونکہ اُس نے سوانح نگاری کو فن کی حیثیت سے بڑھا کر سائینس کے درجے تک پہونچا دیا ہے، جس کی بدولت انسان کی کمزوریوں اور خوبیوں دونوں کا بخوبی علم ہو جاتا ہے۔ اس نامور مصنف نے ۱۹۳۲ء میں مسولینی سے گفتگو" کے نام سے ایک کتاب لکھی جو تمام یورپ میں بیحد مشہور ہو چکی ہے۔ چھ سال بعد اس نے یہ مضمون رسالہ" لیونگ ایج" بابت فروری ۱۹۳۹ء میں لکھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب مسولینی کی ان کے مداح اور سوانح نگار کی نظر میں کیا حیثیت ہے۔

گو یہ مضمون پُرانا ہو چکا ہے پھر بھی اپنی اہمیت کے لحاظ سے اتنا ہی قابل قدر ہے جتنا اشاعت کے وقت تھا۔ اس میں اس نے یہ لکھا ہے کہ چھ سال سے میں اس کتاب کے سلسلے میں اپنے جمہوریت پسند احباب کے طعنے سُن رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی کٹر فسطائیوں نے یہ یقین دلایا ہے کہ وہ اس کتاب کے علاوہ میری کوئی اور کتاب نہیں پڑھیں گے۔ اس دورویہ دشمنی کی وجہ ہے کہ اس کتاب میں ایک ناتواں جمہوریت پسند اور ایک طاقتور ڈکٹیٹر کی گفتگو مفکرانہ انداز میں درج کی گئی ہے۔ مسولینی نے جان بوجھکر ایک سیاسی مخالف کو اس کام کے لئے منتخب کیا۔ چنانچہ اس کی تحریک بھی اُسی کی طرف سے ہوئی۔ ۱۹۲۹ء میں ہم دونوں کی چند بار مختصر اً گفتگو ہوئی تھی۔ اس کے بعد اُسی نے یہ خواہش ظاہر کی کہ ان مکالموں کو باضابطہ کتابی شکل دیدی جائے۔ ان مکالموں میں مسولینی نے بہت سی سچی باتیں مجھ پر ظاہر کردیں جن کا ظاہر ہونا مناسب نہ تھا۔ اسی لئے کتاب کے شائع ہوتے ہی اطالوی پریس مجھ پر برابر حملے کر رہا ہے۔

ان مکالموں کے لئے میں نے ہفتوں تیاری کی، ایسی تیاری جیسے شطرنج کی اہم بازی کے لئے کی جاتی ہے۔ مسولینی صرف یہ جانتا تھا کہ میں اُس سے چارسو سوالات کروں گا۔ چنانچہ اس نے بہت سے سوالات کے بہت ہی شاندار جوابات دیئے اور میں نے بھی اس کی دلچسپی بڑھانے کے لئے اطالوی زبان میں گفتگو شروع کی۔ لیکن بعد میں اپنی مادری زبان جرمن میں سوال کرنے لگا۔ جب

اپریل ۱۹۳۲ء میں یہ کام ختم ہو گیا تو مسولینی نے پوچھا کہ کتاب کا مسودہ کب تک تیار ہو جائے گا
میں جانتا تھا کہ ڈکٹیٹروں کو ہر کام میں تیزی اور سرگرمی پسند ہوتی ہے، اس لئے میں نے اُس سے
اس کام کو دو ہفتہ میں ختم کر دینے کا وعدہ کر دیا۔

میں نے اپنی بات پوری کر دکھائی، مجھے ڈر تھا کہ وہ بہت زیادہ تصحیح کرے گا لیکن میرا
خیال غلط نکلا، اُس نے ۲۳۰ صفحوں میں صرف اٹھارہ لفظ بدلے اور تقریباً کوئی ردّوبدل نہ کیا۔

اِس کے بعد کتاب کا ترجمہ ہونے لگا تاکہ اس کا خاص پبلشر اسے شائع کر سکے، مگر ترجمہ
مسولینی کو پسند نہ آیا، اُس نے شکایتاً کہا کہ اصل جرمن میں اُس کا مفہوم زیادہ صاف تھا اس لئے
دوسرا ترجمہ ہونا چاہیئے، چنانچہ دوسرا ترجمہ کیا گیا جس کو اُس نے منظور کر لیا، اور فوراً ہی اس کو
پریس میں بھیجد یا گیا۔

جب مسولینی نے پروف کے چند اوراق اپنے خاص مقربین کو دکھائے تو وہ حد درجہ بدحواس
ہوئے، کیونکہ مسولینی نے سچائی سے اپنے جذبات اور خیالات ظاہر کر دیئے تھے۔ بیان ہے کہ
اُس کے ایک بہت ہی عزیز دوست نے اُس سے کہا

> میں تمہاری حفاظت کے لئے خوشی سے اپنی جان قربان کرنے کو تیار ہوں لیکن تم دنیا سے کہہ رہے ہو
> کہ تمہارا کوئی دوست ہی نہیں"

پاپائی حکومت نے اُس کے پاس پھر اُس پادری کو بھیجا جو اُس کے پاس یہ سمجھانے آیا کرتا تھا
اُسے وجودِ خداوندی اور مسئلۂ قضا و قدر کے متعلق علانیہ اپنی رائے کا اظہار نہ کرنا چاہیئے۔

آخر مسولینی اس مسودہ کے سامنے جھک گیا، اُس نے اپنے پبلشر سے کہہ دیا کہ یہ کتاب اپنی اصلی
صورت میں شائع نہیں ہو سکتی، جس پر پبلشر نے جواب دیا کہ بیس ہزار جلدیں چھپ چکی ہیں اور ان کی جلدبندی
بھی ہو چکی ہے اور چونکہ یہ کام مسولینی کی مرضی کے مطابق ہوا ہے اس لئے اب اس کی اشاعت روکنا
بہت مشکل ہو گا بلکہ اس کوشش میں یہ خرابی ہو گی کہ بہت سی غلط سلط باتیں مشہور ہو جائیں گی۔
اس پر مسولینی نے بھی محسوس کیا کہ واقعی ایسا ہی ہو گا اس لئے اُس نے کتاب کی اشاعت کی اجازت
تو دی لیکن پبلشر سے یہ بھی کہہ دیا کہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن موجودہ حالت میں نہ چھاپے۔ اس کے
ساتھ ہی اس نے حکم دیا کہ تمام اخبارات میں کتاب کے اجزا اس کی اشاعت سے پہلے ہی شائع کر دیئے
جائیں۔ چنانچہ یہ اجزا جولائی ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء کے درمیان تمام اطالوی اخبارات میں بڑی بڑی تمہیدوں
کے ساتھ شائع ہوتے رہے۔ خود میلان میں مسولینی کے اخبار "پوپولو ڈی اٹالیا" نے اس کتاب کو "وقت"

کی چیز اور عالمگیر دلچسپی کی چیز قرار دیتے ہوئے خدا کے متعلق اُن حصوں کو دوبارہ شائع کیا جو پاپائی حکومت کو حد درجہ شاق گزرا۔

اِن تمام واقعات سے مجھکو ڈکٹیٹر کی طاقت کا پورا ثبوت مل گیا۔

دوسری اشاعت کی اصل جس پر خود مسولینی نے نظرثانی کی تھی میرے پاس موجود ہے، اس میں بہت کم تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ صرف پانچ صفحوں کے قریب جن میں مندرجہ بالا مباحث کی طرف اشارہ تھا قلمزد کئے گئے ہیں۔ البتہ نسلی امتیاز اور یہودیوں کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں بدلا گیا تھا۔ لیکن مسولینی اُس وقت تک پوپ کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا تھا۔

دوسری اشاعت کے متعلق سارے اٹلی کا خیال تھا کہ کتاب کی دلچسپیاں ضائع ہو گئیں اور پہلی اشاعت کا مطالبہ بڑھتا جارہا تھا۔ آجکل پہلی ایڈیشن کی قیمت پانچسو لیرا فی جلد سمجھنا چاہیئے۔ روم کے مطالبہ کے مطابق میں نے گیارہ غیر ملکی ترجموں سے بھی وہ حصے نکال دیئے جن کو مسولینی نے قلمزد کر دیا تھا۔ لیکن جرمن اشاعت میں ایسا نہیں ہو سکا، کیونکہ جرمن ایڈیشن کی بھی پچیس ہزار جلدیں پہلے ہی تیار ہو چکی تھیں۔ اس وقت بھی وہ حصے تقریباً پچاس ہزار اطالوی اور جرمن زبان کی جلدوں میں موجود ہیں۔

(۲)

پہلا ٹکڑا جو مسولینی نے قلمزد کیا وفاداری کے متعلق تھا۔ نپولین کے متعلق ایک ہی گفتگو کے درمیان مسولینی نے کہا "دوسری عظیم الشان بات جو میں نے نپولین سے سیکھی اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب میرے دماغ سے لوگوں کی وفاداری کا فریب پورے طور پر نکل گیا ہے، اس بارے میں میں اس سے بالکل متفق ہوں"۔ یہ ٹکڑا قلمزد کر دیا گیا۔

دوسرا حصہ جو اس نے بدلا وہ ۱۹۲۲ء میں مسولینی کے روم پر دھاوا اور بادشاہ کی مدافعانہ جدوجہد کے متعلق تھا۔ یہ سوال بہت پرانا ہو چکا ہے کہ کیا واقعی شاہ اٹلی اپنے اختیارات سے رضاکارانہ طور پر دست بردار ہو گیا تھا؟ جب میں نے اس بارے میں مسولینی سے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ بادشاہ نے ایک حکمنامہ کے ذریعہ روم کو پہلے ہی سے مارشل لا کے سپرد کر دیا تھا۔

دوسری اشاعت میں اس نے اس بیان کو یوں بدلا:۔

"اُن لوگوں نے یہی فیصلہ کیا تھا، لیکن بادشاہ نے دستخط کرنے سے دوبارا انکار کیا تھا۔"

دوسری پانچ قلمزد باتیں خدا، مذہب، اور کلیسا سے متعلق تھیں۔ اُس نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ

جادو ٹونے میں کس طرح اس کا عقیدہ پختہ ہوتا گیا۔ مگر بعد میں یہ بھی قلم زد کر دیا گیا۔

کسی دوسرے مقام پر عیسائیت اور کلیسا کی ترقی پر اس نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا:

"سینٹ پیٹر بہرحال ایک قسم کا پروپگنڈسٹ تھا۔ دوسری طرف سینٹ پال روم آیا، اور عیسائیت کا اصل بانی اور ناظم وہی تھا۔ یہ بہت ہی حیرت انگیز تھا۔ یہودیت سے ایک نمایاں انحراف اور تبدیلی تھی ۷۰-۶۹ء تک کل یہودیت یروشلم، اسکندریہ، سالونیکا وغیرہ میں مرکوز تھی۔ اس کے بعد اچانک علیحدگی پیدا ہوئی۔ یہودی آپس میں بٹ گئے، اور نیا مذہب ارمن کا فروں تک پہونچا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ اہم واقعہ کس طرح رونما ہوا۔ اس سے کچھ قبل پہلے یہودی مسیح کو تسلیم ہی نہیں کرتے تھے"

میں نے ایک بار اس مسئلہ پر سوال کیا، لیکن اُس نے جواب نہیں دیا۔ یہ واقعی حیرت انگیز ہے کہ کس طرح ایک کارنامہ پہلے روایت پھر بدعت کی شکل اختیار کر لیتا ہے

"اگر عیسائیت روم کی شہنشاہیت کے دامن میں پناہ نہ لیتی تو یہودیت کا ایک جزو ہوتی۔

یہ ٹکڑا بھی قلمزد کر دیا گیا۔

ایک دوسرے مسئلے پر باتیں کرتے ہوئے میں نے دریافت کیا تھا:

"فسطائی حکومت میں ایسی عورتوں کی کیا حیثیت ہے جن کی شادیاں نہیں ہوئیں مگر وہ بچوں کی مائیں ہیں؟"

اس کا جواب اُس نے دیا:-

یورپ کی حکومتوں میں ایسی ماؤں کی سب سے زیادہ نگرانی ہم لوگ کرتے ہیں، ہم لوگ اس کی زیادہ پروا نہیں کرتے کہ بچے کی ماں قانونی طور پر شادی شدہ تھی یا بچے کے باپ سے اس کے صرف تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ اس مسئلے میں ہم لوگ کلیسا کے ہم خیال نہیں۔ کلیساؤں کا اپنا فلسفہ، اپنی تعلیم اور اپنی دنیا ہے"

یہ ٹکڑا بھی کاٹ دیا گیا۔

میں نے اس کے ایک ناول کا تذکرہ کیا جو اس نے جوانی میں کلیسا کے خلاف لکھا تھا۔ اُس نے اس بارے میں کہا تھا:-

"اس وقت کے پادری واقعی برائیوں سے بھرے تھے" یہ جملہ بھی قلم زد کر دیا گیا۔

سب سے طویل اور اہم حصہ جو کتاب سے خارج کر دیا گیا، اور جو در اصل کتاب کا لب لباب تھا وہ مسئلہ قضا و قدر سے متعلق تھا۔ میرے سوال کے جواب میں اُس نے کہا:-

"اپنے اوپر عقیدہ رکھنا البتہ کچھ معنی رکھتا ہے"

اُس نے جلدی سے کہا اور مُسکرایا، اس کے بعد وہ لیمپ کی روشنی میں جُھک کر بولا:۔

"میں تمھیں اپنے تجربات بتاتا ہوں۔ جوانی میں کسی چیز پر میرا عقیدہ نہ تھا۔ اپنی ماں کی زندگی کے لئے میں نے بے فائدہ خدا سے دعائیں مانگیں، اُس کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ مرگئی۔ اس کے علاوہ بہت دنوں تک مجھ پر مذہبی خیالات کا اثر رہا، یہ شاید اُن عیسائی مدرسوں کا اثر تھا جہاں میں نے کچھ دنوں تعلیم پائی تھی۔ لیکن میں کم سے کم دنیا کی طرح اس امکان سے انحراف کرتا ہوں کہ ــ ہوسکتا ہے کہ ہزاروں سال کے ہیر پھیر میں کسی وقت کوئی مافوق الفطرت مظاہرے ہوئے ہوں ــــ دوسرے لفظوں میں فطرت خود مقدس ہے، میں نے خود اسے نہیں دیکھا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہزاروں سال کے ہیر پھیر میں پھر ایسے مظاہرے رونما ہوں لیکن وہ مسئلہ زمین کی کشش یا موت کی طرح سائینس سے متعلق ہے۔ اب البتہ میرا عقیدہ ہوگیا ہے کہ عالم میں کوئی عظیم اور مقدس طاقت موجود ہے۔"

"عیسائیت کی طاقت؟" میں نے سوال کیا،

ایک مقدس اور برتر طاقت ہے" اُس نے جواب دیا، اس انداز میں یہ جواب تھا کہ میرا سوال گویا ہی سارہ گیا۔" انسان خدا کی عبادت مختلف صورتوں میں کرسکتا ہے، اور ہر شخص کو اُس کے رُجحانات کے مطابق آزاد چھوڑ دینا چاہیئے۔"

اِس کے بعد میں نے سوال کیا:۔

"انسان خود کوئی کام کیوں کرے جب اُس کی قسمت اُسے پہلے ہی سے مقرر شدہ راستوں پر لیجاتی ہے"
مگر مسولینی کے نزدیک یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے، چنانچہ اُس نے کہا:۔

" انسان کو چاہیئے کہ قضا و قدر کا مقابلہ کرے، اور یہ مقابلہ اپنی قوت ارادی اور عمل کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ جد و جہد دلچسپ ہوتی ہے۔ ارادہ کو چاہیئے کہ وہ ایسی بساط تیار کرے جس پر قسمت کا پانسہ سیدھا پڑے۔"

مَیں نے اس سے کہا کہ میں نے حال ہی میں کسی کی لائبریری میں ایک مقولہ دیکھا ہے جس کے معنی (قسمت کی حدود سے باہر ہیں۔ اُس نے دریافت کیا، کیا اس آدمی نے کبھی بھی قسمت سے مقابلہ کیا ہے۔ میں نے اُسے اس آدمی کا نام بتایا، "ہوا باز بالبو"

"یہ میرا مقولہ نہیں" مسولینی نے کہا: "کوئی آدمی قسمت کو دوبارہ دعوتِ مقابلہ نہیں دے سکتا، ہر آدمی کی موت اس کے کردار کے مطابق ہوتی ہے۔"

یہ جملے جن میں سے اکثر اس کے اخبار میں کتاب کی اشاعت سے پہلے ہی شائع ہو چکے تھے اور جن کو وہ بہت اہمیت دیتا تھا یا پائی حکومت کے اختلاف کے خیال سے کتاب سے نکال دئیے گئے۔ اس کے بعد سے مسولینی کی آزادیِ خیال کو جھٹکے لگنے شروع ہوئے۔ چنانچہ جب ۱۹۳۶ء میں دریائے نیل کے متعلق اپنی کتاب لکھ رہا تھا تو دریائے نیل کے متعلق میری تقریریں تمام اطالوی اخبارات اور ریڈیو میں خوب شائع ہوئیں، اور ایتھوپیا کی حکومت پر میں نے جو اعتراضات کئے تھے اُن سے اِن اخباروں نے خوب فائدہ اُٹھایا گیا۔

اِسی درمیان میں جنگ چھڑ گئی۔ چنانچہ یکایک حالات بدل گئے، نام نہاد محور کے اثرات نمودار ہوئے۔ مسولینی نے کچھ لوہے اور کوئلے کے لئے نظریں دوڑانی شروع کیں۔ اس نے اکثر کتابوں کو ضبط کرنا ضروری سمجھا کیونکہ وہ جرمنی میں ممنوع تھیں۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ میری کتاب (دریائے نیل) کا داخلہ بھی اٹلی میں ممنوع قرار دیا گیا ہے، تو میں نے مسولینی کو ایک خط لکھکر دریافت کیا کہ کیا واقعی میری تصانیف اٹلی میں ممنوع قرار دی گئی ہیں! خصوصاً جبکہ اُن میں سے اکثر کے متعلق خود مسولینی سے گفتگو ہو چکی تھی۔

۱۴۔ جولائی کو اُس نے مجھے کہلا بھیجا کہ کتاب پر سے پابندی اُٹھالی گئی۔ میرے پبلشر نے بھی اس کی تصدیق کی، اور اس کی چھپائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں طباعت کا کام حکومت کے دباؤ سے یکایک روک دیا گیا۔

اِن واقعات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ڈکٹیٹروں کو بھی کیسی کیسی مجبوریاں پیش آتی ہیں، اور انہیں بھی اکثر اپنی مرضی کے خلاف کام کرنا پڑتا ہے۔ پہلی اور دوسری بار پادریوں کا دباؤ پڑا، تیسری بار نازیوں کے دباؤ سے مسولینی کو اپنی رائے بدلنی پڑی۔

اور آج تو مسولینی کو نسلی امتیاز کا اُصول بھی ماننا پڑ رہا ہے جس کا وہ دل سے مخالف ہے۔ اِس مسئلے پر مجھ سے گفتگو ہو چکی ہے۔ آج اُس کے جرمن حلیف اُسے یہودیوں کے خلاف کارروائی کرنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ میرے ساتھ گفتگو میں اور اس کے بعد کئی مرتبہ وہ مارکس، لسالے، اور راتھینو کی عظمت کا اعتراف کر چکا ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ پچھلی چوتھائی صدی میں یہ لوگ یورپ کے بہترین دماغ تھے۔ اُس نے اطالوی یہودیوں کی خدمات کا بھی اعتراف کیا ہے۔ اور ہماری آخری گفتگو میں جب میں نے پھر نسل کی بحث چھیڑی اور اُس سے لاطینی قوم کے متعلق سوال کیا تو اُس نے میری بات کاٹ کر کہا:۔

جیسا میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ نسلی طور پر کسی قوم میں کوئی خصوصیت نہیں، یہ دماغی وہم ہے اور

واقعی طور پر اس کا کوئی وجود نہیں۔"

"تو پھر کوئی شخص اپنے کو کسی قوم سے بھی منسلک کر سکتا ہے" میں نے پوچھا۔ اس نے کہا کہ ضرور ایسا ہو سکتا ہے۔"

اس گفتگو سے مسولینی دنیا کا ایک مفکر ثابت ہوتا ہے، اور اُس کے دشمنوں کو بھی اس کا اعتراف ہے اس کے بعد مسولینی کو بارہا اپنی رائیں تبدیل کرنا پڑیں لیکن میں نے اس کی شخصیت کے متعلق جو رائے قائم کی تھی وہ کسی طرح بھی نہیں بدلی ہے۔ میں اس پر آمادہ نہیں کہ کسی سیاست داں کا اندازہ اس سے لگاؤں کہ میرے اور میری قوم کے متعلق اس کا کیا خیال ہے۔ ابھی حال ہی میں ایک موقعہ پر میں نے مسولینی کو ہٹلر سے برتر پایا۔ تاہم اس کے متعلق میرے سارے خیالات صحیح نہیں نکلے۔ جب ہم دونوں کی گفتگو جاری تھی تو اُس نے صرف اٹھارہ لفظ بدلے، لیکن میں صرف ایک لفظ بدلنا چاہتا ہوں۔ اس وقت میں نے اسے اٹلی کا مطلق العنان کہا تھا، اور یہی میرا خیال تھا۔ یہ 'صفت' میں نے غلط لکھ دی تھی۔

اب میں خدا حافظ کہتا ہوں! جو گھنٹے میں نے مسولینی کی ملاقات میں گزارے۔ وہ میرے بہت سے سیاسی احباب کی صحبت سے زیادہ دلچسپ تھے۔ ایک پُرجوش مخالف کی گفتگو سے زیادہ دلچسپ کوئی دوسری چیز نہیں۔

پنڈت رامیشور پرشاد شوکل کی ہندی شاعری

ہندی شاعر پنڈت رامیشور پرشاد شوکل "آنچل" بی۔ اے کے دو مجموعے "مدھولیکا" اور "اپراجیتا" ساہتیہ مندر الہ آباد اور چھاتر ہتکاری پستک مالا دارا گنج الہ آباد سے شائع ہوئے ہیں۔ آپکی شاعری کا زیادہ ترنج المیہ ہے اور سارا کلام سنسکرت الفاظ کی کثرت اور تخئیل کے جذباتی جولانیوں سے مسلسل ثقیل ہو کر رمز نگاری کی حد تک پہونچ گیا ہے۔ آپ نے شمع۔ پروانہ۔ نوہ۔ تپش۔ بہار۔ خزاں۔ چمن۔ قفس وغیرہ اُردو الفاظ بھی جا بجا استعمال کئے ہیں پھر بھی آپکی زبان آسان نہیں بن سکی۔ البتہ بعض بعض نظمیں دلکش و مؤثر ہیں۔ مدھولیکا میں میرے بھولے ساقی کے نام سے ایک پسندیدہ نظم ہے۔ مجموعی حیثیت سے آپ کے کلام میں حسرت و یاس درد و غم اور بیکسی و بیچارگی کے ساتھ ساتھ بیخودی اور وصال حقیقی کی تشنگی مختلف صورتوں میں نمایاں ہے۔

اس مجموعہ کا دیباچہ ہندی کے قابل و نامور ادیب پنڈت نند دلارے باجپئی نے لکھا ہے۔ آنچل صاحب نے اپنی ایک نظم میں خدا کو بھی آڑے ہاتھوں لیا ہے جس پر باجپئی جی لکھتے ہیں:۔

"حمد کیلئے ایشور کے بارہا برزاں اور کوئی چیز نہیں ہے خصوصاً ہندوستان میں جہاں کوئی منظم چرچ نہیں ہے، مگر اس سے صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہاں کس طرح مغرب کی اندھا دھند تقلید ہو رہی ہے۔ شاعروں کے ذمہ قومی تعمیر کا ذمہ دارانہ کام ہے اس سلطان کا اس اہم فرض سے بچنے کی کوشش کرنا دور اندیشی نہیں ہے۔"

یہ رسالہ کہ اُردو شعراء کے توجہ کا بلکہ محتاج و مستحق ہے۔ ہمکو امید ہے کہ آنچل صاحب جو ابھی نو عمر ہیں آئندہ اپنے شاعرانہ جذبات کیلئے اس سے زیادہ صاف اور سلیس زبان استعمال کرینگے کیونکہ اگر کسی کلام کی زبان و بندش علم فہم نہو تو شاعر کی دماغی کوشش رائیگاں جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔

(س۔ ۵)

تتلی

(نتیجۂ فکر جناب رہبر بی اے)

ایک ننھی سی جان ہے تیری
دل میں رکھ لوں، ہے آرزو میری

ہلکا پھلکا نظامِ ہستی ہے
دو پروں میں بھی روح بستی ہے

تجھ سے افزوں ہے رونقِ گلشن
بڑھ گیا ہے بہار کا جوبن

جب بھی دیکھو ادھر اُدھر پھرتی
پھڑ پھڑاتی ہوئی سی، خوش دل سی

پھول تیرے لئے ہی کھلتے ہیں
تجھ سے کیا مسکرا کے ملتے ہیں

تیری ہستی عجیب ہستی ہے
کون دنیا میں تیری بستی ہے؟

پھول کر آ گئی کہیں سے تُو
غیر مانوس ہے زمیں سے تُو

کیا ستارہ پری کے دامن کا
کھیل میں ٹوٹ کر زمیں پہ گرا؟

اِک کرن نے تجھے پڑا دیکھا
شوقِ جلوہ گری نے اُکسایا

آ کے تجھ میں سما گئی وہ کرن
اور رنگیں بنا گئی وہ کرن

یا ہے ناہید کا کوئی نغمہ؟
اُس کے بربط پہ جو ادا نہ ہوا

راگ بننا جسے نہیں بھایا
رقص کرتا یہاں چلا آیا

ہاں، ستاروں کی ہے تو رقاصہ
شوق رکھتی ہے لالہ زاروں کا

کہکشاں میں مقام ہے تیرا
اُڑتے رہنا ہی کام ہے تیرا

روشنی پی کے زندہ رہتی ہے
راز کوئی گلوں سے کہتی ہے

بس، انھیں گدگدانے آتی ہے
پھول جاتے ہیں تو بھی جاتی ہے

جب تُو رنگیں پروں سے ہلتی ہے
میرے دل کی کلی بھی کھلتی ہے

قاش قوسِ قزح کی ہے گویا
جس کا شبنم نے آ کے منہ دھویا

خندۂ گل سے زندگی پائی
تیری ترکیبِ جلوہ آرائی

رقص کرتی ہے رقص کرتی رہ!
اِس جہاں کو خوشی سے بھرتی رہ!

پھول محل

(شیخ تصدق حسین لکھنوی بی۔اے ایل ایل۔بی)

یہ بینی رام سپاری فروش کی لڑکی تھی جو قوم کا بقال اور دوہرے ڈیل کا گورا چٹا خوشرو آدمی تھا۔ گول دروازہ سے متصل محلہ چکلہ میں رہتا تھا اور داد و ستد کا پیشہ بھی کرتا تھا۔

جب کہاروں کا جمعدار بھوانی مہرا (راجہ مہرا) اس جہان سے رخصت ہوا تو اس کے چھ سات لاکھ روپے بے کد و کاوش بینی رام کے ہاتھ لگے۔ اس روپیہ کی بدولت اس نے عاملوں سے پوتہ داری کے ذریعہ زر کثیر پیدا کیا۔ اُسی زمانہ میں وہ عاشورن نام ایک شاہد بازاری کے دام الفت میں گرفتار ہو گیا۔ کچھ دنوں تو یونہی تعلقات رہے پھر اسکو گھر بٹھا کر پابند کر لیا۔ اس کے بطن سے ایک لڑکا احمد علی اور ایک لڑکی پیدا ہوئی جو حسن و جمال میں آفتِ روزگار تھی۔ بقول شاعر:۔

حسنِ ملیح گورا بدن آمدِ شباب متوالی آنکھیں جیسے کہ پُر ساغرِ شراب

جب بینی رام نے سفر آخرت اختیار کیا تو ایک بیٹا رام دیال نامی اپنی ہمقوم بیوی سے بھی چھوڑا جو مہاجنی کی کوٹھی اور تمام مال و اسباب کا مالک ہوا۔ رام دیال نہایت بلند حوصلہ و جاہ پسند آدمی تھا مگر اُمی محض ہونے کی وجہ سے پر پرواز نہ تھے۔ باوجود اس خامی کے اُس نے بہ سلسلہ جواہر فروشی نصیر الدین حیدر شاہ اودھ کے دربار تک رسائی پیدا کی۔ اس وقت اس جواں بخت و جواں سال تاجدار کی حسن پرستی کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ رام دیال نے اپنی سوتیلی بہن دختر عاشورن کو بادشاہ کی خدمت میں تحفۃً پیش کر دیا۔ جنھوں نے اس گل اندام کو داخل حرم کر کے پھول محل کا خطاب دیا اور رام دیال کو بھی راجہ کا خطاب عنایت کیا۔ راجگی کا طرۂ امتیاز حاصل ہونے پر رام دیال کا غنچۂ دل شگفتہ ہو گیا اور عہدۂ وزارت کی دھن بھی دل میں سمائی۔ چنانچہ میر فضل علی اعتماد الدولہ وزیر اعظم کے مستعفی ہونے پر راجہ رام دیال کا دامن گلہائے مراد سے بھر گیا، اور بادشاہ نے امور سلطنت کی انجام دہی اقبال الدولہ پسر ظفر الدولہ کپتان فتح علی خاں مرزا جعفر ابن مرزا حاجی اور راجہ رام دیال کے سپرد کر دی۔ اس منصب عالی پر فائز ہونیکے بعد بقول سید کمال الدین حیدر مصنف قیصر التواریخ راجہ رام دیال کا بھی دربار مثل[1] دربار وزیر اعظم ہونے لگا اور شہر کے جتنے مفتری، جعل ساز

[1] ملاحظہ ہو تواریخ اودھ مرتبۂ مولانا نجم الغنی رامپوری

اور چاشت خور تھے سب جمع ہوئے۔

منشی عبدالاحد مصنف وقائع دلپذیر کے نزدیک چونکہ تینوں وزراء ناکردہ کار اور کم عمر تھے اس لئے اپنے عہدۂ جلیلہ کے فرائض بحسن وخوبی انجام نہ دے سکے اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد عیش وعشرت میں پڑکر گلچھرّے اُڑانے لگے اور بادۂ گلگوں سے بھی مدہوش رہنے لگے جس پر تخمیناً دس ماہ کے بعد شاہ اودھ نے راجہ رام دیال اور دیگر وزراء کو برخاست کردیا اور نواب منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں کو فرخ آباد سے بلاکر بتاریخ ۴۔ نومبر ۱۸۳۰ء قلمدان وزارت اُنکے سپرد کردیا۔

مولانا نجم الغنی مؤلف تاریخ اودھ نے ان واقعات کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ اعتماد الدولہ کا زوال راجہ رام دیال کے عروج کا باعث ہوا، اور تمام سلطنت میں اس کا حکم جاری ہونے لگا۔ مگر راجہ بالکل اَن پڑھ کندۂ ناتراش تھا۔ جب سر ہربرٹ میڈک (Sir Herbert Maddock) ریزیڈنٹ ہوکر آئے تو اُنھوں نے ایک روز رام دیال کی مزاج پرسی کی۔ جس کے جواب میں اُس نے بجائے نفخ کے کہا میرے پیٹ میں نفس بہت رہتا ہے۔ یہ سُنکر ریزیڈنٹ سمجھ گئے کہ یہ شخص علم وفضل سے بالکل بیگانہ ہے اور کسی متقدر اور ذمہ داری کے عہدہ کی قابلیت اور اہلیت نہیں رکھتا۔ چنانچہ اُنھوں نے یہ بات بادشاہ کے گوش گزار کرکے اُن پر اپنا منشا بھی ظاہر کردیا کہ رام دیال جیسے شخص کا مدار المہام ہونا سلطنت کے لئے باعث بدنامی ہے۔ اس کے بعد راجہ رام دیال کی آمدورفت ریزیڈنسی میں موقوف ہوگئی اور پرچہ پیام چوبدار کی معرفت جانے لگا۔ اگر کوئی مشکل کام پیش آتا تو نجم الدولہ کے ذریعہ سے انجام پاتا۔ رام دیال سے ریزیڈنٹ کی ناراضگی کا خاص سبب یہ تھا کہ ایک روز اُنھوں نے رام دیال سے دریافت کیا کہ کیوان جاہ کس کے نطفہ سے ہیں اور ساتھ ہی اس کے راجہ کو ہدایت بھی کردی کہ یہ بات اپنے تک رکھنا۔ مگر راجہ پیٹ کا ہلکا تھا بات ہضم نہ کرسکا اور اپنی سرخروئی جتانے اور اثر جمانے کو یہ واقعہ حرف بحرف بادشاہ سے بیان کردیا جس پر ایک روز اُنھوں نے برسبیل تذکرہ ریزیڈنٹ سے دریافت کیا کہ آپ کیوان جاہ سے کیوں ناخوش ہیں۔ یہ سُنکر ریزیڈنٹ دم بخود رہ گئے اور دل میں سمجھ لیا کہ یہ حرکت رام دیال کی ہے اُسی روز سے راجہ ریزیڈنٹ کی نظروں سے گر گئے۔ مابعد بادشاہ نے بھی اُن کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں، بعدہٗ اُن کے حکم سے ٹیڑھی کوٹھی میں گرفتار ہوکر اپنے ہی مکان سکونہ میں نظربند کردیئے گئے۔ اس طور پر چار دن کی چاندنی ختم ہوگئی اور اُن کے حواشی بھی اپنی اصلی حالت پر آگئے۔

منشی رام سہائے تمنّا مؤلف احسن التواریخ نے بادشاہ کی بے رُخی اور راجہ کی اسیری کے حسب ذیل

اسباب بتلائے ہیں، اُن کی عبارت ملاحظہ ہو:۔

"میٹکاف صاحب نے بمعائنہ تحریرات سابقہ اخراج رام دیال و معزولی شرکار نیابت پر کمر ہمت چست کی، اتفاقات وقت سے کچھ جعل و رشوت ستانی ان لوگوں کی ثابت ہوئی، ریزیڈنٹ نے بادشاہ سے عرض کی اگر اخراج رام دیال میں حضور کو تامل ہے تو وہ ریزیڈنسی میں محبوس کیا جائیگا ناچار بادشاہ نے قید کیا۔ اور اکبر علی خاں فرزند امیر الدولہ حیدر بیگ خاں کو بارہ دن تک کام نیابت پر مقرر کیا۔ بعد اس کے منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں بہادر وزیر ہوئے۔"

راجہ رام دیال کی اسیری کے بعد بھی چھوٹی محل تو بادشاہ کے گلے کا ہار بنی رہیں مگر راجہ مرجھائے ہوئے پھولوں کی طرح جہاں پناہ کے دل سے بالکل اُتر گئے اور اُن کا چمن آرزو ہمیشہ کے لئے اُجڑ کر رہ گیا۔

راجہ رام دیال کا عالی شان مکان چوڑی والی گلی متصل گول دروازہ میں بوسیدہ حالت میں ابتک موجود ہے اور مکان سے متصل ایک محلہ بھی موسومہ فرش راجہ رام دیال اب تک اُن کے نام سے موسوم ہے۔ اُن کے باپ بینی رام کا بھی ایک وسیع باغ محلہ نوازگنج کے قریب ابتک موجود ہے جو کسی کے ہاتھ بک چکا ہے اور اب اس میں کاشتکاری ہوتی ہے مگر داخلہ کا عالی شان پھاٹک اُس کی اگلی عظمت کا پتہ دیتا ہے۔ باغ ابتک سپاری والے کا باغ یا سپاری باغ کے نام سے مشہور ہے۔

جذبات بسمل

(از حضرت بسمل الہ آبادی)

انھیں کیوں داغہائے دل سمجھیے ۔۔۔ ستاروں کی بھری محفل سمجھیے

وقارِ داغ و قدرِ دل سمجھیے ۔۔۔ اُسے لیلےٰ اِسے محمل سمجھیے

کھلے گا بعد اس کے مطلبِ غم ۔۔۔ ذرا پہلے زبانِ دل سمجھیے

جہاں چل پھر کے رُک جاتی ہیں موجیں ۔۔۔ اُسی کو دامنِ ساحل سمجھیے

سرِ منزل بھی کوئی دم نہ ٹھہرا ۔۔۔ مجھے گردِ رہِ منزل سمجھیے

ادھر آندھی اُدھر بجلی کا کھٹکا ۔۔۔ چمن والوں کی یہ مشکل سمجھیے

جوابِ تیغِ قاتل ہر غزل ہے ۔۔۔ کلامِ حضرتِ بسمل سمجھیے

بابو مہابیر پرشاد سری واستو انجم مرحوم

(از سید مقبول حسین احمد پوری، بی۔اے، ایل ایل۔بی)

بابو مہابیر پرشاد سری واستوا انجم اگست ۱۸۹۳ء بمقام خیرآباد ضلع سیتاپور ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی۔ وہیں سے بی۔اے اور ایل ایل۔بی پاس کیا۔ اردو فارسی میں خاصی لیاقت تھی لڑکپن سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ یوں بھی خیرآباد کی سرزمین شعروشاعری کی جنم بھومی رہی ہے۔ مضطر خیرآبادی اور ریاض خیرآبادی کو کون نہیں جانتا۔ انجم نے انھیں بزرگوں سے فیض پایا تھا اور انھیں کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ اس طرح شعروشاعری کی فضا میں آپ کا شباب گذرا تھا۔ یہ تو معلوم نہیں کہ آپ نے کس سے اصلاح لی، لیکن بیخود۔ ریاض اور امیر کا ذکر آپ کی زبان پر اکثر رہتا تھا۔

آپ نہایت متین، کم سخن، سنجیدہ مزاج اور خوش گفتار رہتے تھے۔ آپ کی ہنسی تبسم اور مسکراہٹ کی حد تک رہتی تھی کبھی قہقہے کی نوبت نہ آتی تھی، آپ کو اپنے صلح کل مشرب پر فخر تھا، ایک فارسی غزل میں اسی طرف اشارہ ہے

بحمد اللہ ز بند سبحہ و زنار آزادم
بتار گیسوئے پرپیچ جاناں کار ہا بستم

مذہب کے معاملے میں وہ ہمیشہ بے لوث رہے" بہ سیرت مسلماں بہ صورت ہندو" والی کہاوت[1] ان پر صادق آتی ہے، مذہبی کٹرپن کی ادائیں انھیں پسند نہ تھیں۔ تھیاسوفی کی اکثر کتابیں ان کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ دنیا میں ایک مذہب اور ایک ہی معاشرت ہو۔ اس مسئلہ پر کئی بار ان سے گفتگو رہی، ان کے خیالات بہت وسیع تھے، فلسفہ پسند اور تصوف کے قائل تھے۔ تصوف کے اکثر اشعار ان کے ورد زبان رہتے تھے۔ قاضی ابرار حسین صاحب ڈپٹی رجسٹرار چیف کورٹ لکھنؤ جو اب ریٹائر ہو چکے ہیں مشائخین میں شمار ہوتے ہیں اور صاحب حال و قال بزرگ ہیں اُن سے اکثر بحث و مباحثہ ہوا کرتا تھا۔ انجم مرحوم کبھی کبھی کوئی ایسا شعر پڑھ دیتے تھے کہ قاضی صاحب کو وجد آجاتا اور بار بار دہرانے

---

[1] اصلی ہندو مذہب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ کسی ملت سے تعصب ہو چنانچہ یہی بے تعصبی اس کا جوہر ہے۔

گتے تھے۔ اس قسم کی صحبتوں کا ایک شعر راقم کو یاد ہے :-

تو نے ازل میں دل پہ یہ کیسی نگاہ کی
اب تک ہے زلزلے میں زمیں جلوہ گاہ کی　(بیخود)

انجم مرحوم چاہتے تو وکالت کرتے اور خوب کرتے، مگر ان کا دردمند دل اور رجحانِ طبیعت وکالت کی مصروفیتوں کی اہل نہ تھی۔ ان کی مرنجاں مرنج طبیعت کو نہ وجاہت ذاتی کا خیال تھا اور نہ قانونی موشگافیوں سے انھیں کوئی دلچسپی تھی۔ اس لئے آپ نے اس پیشہ کی طرف رغبت نہ کی راقم نے اُن کی زبان سے اُن کا یہ شعر اکثر سُنا ہے جس کو وہ لُطف لے لے کر پڑھا کرتے تھے۔ اس شعر سے ظاہر ہے کہ ان کی طبیعت کا میلان کس طرف تھا اور کس طرف نہ تھا ؎

کوہ و صحرا میں بھٹکنے کا چلن یاد نہیں
تیرا دیوانہ ہوں، مجنوں نہیں، فرہاد نہیں

اگست ۱۹۲۲ء میں وہ بہ سلسلۂ ملازمت عدالت العالیہ چیف کورٹ اودھ میں ترجمان کی حیثیت سے بمشاہرہ یکصد روپیہ ماہوار مقرر ہوئے۔ صرف اٹھارہ سال ملازمت کی اور اگست ۱۹۳۹ء میں اس دارِ فانی کو خیرباد کہا۔ شاعروں کی زندگی میں چند باتیں شاعرانہ ہوا کرتی ہیں۔ دیکھئے انجم کی پیدائش اگست (۱۸۹۳ء) میں ہوئی، ملازمت اگست (۱۹۲۲ء) میں اور وفات بھی اگست (۱۹۳۹ء) میں ہوئی۔ گویا آپ کی زندگی کا اہم مہینہ اگست تھا، اور یہ تقویمی مطابقت زندگی کے شعر کے لئے سنگِ میل تھی۔

ملازمت کے ساتھ ہی ساتھ ان کی بعض خاص مصروفیتیں بھی تھیں، مثلاً وہ ایک تجربہ کار ہومیوپیتھ ڈاکٹر بھی تھے اور تھوڑی بہت پریکٹس بھی کرتے تھے۔ درحقیقت ہومیوپیتھی ان کے گھرانے کی جاگیر رہی ہے۔ انجم مرحوم کے چھوٹے بھائی اب بھی سیتاپور میں ہومیوپیتھی کی پریکٹس کرتے ہیں۔ آپ کی ہمشیرہ لکھنؤ کے مشہور ہومیوپیتھ ڈاکٹر پیارے لال کو بیاہی ہیں۔ اس طرح انجم مرحوم صبح و شام جب دفتر کے کام سے چھٹی پاتے تو خلقِ خدا کی طبی خدمات انجام دیتے۔ دفتر والوں کے تو وہ گویا فیملی ڈاکٹر تھے۔

آپ نے پانچ لڑکے اور غالباً دو بیٹیاں یادگار چھوڑی ہیں۔ آپ کی زوجہ محترمہ رائے بہادر بابو بھاگوت پرشاد صاحب ڈسٹرکٹ سشن جج اوناؤ کی ہمشیرہ ہیں۔ بچے ابھی سب کم عمر اور زیرِ تعلیم ہیں خدا اُن کے پس ماندہ بزرگوں کا سایہ ان پر قائم رکھے۔ ضلع سیتاپور میں آپ کے والد متوسط زمیندار بھی تھے

مازمت کے بعد انجم نے بہت کم کہا، جو کچھ کہا وہ بھی جمع نہ کیا نہ کسی رسالے میں چھپوایا مشاعروں سے انھیں اُلجھن سی ہوتی تھی، اس لیے مشاعرہ سے جی چراتے تھے۔ ان کا کلام ان کے عزیزوں سے تو دستیاب نہ ہوسکا لیکن حسن اتفاق سے ایک دن محترمی شیخ بدر الزماں صاحب وکیل (لکھنؤ) سے انجم کا ذکر آیا۔ شیخ صاحب موصوف کے کلاس فیلو رہ چکے تھے۔ چنانچہ ان کے پاس لکھنؤ کیننگ کالج میگزین کا ۱۹۱۹ء کا ایک پرچہ مل گیا جس میں انجم کی ایک فارسی غزل اور دو اُردو غزلیں تھیں جو بجنسہٖ ذیل میں ہدیۂ ناظرین ہیں:-

قیامت را ببالاے بتانِ فتنہ زا بستم | خرامِ ناز را ہنگامۂ روزِ جزا بستم
بخونِ خویشتن آلودہ کردم دست رنگینش | تعالی شانہٗ بر پنجۂ مرجاں حنا بستم
حقیقت بود یک آئینہ من از خام کاریہا | بروئیش صد ہزاراں پردہاے ما سوا بستم
چناں تنگ آمدم از دل کہ چوں از بر بدر کردم | ندانستم کہ در بر غیر یا بر آشنا بستم
بحمد اللہ ز بند سبحہ و زنار آزادم | بتارِ گیسوے پُر پیچ جاناں کار ہا بستم
مجو از من نشانِ آرزو عمریست کز حرماں | تمنا را بدل بشکستم و دست دعا بستم
اجابت دستِ من بوسید و از راہ صلح آمد | چو حرزِ حُب رقم نہ بود بر دستِ دعا بستم

میسر شد مرا گیسوے جذباتِ دلِ انجم
چو مہر بے وفا ورزیدم و عہدِ وفا بستم

حنا بھی جو اُن کے دست و پا تک سُرخ رو ہوکر | تو کیا کیا خون رُلوایا مجھے دل نے لہو ہوکر
برنگِ غنچۂ گل کیا خبر تھی دِل گرفتوں کو | کہ سب دل کا لہو اُڑ جائیگا یوں رنگ و بو ہوکر
بگڑ بیٹھیں وہ غیروں سے اگر یہ راز کھل جائے | کہ رہتے ہیں ہمیں ہر دل میں اُن کی آرزو ہوکر
لہو سے جامۂ صد چاک چپکا ہے مرے تن پہ | بنا ہوں غنچۂ گل آشنائے رنگ و بو ہوکر
یہ سچ ہے خوبیاں سب کس کو ملتی ہیں زمانے میں | جفا سیکھی بتان بے وفا نے خوبرو ہوکر
دلِ بیباک سے جانِ حزیں نے یہ شکایت کی | قیامت ہے کہ رہنا ایک گھر میں اور عدو ہوکر
بھلا ہم اور چھوٹے میکدہ، توبہ کرا ے واعظ | رہیگی خاک بھی اپنی یہیں جام و سبو ہوکر

یہ کیا منہ پھیر کر بھرتے ہو ٹھنڈی سانس اے انجم
تمہیں جو کچھ ہو کہنا کہہ لو اُن سے دو بدو ہوکر

ناگوارا کو خوشی سے جو گوارا کرتے | انتہائے غم ہستی کا تماشا کرتے

ہم کو توفیقِ محبت بھی اُسی نے بخشی | ورنہ ممکن تھا کہ ہم اسکی تمنا کرتے
ہم کو شکوہ ہے فقط عالمِ محویت کا | انھیں پہلو میں بٹھاکر تو نہ ڈھونڈھا کرتے
تمھیں انجم تھا اگر شوقِ سخن سنجی کا | دلِ پرجوش میں کچھ درد بھی پیدا کرتے

انجم مرحوم کا ایک مختصر سا تذکرہ خواجہ عبدالرؤف عشرت مرحوم کی تصنیف اُردو زبان کے ہندو شعرا میں بھی ہے اسمیں بھی آپکے چند اشعار لکھے ہیں انھیں میں سے ایک غزل کے چند اشعار درج ذیل ہیں:-

قیام عمرِ رواں کا مسافرانہ ہے | جہاں میں بستے ہیں جبتک کہ آب ودانہ ہے
عبث غرور ہے توفیقِ خیر پر زاہد | یہ اس کی بخشش و رحمت کا اِک بہانہ ہے
مجھے ریاضت و طاعت پہ اعتماد نہیں | سرِ نیاز ہے اور تیرا آستانہ ہے
فنا ہی کا ہے بقا نام دوسرا انجم | نفس کی آمد و شد موت کا ترانہ ہے

اس کے علاوہ ایک مرتبہ راقم کو انھوں نے اپنے چند اشعار سُنائے تھے جس میں صرف دو شعر یاد رہ گئے مقطع اُن کے ایک دوست کی زبانی دستیاب ہوا۔ اشعار یہ ہیں:-

نثار ہو گئے سب جی کے وارنے والے | سنوارتے رہے گیسو سنوارنے والے
صنم کدے میں، کلیسا میں گھر میں کعبے میں | پکارتے ہیں تجھی کو پکارنے والے
بنی ہے دم پہ مریضانِ عشق کے انجم | گذار دیں گے یہ دم بھی گذارنے والے

ایک شعر اور یاد ہے:-

تنگ دامانِ لحد میں یہ سمجھکر خوش ہوں | آنکھ کے سامنے چرخِ ستم ایجاد نہیں

راقم نے مرحوم کی زندگی میں جب ان کا کلام مانگا تو انھوں نے ایک انتخاب تیار کرلیا لیکن مجھے نہ دے سکے جب تقاضا کیا تو یہی کہا کہ میز کے خانے میں رکھ کے بھول گیا ہوں۔ کسے معلوم تھا کہ اتنی جلد وہ ہم سے جُدا ہو جائینگے چنانچہ وہ انتخاب بھی نہ مل سکا یہ بکھرے ہوئے جواہر ریزے جو مل سکے وہی اس وقت کام آئے

انجم مرحوم کی نا وقت وفات چند روز کے بخار سے ہوئی چیف کورٹ اسٹاف میں ان کے شریک کار ان کو قدر و عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اپنے ہم چشموں میں وہ ہمیشہ اپنی متانت و سنجیدگی کے لئے مشہور تھے ان کی اچانک موت کو سُنکر سب ہکا بکا رہ گئے۔ انکے ایک شریکِ کار جو یہاں ہیں میرے ڈپارٹمنٹ میں رو رہے تھے۔ وفات پر اہل دفتر نے ایک تعزیتی جلسہ بھی خان بہادر شیخ محمد باقر صاحب رجسٹرار چیف کورٹ کی صدارت میں منعقد کیا۔ اور چیف کورٹ ایسوسی ایشن کی طرف سے بھی ایک تعزیتی جلسہ سید شہاب الدین صاحب صدر ایسوسی ایشن و سپرنٹنڈنٹ دفتر ترجمہ ہوا تھا۔ بہر حال

مٹھیوں میں خاک لیکر دوست آئے وقتِ دفن | زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

*

تنقید کتب

شعرائے عثمانیہ یعنی مرقع سخن جلد چہارم

یہ جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل نوجوان شاعروں کے پسندیدہ اور منتخب کلام کا مجموعہ ہے جس میں قاضی غلام احمد اشرف آرام، محمد جلال الدین آشک، سید محمد اکبر، محمد امیر آمیرؔ، محمد عبد القیوم خاں باقی، ڈاکٹر بدر الدین بدر، ابو الفتح نصر اللہ برتی، محمد شعیب حزیں، عبد السلام ذکی، حبیب اللہ رشدی سید علی حسنین زیبا، صدر رضوی صاحب ساز، مہندر راج سکسینہ، محمد نصر اللہ سروش، ڈاکٹر رگھونندن راج سکسینہ، بدر الدین خاں شکیب، سید نبی الحسن شمیم، شنکر موہن لال، عزیز احمد عزیز، مخدوم محی الدین، زور، میر حسن الدین، صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش، سکندر علی وجد، لطیف النسا بیگم، نوشابہ خاتون کی پانچ پانچ نظمیں اور پانچ پانچ چیدہ غزلیں شامل کی گئی ہیں۔

جہاں تک غزلوں کا تعلق ہے۔ ہمیں صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش کی یہ غزل بہت پسند ہے

شراب ناب کو دو آتشہ بنا کے پلا — پلانے والے نظر سے نظر ملا کے پلا

چھلک رہا تھا تبسم بھی ساغرے میں — پھر ایک بار اسی طرح مسکرا کے پلا

شراب نغمہ بھی بہتی رہے فضاؤں میں — کلام حافظ و خیام گنگنا کے پلا

کچھ امتیاز رہے میکدہ میں میکش کا — لبوں سے اپنے ہر اک جام کو لگا کے پلا

لطیف النسا بیگم کی یہ رُباعی بھی خوب ہے :-

دنیا کی محبت میں اسیری دیکھی — اسباب امارت میں فقیری دیکھی

سیکھی ہے مرے دل نے قناعت جب سے — بے مائگی میں شانِ امیری دیکھی

گلِ نغمہ

یہ مولوی عظیم الدین احمد صاحب کے دلپذیر کلام کا دلچسپ مجموعہ ہے جس میں نظمیں اور

لکھائی چھپائی۔ کاغذ۔ جلد عمدہ ہے، بڑی تقطیع کے ۲۳۱ صفحے ضخامت۔ قیمت پونے تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ:- ادارۂ ادبیات اردو، رفعت منزل۔ خیریت آباد۔ حیدر آباد دکن۔

غزلیں دونوں شامل ہیں۔ شروع میں مسٹر کلیم الدین احمد نے ایک مقدمہ لکھا ہے، جسے شعر و شاعری اور تنقید، تقریظ کی کسوٹی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس لئے نامناسب نہ ہوگا اگر اس مجموعہ کو بھی اسی معیار کو پیش نظر رکھکر دیکھا جائے۔

مسٹر کلیم الدین احمد کے نزدیک "غزل نیم وحشی صنفِ شاعری ہے" جس میں ہوتا کیا ہے بقول مسٹر کلیم "معشوق کا حسن جس سے مہ و خورشید شرمندہ، اس کی سنگدلی و ستم انگیزی عشق کا جوش و خروش، عاشق کی وفاکیشی اور حرماں نصیبی، وصل کی جستجو، رقیبوں کے شکوے، جور فلک کے گلے، مئے گلفام کی ہوس، واعظ سے چھیڑ چھاڑ، باغ و بہار کے منظر، غرض انھیں باتوں کی صبر شکن تکرار ہوتی ہے۔ اگر طاقتِ پرواز میسر ہوئی تو عشق مجازی چھوڑ کر عشق حقیقی کی چاشنی پیدا کی، تقدس، ریاضتِ نفس، ترک عیش و عشرت، ریاکاری سے اجتناب، حرص و ہوا سے پرہیز وغیرہ پر بھی خامہ فرسائی کی گئی"۔ کلیم صاحب کی پیش کردہ فہرست اس قدر وسیع ہے کہ دنیا و دین کا شاید ہی کوئی مضمون اس فہرست سے باہر ہو۔ مگر جو غزل مضامین کے لحاظ سے اس قدر جامع ہو اُسے "نیم وحشی" قرار دینا ظلم نہیں تو کیا ہے۔ "گل نغمہ" کی ایک چھوٹی سی چیز "روح نغمہ" ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔ کلیم صاحب بتائیں کہ ان اشعار کا کون سا مضمون ایسا ہے جو ان کی پیش کردہ فہرست میں نہیں ہے:-

چھین لیتی ہے مری جان کو ایمان سمیت — آہ! یہ کون سا جادو تری آواز میں ہے

جلوۂ ہوش ربا، جرأت حیرت افزا — وہ ترے حسن میں ہے، یہ ترے جانباز میں ہے

دل بَری، جاں طلبی، دل شکنی، بے مہری — نہ تبسم میں ترے، یہ ترے انداز میں ہے

ٹوٹ سکتا ہی نہیں اس کی خموشی کا طلسم — لوحِ محفوظ نہاں، سینۂ ہمراز میں ہے

روح نغمہ نے نوا ساز سے ہنسکر یہ کہا — سوز آفت کا ترے ساز کی آواز میں ہے

پھونک دے آن میں جو جان و جہاں کی ہستی — ایسا نغمہ! ابھی پوشیدہ مرے ساز میں ہے

پہلے شعر میں "ایمان سمیت" کا ٹکڑا بہت خوبصورت اور فصیح ہے۔

کلیم صاحب نے اپنے مقدمہ میں اُردو تنقید کے متعلق لکھا ہے کہ:-

"اردو تنقید محض الفاظ کے دام میں جا پھنسی، روح کو نظر انداز کر کے جسم پر نگاہ دوڑائی گئی، اور کیوں نہ ہو جب جسم روح سے بے نیاز ہو! الفاظ کی صحت، محاوروں کی فصاحت زبان کی روانی، سلاست پر نظر ڈالی، تو کبھی کبھی، لفظ یا بندش کی سند طلب کی، کہیں صنائع

بدائع کو دیکھا تو کہیں عامیانہ الفاظ و تراکیب کی مذمت کی۔ اگر تحسین پر اُتر آئے تو تعریف کی بوچھار اور اگر مذمت پر اُتر آئے تو ہجو کی بھرمار کی، اسی کا نام تنقید ہے۔"

مگر شعر میں اچھے لفظوں، بلند تخیل عمدہ ترکیب، لفظوں کے صحیح استعمال (ردیف و قافیہ اور بحر کی پابندی) کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ شاعر و ادیب سے تہذیب زبان کی توقع کی جا سکتی ہے، اس لئے شاعر ہی الفاظ کو غلط اور بے محل استعمال کریں تو پھر الفاظ کے صحیح استعمال کی کس سے اُمید کی جا سکتی ہے۔ یہاں "گل نغمہ" کا ایک شعر پیش کیا جاتا ہے، جس میں شاعر نے لفظ "طرح" دو طرح استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

کبھی الگ ہوئیں وہ اس طرح بصد انداز   جدا ہوں رشک سے جس طرح دو پری تمثال

پہلے مصرعہ میں "طرح" کی "ر" متحرک ہے، مگر دوسرے مصرعہ میں نہیں ہے، ذرا سے ردّ و بدل سے یہ شعر یوں ہو سکتا ہے:۔

کبھی الگ ہوئیں اس طرح وہ بصد انداز   جدا ہوں رشک سے جیسے طرح دو پری تمثال

جہاں تک ہم نے اس مجموعہ کی نظموں پر غور کیا ہے وہ بہت شگفتہ ہیں اور بعض بعض نظمیں سبق آموز بھی ہیں۔ اس مجموعہ کی لکھائی چھپائی وغیرہ میں خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ مصنف اور مقدمہ نگار دونوں کے فوٹو اور مصنف کا عکسِ تحریر بھی موجود ہے، اس کا حجم بڑی تقطیع کے تقریباً ڈیڑھ سو صفحات ہے۔ قیمت ڈھائی روپیہ، ملنے کا پتہ: رکتابستان۔ الہ آباد۔

محمد حسین آزاد

اس کتاب میں محترمہ جہاں بانو بیگم (نقوی) ایم۔ اے نے شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کی سوانحعمری تفصیل کے ساتھ قلمبند کی ہے، چنانچہ مولانا کے خاندانی حالات آپ کی پیدائش، تعلیم، ملازمت، تصانیف، عادات و خصائل، احباب، نثر نگاری اور شاعری سب پر بہت کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مولوی محمد حسین آزاد اُردو زبان کے بہت بڑے محسن ہیں اور جدید اُردو شاعری کے اولوالعزم بانی ہیں جن کا احسان اُردو زبان قیامت تک نہیں بھول سکتی۔ اس لئے ہمارے زمانہ کے لوگوں کو مولانا کے حالات سے کافی واقفیت ہے لیکن آئندہ کے لئے محترمہ جہاں بانو صاحبہ نے یہ کتاب لکھکر اُردو زبان پر ایک بڑا احسان کیا ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ رسمی، ضخامت دو سو صفحات۔ قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ: ادارۂ ادبیات اُردو بیت منزل خیریت آباد حیدرآباد دکن

رگبی کی زندگی

یہ کتاب ٹامس ہیوز کی مشہور انگریزی کتاب ٹام براؤنس اسکول ڈیز Tom Brown's School Days کا سلیس اور شگفتہ ترجمہ ہے۔ اصلی کتاب ۱۸۵۷ء میں لکھی گئی تھی، جسے اب مسٹر بشیر رشید ایم۔اے، اور ان کے بعض قابل معاونین نے اردو زبان کا جیت جامہ پہنا دیا ہے کوئی شخص دنیا میں ایسا نہیں ہے جسے اپنی طالب علمی کے زمانہ کی یاد نہ آتی ہو، اور وہ اپنے حلقۂ احباب میں اس زمانہ کے حالات لطف لے لے کر بیان نہ کرتا ہو۔ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ معلوم ہو جائیگا کہ انگلستان کے سکنڈری اسکولوں کا طریقۂ تعلیم، کورس، اور تفریحات کیا ہوتے ہیں اور انگلستان کے نوجوانوں کے تعلیم و تربیت کا کیا انتظام ہے۔ غرض بحیثیت مجموعی کتاب دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ ضخامت چھوٹی تقطیع کے ۱۴۰ صفحات۔[1]

علم دولت[2]

یہ کتاب ملک کے مشہور ماہر اقتصادیات پروفیسر برج نراین ایم۔اے کی قابل قدر تصنیف ہے، جس میں انھوں نے اس علم کے متعلق بہت سی مفید معلومات یکجا کر دی ہیں۔ کتاب میں پانچ باب اور پچیس فصلیں ہیں، جن میں دولت کی تعریف، دولت کمانے کے طریقوں، دولت کی تقسیم، سرمایہ و مزدوری کے تعلقات، مانگ اور پیداوار کے توازن، ٹیکسوں، شرح مبادلہ، اور حکومت کے فرائض وغیرہ وغیرہ مسائل پر پوری روشنی ڈالی گئی ہے۔ زبان بھی سلیس اور عام فہم ہے۔ روپیہ یا سکہ کی قیمت کا سمجھنا عام لوگوں کی سمجھ سے باہر ہے، مگر پروفیسر برج نراین نے اور ان کی مختلف قیمتوں کے نقشوں کے ذریعہ سے اس مسئلہ کو بڑی خوبی سے سمجھایا ہے۔

ٹیکس کا مسئلہ بھی ایک ٹیڑھا مسئلہ ہے، براہ راست اور بالواسطہ ٹیکسوں کے لئے جنھیں انگریزی میں (Direct, Indirect) کہتے ہیں، پروفیسر صاحب نے ان کے لئے دو نئی اصطلاحیں ایجاد کی ہیں، یعنی سیدھے و ٹیڑھے ٹیکس جو ہمارے خیال میں بہت خوب ہیں۔ علم اقتصادیات میں دو اور مشکل مسئلوں یعنی مبادلۂ زر اور بین الاقوامی تجارت پر بھی پروفیسر صاحب نے خوب بحث کی ہے۔ غرض کتاب بہت مفید اور قابل قدر ہے۔ ہماری رائے میں کالجوں کے

---

[2] قیمت ۱۲ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی،

[1] لکھائی چھپائی کاغذ۔ جلد وغیرہ اچھی ہے، چھوٹی تقطیع کے ۲۰۰ صفحے ضخامت۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ: مسرز لاجپت رائے اینڈ سنز پبلشرز تاجران کتب۔ لاہور۔

اقتصادیات کے طالب علموں کو اس سے بہت فائدہ پہونچے گا۔ درحقیقت اُردو میں یہ اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے۔ اور فاضل پروفیسر برج نراین نے اسے لکھکر زبان اُردو پر بڑا احسان کیا ہے جن حضرات کو مزدوری اور سرمایہ داری کے مسئلوں سے عملی دلچسپی ہے ان کے لئے بھی اس کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا۔

اقتصادی ہند

یہ کتاب بھی پروفیسر برج نراین ایم۔اے کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کتاب "علم دولت" میں پروفیسر صاحب نے دولت اور اُس کے متعلق مسائل پر عام نظر ڈالی ہے اور اس کتاب میں صرف ہندوستان کے اقتصادی حالات سے خصوصیت سے بحث کی گئی ہے ہر ملک کی اقتصادی حالت کو سمجھنے کے لئے چند باتوں کے سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً ملک کا رقبہ کیا ہے، آبادی کتنی ہے، پیداوار کیا ہے، سلسلہ آمد و رفت کیسے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

جس ملک کا رقبہ کم اور آبادی زیادہ ہے اس کے باشندوں کو کھانے پکانے اور دوسری ضروری چیزوں کے لئے ہمیشہ دوسرے ملکوں کا دست نگر رہنا پڑے گا۔ ایسے ملکوں کی مثالیں جاپان اور برطانیہ ہیں۔ مگر جس ملک کا رقبہ وسیع اور آبادی کم اور پیداوار زیادہ ہے لیکن آمدو رفت اور باربرداری کے ذرائع نہیں ہیں اس کی تمام پیداوار گھر میں ہی پڑی سڑے گی۔ دوسرے ملکوں کو بھیجکر اس سے نفع نہیں اُٹھایا جا سکتا۔ ایسے ملک افغانستان، ایران اور حبش ہیں پروفیسر برج نراین نے ہندوستان کی انھیں تمام باتوں کو پیش نظر رکھکر یہ سبق آموز اور پُر از معلومات کتاب لکھی ہے جس میں ہندوستان کا رقبہ، آبادی، مختلف چیزوں کی پیداوار وغیرہ کا مفصل حال درج ہے اور یہ بھی بتلا دیا گیا ہے کہ یہاں کارخانوں کے قانون کیا ہیں، بیکاری کی کیا کیفیت ہے، اور وہ کس طرح دور کی جا سکتی ہے؟ ریلوں اور سڑکوں کی کیا حالت ہے؟ غیر ملکوں سے تجارت کی کیا صورت ہے، قیمتیں کس طرح گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں۔ غرض روپیہ، بنک، مبادلہ قوانین زراعت، مالگذاری وغیرہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس پر فاضل مصنف نے سلیس اور عام فہم زبان میں بحث نہ کی ہو۔ کتاب کے آخری باب میں پنجاب کے حالات سے بحث کی گئی ہے۔ غرض پوری کتاب نہایت محنت سے لکھی گئی ہے جس پر ہم فاضل مصنف کو مبارکباد دیتے ہیں[1]۔

---

[1] ضخامت ۲۹۰ صفحے قیمت ڈیڑھ روپیہ، ملنے کا پتہ لالہ لاجپت رائے اینڈ سنز تاجران کتب و پبلشرز لاہور،

علمی خبریں اور نوٹ

پروفیسر حامد حسن صاحب قادری پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ نے اُردو طالب علموں کے فائدہ کے لئے "داستان اُردو" کے نام سے اُردو ادب کی مفصل تاریخ لکھی ہے جو عنقریب شائع ہونیوالی ہے۔

ماہ رواں سنہ حال میں ہز ہائینس نواب صاحب رامپور کی سرپرستی میں ریاست رامپور میں رضا اکیڈیمی کے نام سے ادبی انجمن قائم ہوئی ہے جسکی افتتاحی رسم ہز ہائینس ممدوح کے دست مبارک سے ادا ہوئی۔ اُمید ہے کہ اس اکیڈیمی سے اردو زبان میں گراں قدر اضافہ ہوگا۔

رائے بہادر رام بابو سکسینہ صاحب ایم۔اے۔ ایل ایل۔بی دیوان ریاست کوٹہ و مصنف تاریخ اُردو لٹریچر نے کئی سال کی تلاش و تحقیق کے بعد یورپین و انڈو یورپین شعرائے اُردو و فارسی کا ایک دلچسپ تذکرہ لکھا ہے جس میں تقریباً ایک سو یورپین و انڈو یورپین شاعروں کے سوانحی حالات معہ تصاویر درج ہیں اور ان کی زیادہ تر غیر شائع شدہ نظموں کے مفصل انتخابات بھی پیش کئے گئے ہیں۔ کتاب مکمل ہو چکی ہے اور نولکشور پریس لکھنؤ میں زیر طبع ہے۔ آج کل آپ دورِ جدید کے اُردو شاعروں کا ایک مکمل تذکرہ لکھنے کیلئے ضروری مسالہ جمع کر رہے ہیں۔

حضرت تمنائی اور جناب سہیل عظیم آبادی کی کوشش سے پٹنہ میں نیا سنسار کتاب گھر کے نام سے ایک کارخانہ قائم ہوا ہے جس کے ذریعہ اُردو کی سستی اور اچھی کتابوں کی اشاعت کا انتظام کیا جائیگا۔ شائقین ادب ایک روپیہ سالانہ فیس دیکر اس کتاب گھر کے ممبر ہو سکتے ہیں۔ انھیں اسکی ہر نئی کتاب آدھی قیمت پر دیجائیگی۔ معمولی کتابوں کی قیمت ۸؍ آنہ تجویز کیگئی ہے۔ اور دوسری مطبوعات بھی ۲۵ فیصدی کمیشن کی رعایت سے دیجائیں گی دائمی ممبری کی فیس پچیس روپیہ رکھی گئی ہے۔ جس کے صلے میں اس سلسلہ کی تمام کتابیں بلا قیمت نذر کی جائیں گی۔ اور دوسری کتابیں ۳۳ فیصدی کمیشن پر دیجائینگی۔ فی الحال تین کتابیں یعنی "زندہ چین" کے نام سے چینی کہانیوں کا ایک مجموعہ "الاؤ" کے نام سے سہیل صاحب کی سماجی کہانیوں کا مجموعہ اور مسٹر محمد علی ردولوی کی معاشرتی کہانیوں کا مجموعہ "گناہ کا خوف" کے نام سے چھپ رہی ہیں۔ منتظمان کتاب گھر ہر ماہ ایک نئی کتاب شائع کرنیکا انتظام کر رہے ہیں

انڈین پریس الہ آباد نے بعض انگریزی کتابوں کے سلسلے کی تقلید میں ہندی زبان کی پانچسو منتخب کتابوں کے

شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ چنانچہ اوّل بیس کتابیں شائع ہو کر بازار میں فروخت ہو رہی ہیں۔ باقی کتابیں، ہفتہ میں ایک کتاب کے اوسط سے شائع ہونگی۔

بہار کے نامور رہنما ڈاکٹر راجیندر پرشاد اور اُن کے قوم پرست رفیق قومی نقطۂ خیال سے ہندوستان کی ایک نئی اور مفصل تاریخ تیار کرنے کا بندوبست کر رہے ہیں۔ یہ ضخیم تواریخ اکیس جلدوں میں شائع کیجائیگی پچھلے زمانہ کے ہر دور کے حالات لکھنے کا کام خاص خاص ماہرین فن کے سپرد کیا گیا ہے۔ چنانچہ سر جادوناتھ سرکار۔ راؤ بہادر کے۔ این۔ دکشت۔ پروفیسر حبیب جیسے ممتاز مورخ اسکی تیاری میں حصہ لے رہے ہیں۔ ہندوستانی مورخوں سے اتنے بلند پیمانہ پر ملک کی تاریخ لکھوانے کی کوشش اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے جس کی ملک میں خاص قدر ہونی چاہیئے۔ معلوم ہوا ہے کہ اس اہم تاریخ کی پہلی جلد عنقریب چھپکر شائع ہو جائیگی۔

پچھلے مارچ میں ہندوستانی زبانوں کے مشہور فاضل سر جارج گریرسن کی وفات سے مشرقی علوم کا ایک زبردست ماہر کامل اُٹھ گیا۔ آپ نے ہندوستان کی تمام مروجہ زبانوں کے متعلق اکیس ۲۱ جلدوں کا ایک محققانہ سلسلہ شائع کیا تھا، جو آپ کی سالہا سال کی تحقیق و تفتیش کا نتیجہ ہے۔ آپ کا انتقال نوّے سال کی عمر میں ہوا اور آپ نے اپنی طولانی عمر تحقیق علوم ہی میں صرف کردی مشرقی زبانوں کے متعلق آپ کی رائیں قول فیصل کا حکم رکھتی تھیں۔

مولانا عبدالرزاق صاحب کانپوری مصنف البرامکہ و مہتمم تاریخ ریاست بھوپال نے بیس ۲۰ سال کی محنت و جانفشانی کے بعد حکیم ناصر خسرو بلخی کے سفرنامہ کا ایک مشرح ایڈیشن تیار کیا ہے اصل سفرنامہ فارسی میں ہے جس کا فرانسیسی ترجمہ پروفیسر شیفر ڈ نے کیا ہے۔ جب ۱۸۸۱ء میں یہ سفرنامہ ہندوستان آیا تو شمس العلما مولانا حالی نے نواب صاحب لوہارو کے کتب خانہ سے اسکا اصلی نسخہ حاصل کر کے اسکی نقل دہلی سے شائع کی۔ مگر اب یہ نسخہ نایاب ہو گیا ہے۔ پروفیسر شیفر ڈ کا تصحیح کردہ سفرنامہ برلن سے بھی شائع ہوا۔ اب مولانا عبدالرزاق نے تقریباً دو سو صفحات پر اس کا نہایت صاف اور سادہ اردو میں ترجمہ کیا ہے اور ڈھائی سو صفحات پر اس سفرنامہ کے تاریخی نوٹ اور تقریباً سو صفحات میں ناصر کی سوانحعمری لکھی ہے۔ اب یہ قابل قدر کتاب انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام دہلی میں چھپ رہی ہے۔ البرامکہ کا جدید اڈیشن انتظامی پریس کانپور میں زیر طبع ہے جو عنقریب شائع ہونے والا ہے۔

دوسرے ملکوں کے مشہور مصنفوں کو تصنیف و تالیف سے کس قدر آمدنی ہوتی ہے اسکا اندازہ اسی بات سے ہو سکتا ہے کہ مسٹر ونسٹن چرچل وزیر اعظم برطانیہ کو اُن کی تصانیف سے تقریباً پچیس ہزار پاونڈ سالانہ آمدنی ہوتی ہے۔ پریسیڈنٹ امریکہ کی بیوی مسز روز ویلٹ نے فاسزم کے خلاف کتابیں لکھکر چھ سال کے اندر تقریباً ڈھائی لاکھ روپیہ پیدا کیا۔ ہندوستان میں شاید سب سے زیادہ رقم جو کسی کتاب کے حق تصنیف میں ملی ہے وہ مہاتما گاندھی کو مسرس میکملن کمپنی نے انکی خود نوشت سوانحعمری پر

دی تھی کمپنی مذکور نے یورپ وامریکہ میں اسکی اشاعت کے حق کے لئے ایک لاکھ روپیہ کا چک دیا تھا. جسے مہاتما جی نے اسی وقت لکھا دی اسپنرس الیسوسی ایشن کے حوالہ کر دیا تھا.

موجودہ زمانہ کے بڑے بڑے مصنفین کی آمدنیوں کا کیا ذکر کیا جائے زندگی میں ہزاروں لاکھوں روپے خرچ کرنے کے بعد بھی مرنے پر بڑی بڑی رقمیں چھوڑ جاتے ہیں. مثلاً سر جیمس بیری نے تقریباً پونے دو لاکھ پونڈ کی جائداد چھوڑی ہال کین نے ڈھائی لاکھ پونڈ. سوکٹر ہوگیو کی جائداد کا اندازہ تین لاکھ پونڈ کیا جاتا ہے. کپلنگ نے ڈیڑھ لاکھ پونڈ چھوڑے ہارڈی نے کیا نوے ہزار پونڈ. گالزوردی نے اٹھاسی ہزار پاؤنڈ. جارج مور نے ۷۵ ہزار پاؤنڈ. کانن ڈائیل نے ۶۳ ہزار پونڈ. آرنلڈ بینٹ نے چالیس ہزار پونڈ. چسٹرٹن نے ۲۸ ہزار پونڈ. جوزف کانرڈ نے بیس ہزار پونڈ. لارڈ مارلی نے ۵۰ ہزار پونڈ. لارڈ برائس نے ۲۰۰ ہزار پونڈ اور مشہور ناول نگار چارلس ڈکنسن نے اسی ہزار پونڈ چھوڑے تھے.

اس کے برعکس ہندوستان کے اہل قلم کی حالت دیکھئے تو سخت افسوس ہوتا ہے. خصوصاً اردو ادیبوں کی حالت تو بالکل ہی ناگفتہ بہ ہے. حال میں اردو کے ایک ہردلعزیز مصنف جو عرصہ سے بیمار ہیں اپنی بابت ایک خط کے دوران میں لکھتے ہیں کہ "تندرستی کی حالت میں میں نے کبھی کسی کتاب پر رائلٹی لی اور نہ کبھی کسی مضمون کا معاوضہ لیا. کتابیں تصنیف کر کے دوست احباب کو دیں کہ چھپواؤ اور نفع اٹھاؤ. اب بیمار پڑ کر قلم اٹھانا دوبھر ہو گیا اور نوبت فاقوں پر پہونچی. تب مجبور ہو کر دو ایک کتابوں کی رائلٹی لی ہے. باقی کتابوں کے پبلشروں نے کل رقم مار لی ہندی میں اردو افسانوں کا ترجمہ دیا تو اس سے کچھ پیسے مل گئے. چھوٹے بھائی کی بیس روپیہ ماہوار امداد پہ پڑا سڑتا ہوں. کوشش کر رہا ہوں کہ اپنی ہی کتابیں کمیشن پر لیکر فروخت کروں مگر اشتہار کو پیسہ نہیں."

اس خط کو پڑھکر آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا. مگر "تہی دست اندر درم نیست" والا معاملہ ہے. کیا اردو زبان کا کوئی ایسا سرپرست نہیں ہے جو مستحق خادمان ادب کی حاجت روائی کا ضروری انتظام کر سکے؟ ہز ہائینس نواب صاحب بھوپال کی اولو العزمی کو ہزار آفریں ہے کہ انھوں نے علامہ اقبال کو پانچسو روپیہ کا گراں قدر وظیفہ دیکر انھیں روزمرہ ضروریات سے بے نیاز کر دیا تھا، اور ان کی وفات کے بعد بھی ان کے وارثوں کو وظیفہ دے رہے ہیں یوں ملک میں تقریباً ہر سال اقبال ڈے منائے جاتے ہیں، رسالوں میں لمبے چوڑے مضامین نکلتے ہیں اور بڑی بڑی تنقیدی کتابیں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن عام قدردانی کا حال نہ پوچھئے. علامہ مرحوم کے اولین مجموعۂ کلام بانگ درا کا پہلا اڈیشن ستمبر ۱۹۲۴ء میں تین ہزار شائع ہوا تھا، اس کے بعد پندرہ سال کے اندر یعنی جون ۱۹۳۹ء تک کل چار اڈیشن نکلے جن کی مجموعی تعداد ۱۴ ہزار جلدیں ہوئی. پندرہ سال کی لمبی مدت میں زمانۂ حال کے سب سے بڑے اردو شاعر کے پہلے مجموعۂ کلام کی صرف ۲۳ ہزار جلدیں فروخت ہوں. یہ اردو ادب کیلئے چنداں قابل فخر بات نہیں ہے

The ZAMANA, JUNE 1941. Rgd.No;A147

زمانہ

مرتبہ دیانراین نگم

جلد ۷۶ | جون سنہ ۱۹۴۱ء | نمبر ۶

فہرست

قیمت سالانہ پانچ روپیہ ۵ ر

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

ممالک غیر سے آٹھ روپیہ

(نمونہ سات آنے)

زمانہ

جلد ۷۶ جون سنہ ۱۹۴۱ء نمبر ۶

فنِ تنقید اور اردو ادب

از قاضی حامد علی مجازی، بی۔ اے (علیگ)

(۱)

اُردو ادب میں تنقید نگاری ایک نئی چیز ہے، مگر دوسری زبانوں کا یہ ایک قدیم اور مستقل فن ہے۔ سب سے پہلے یونان میں اس فن کی تکمیل ہوئی، اگرچہ موجودہ دور میں مغربی ملک ہی اس کے علمبردار نظر آتے ہیں۔ لیکن قبل پیدائش مسیح تہذیب کے ارتقا میں سب سے پہلے بابل Babylon کا نام آتا ہے اُس کے بعد یونان کے بڑے بڑے حکمار کا شمار ہے۔

تہذیب اور علم و فن لازم و ملزوم ہیں، علم کے بغیر تہذیب کا وجود ہی نہیں ہوتا اور تہذیب کے بغیر کوئی علم و فن بھی ترقی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ جب یونان میں بڑے بڑے ادیب اور فاضل حکیم پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے خیالات کی تنویر سے دنیا کے ہر تاریک گوشہ کو منور کر دیا تو فنِ تنقید نے بھی جنم لیا، اور ارسطاطالیس (Aristotle) اور افلاطون (Plato) کے ہاتھوں اس کو بھی ترقی ہوئی۔

کتابوں کے سلسلے میں لفظ "تنقید" یا "رائے فیصل" کا سب سے پہلے استعمال اپنے محدود معنوں میں اسکندریہ کے عالموں[۱] نے سنہ ۳۰۰ سنہ ۲۷۶ قبل مسیح میں کیا۔ چنانچہ نفسِ مضمون کی ترتیب

---

[۱] Alexanderian Scholars.

جملوں کی ترکیب۔ تسلسل، مضمون کی تشریح اور توضیح پر اظہار رائے تنقید کے نام سے تعبیر ہوئی
رفتار زمانہ کے ساتھ یہ نظریہ بھی کہ تنقید کا صرف کتابوں کے ساتھ تعلق ہے۔ بدل گیا اور
اس نظریہ کو وسعت دے کر تنقید کی یہ تعریف کی گئی کہ "Criticism is the exercise of Judgment in the province Art." یعنی تنقید فنون
لطیفہ پر رائے زنی کا نام ہے" اس کے بعد افلاطون کے ظہور تک کوئی اور رائے قائم نہ ہو سکی
افلاطون نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ادب میں انسانی زندگی کے ہر شعبہ کی ظاہری اور غیر مرئی حقیقت
ظاہر ہونا چاہیئے۔ اسی نظریہ کی بنا پر اس نے تنقید کو "تلاش حقیقت" کا دوسرا نام قرار دیا
اس اصول تنقید کی رو سے اس زمانہ کا یونانی لٹریچر یعنی ہومر اور ہسیڈ کی نظمیں اور پنڈار
(Pindar) کے ترانے اور اتھنس کے ڈراما نگاروں کے شاہکار حقیقی ادب میں شمار نہیں ہو سکتے
ہیں کیونکہ افلاطون ہر فن لطیف میں اخلاقی عنصر کا متلاشی تھا۔ اس نے اپنی کتاب "جمہوریت"
میں لفظ "حقیقت" اور "تنقید" کو ان الفاظ سے تعبیر کیا ہے:-

Criticism as a means of ascertaining to what extent a work of literature conveyed truthful and wholesome information, and corresponded to the external realities of the world.....

Study of literature or art is a question of morality...

Litrature and art are vehicles of morality."

ان الفاظ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ افلاطون کی "تنقید" سے صرف یہ مراد تھی کہ ادب کا
اخلاقی نکتۂ خیال سے جائزہ لیا جائے اور جن ادبی تحریرات میں اخلاقی جزو موجود ہو وہ "ادب"
میں شامل سمجھی جائیں ورنہ نہیں۔ اسی اصول کے ماتحت اس نے اپنے تمام پیشرو اور ہمعصر یونانی
شاعروں کے کلام کو صرف بے معنی ہی نہیں ٹھہرایا بلکہ نوع انسانی کے لئے مضر قرار دیا۔ افلاطون
کے بعد اس کے شاگرد ارسطاطالیس کا عروج ہوا اور اس نے افلاطون کے نظریۂ ادب و تنقید
سے مخالفت کرتے ہوئے دنیا کے سامنے ایک نئی اور مستحکم رائے پیش کی، وہ اس بات کا حامی تھا کہ

ا۔ Homer and Hesiod ۲۔ Republic

اگر ادب میں "بقا" کا عنصر نہ ہو تو وہ صحیح معنوں میں ادب کہلائے جانے کا مستحق نہیں ہے۔ اس کی نظر میں ادب اور انسانی زندگی کو ایک خاص طریقہ پر لازم و ملزوم ہونا چاہیئے۔ وہ ادب کو انسان کے اخلاقی اور ذہنی ارتقا کا مظاہرہ سمجھتا ہے۔ اس کا نظریہ ہے کہ ادب میں صرف ظاہری اور غیر مرئی حقیقت ہی کا عکس نہ ہونا چاہیئے بلکہ اس کے تخئیل میں حقیقت کا واقعی مظاہرہ ہونا چاہیئے "خیالات یا دماغی تصویریں" ادب کی بقا کے لئے ضروری نہیں۔ اور تخئیلی اشکال کے بغیر کوئی تحریر "ادب" میں شامل نہیں سمجھی جا سکتی ہے۔ اُس کی رائے میں ادب اور سائینس میں یہی فرق ہے کہ ادب میں "احساسات" (Feelings) لازمی ہیں۔ سائینس میں اُن کی ضرورت نہیں۔ حقیقت کے مظاہر کے دو پہلو ہیں، ایک (Subjective) دوسرا Objective پہلی صورت میں انسان حقیقت کو اس طرح بیان کرتا ہے جیسا کہ وہ اپنے دماغ میں تصور کرتا ہے۔ دوسری صورت میں وہ اسے من و عن بیان کر دیتا ہے جیسا کہ اُس کی آنکھیں دیکھتی ہیں :-

"Art then is the presentation of the real in its mental aspect."

اور جب ادب کا تخئیل انسانی سے تعلق تسلیم ہو گیا تو نقاد کا پہلا فرض یہ ہوا کہ وہ "احساسات یا خیالات" کا جائزہ لے۔ اسی ضمن میں ارسطا طالیس نے اس بات سے بھی اختلاف کیا ہے کہ اخلاقی پہلو ادب کا ضروری عنصر ہے۔ کیونکہ اخلاقیات (ٹھوس اخلاقی تعلیم سے) نفسِ مطلب خشک اور غیر دلچسپ ہو جاتا ہے۔ اور جب تک کوئی تحریر دلچسپی پیدا نہیں کر سکتی وہ ادبی معیار پر پوری نہیں اتر سکتی۔ اس کی رائے میں ہر فنِ لطیف کو انسان کی خوشی کا باعث ہونا چاہیئے۔

"Art is to give Pleasure."

ارسطا طالیس نے اپنی کتاب REHTORICS میں تنقید کے متعلق یہ رائے دی ہے:-

The business of Critical effort is to see the amount of pleasure conveyed in a Specimen of art and to ascertain the meaning of human life as a whole."

یعنی تنقیدی کوشش کا کام آرٹ کے کسی نمونہ میں دل خوش کرنے والی چیزوں کا دیکھنا اور بہ حیثیت مجموعی انسانی زندگی کے معنی تلاش کرنا ہے۔

اب یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ علم و فن کی تجدید کے زمانہ میں تنقید کے نظریہ اور اُصولوں کی کیا نوعیت قرار پائی۔ اٹھارھویں اور اوائل اُنیسویں صدی کے نقّادوں کا رویّہ تخریبی رہا۔ والٹیئر (Voltaire) نے شیکسپیئر کے مایۂ ناز ڈرامہ ہملٹ (Hamlet) کو ناقص قرار دیا ہے۔ نامور جرمن فلسفی اور شاعر گوئٹے (Goethe) نے ڈانٹے (Dante) کی مشہور و معروف تصنیف (Infer no) کے متعلق ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ مشہور انگریزی شاعر بائرن (Byron) نے متعدد انگریزی شاعروں کے کلام سے عجب نفرت کا اظہار کیا ہے۔ مشہور و معروف انگریز نقاد میتھو آرنالڈ نے جو زمانۂ قدیم اور زمانۂ متوسط کے ادب کا بڑا مدّاح ہے۔ اپنے ہم عصر شاعران باکمال مثل براوننگ، ٹینی سن، مارس، روزیٹی اور سوین برن وغیرہ کو بالکل نظرانداز ہی کر دیا ہے۔ حالانکہ اٹھارھویں اور اُنیسویں صدی کے بے اُصول تنقید نگاروں میں صرف اُسی کی ذات عام نقادوں سے وقیع اور بالاتر سمجھی جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ اپنی انتہائی قدامت پرستی کی وجہ سے اُس نے اپنے ہم عصر شاعروں کی اہمیت نہ پہچانی ہو، مگر دنیائے تنقید میں یونانی حکماء کے بعد وہ افضل ترین نقاد سمجھا جاتا ہے۔ اُس نے ادب اور خصوصاً شاعری کے متعلق یہ اُصول قائم کر دیا ہے کہ

"Poetry is a Criticism of life."

یعنی شاعری حیات انسانی کا تبصرہ ہے۔

تنقید کے متعلق اس کا خیال ہے کہ ادب میں کوئی تخلیقی کوشش اس وقت تک بار ور نہیں ہو سکتی جب تک ادیب کے پاس اس کا ضروری مسالہ موجود نہ ہو۔ یہ مسالہ خیالات ہیں جن کے بغیر کوئی ادبی کارنامہ ظہور ہی میں نہیں آ سکتا ہے۔ میتھو آرنالڈ کی یہ بھی رائے ہے کہ ایک ادبی تحریر کی تخلیق کے لئے دو طاقتوں کا بیک وقت جمع ہونا ضروری ہے یعنی ادبی ذہنیت اور استدراک کی فضا جو خیالات کی صورت یعنی ادب کا مسالہ مہیا کرتی ہے۔ وہ لکھتا ہے

"For the Creation of a master work of Literature two powers must ~~concur~~ concur, the power of the man and the power of the moment."

"یعنی کسی ادبی شاہکار کے لئے دو قوتوں کا یکجا ہونا لازمی ہے آدمی کی قوت تخیل اور وقت کا اثر" مگر یہ مسالہ تنقیدی کوشش کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ بہ الفاظ دیگر خیالات کی تخلیق کے لئے "تنقید" کی قابلیت ایک لازمی عنصر ہے۔ تنقیدی کوشش کا کام سوسائٹی میں صحیح اور حقیقی خیالات

پھیلانا ہے، اس کا قول ہے کہ سچائی کا احساس ہی زندگی کا احساس ہے۔

"The touch of truth is the touch of Life."

یعنی حقیقت اور زندگی لازم و ملزوم ہیں۔ اسی لئے شاعر کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ "دنیا" اور "انسانی زندگی پر دقیق نظر رکھتا ہو۔

میتھو آرنالڈ کے نظریہ کے مطابق تنقید نگار کے لئے غیر جانبدار اور غیر متعصب ہونا ضروری ہے اس کا فرض ہے کہ وہ زندگی کے اعلیٰ ترین مدارج سے واقف ہو اور کسی قسم کی غرض یا مقصد سے متاثر ہوئے بغیر اور تعریف و تخریب کے پہلوؤں سے بالاتر ہو کر عوام میں ان مدارج کی اشاعت کرے اُس نے ایک لفظ میں ایک کلّیہ یہ بتا دیا ہے کہ "تنقید قطعی بے لوث ہو" یہی کلّیہ ہر تنقید نگار کے لئے شمعِ راہ کا کام دے سکتا ہے۔

(۲)

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے اردو ادب میں "تنقید نگاری" ایک نئی چیز ہے۔ مشرقی علوم کا یہ کوئی قدیم فن نہیں ہے۔ اس کے دو سبب پیش کئے جاتے ہیں، اول یہ کہ مشرقی تہذیب کا ایک اہم عنصر "مروت" ہے اس لئے کسی ادبی کارنامہ پر کوئی دلشکن رائے ظاہر کرنے کا رواج نہیں ہوا، ہمدردی اور پاسداری ہمارے بزرگوں کے اخلاق کا ضروری جزو تھا۔ اسی لئے وہ تنقید کو پسند نہ کرتے تھے کہ اس کی وجہ سے لوگوں کے عیوب سطح عام پر آجاتے ہیں۔ بہر حال وجہ جو بھی ہو واقعہ یہ ہے کہ اردو ادب میں تنقید نگاری مفقود تھی۔ انگریزی کی تقلید میں اس کا رواج ہوا، سب سے پہلے مولانا محمد حسین آزاد نے "آبحیات" میں شاعروں کے کلام پر تنقید کی، مگر ان کی رائیوں میں ایک طرف فطری شوخی اور ظرافت کو دخل تھا، دوسری طرف تعصب اور جانبداری کی وجہ سے حقیقی تنقید نگاری کا حق ادا نہ ہو سکا۔

درحقیقت آزاد کے پیش نظر تنقید نگاری کا کوئی صحیح مفہوم بھی نہ تھا اور نہ تنقید کا کوئی معیاری نمونہ ہی ان کے روبرو موجود تھا، جن سے وہ اُصول تنقید اخذ کر سکتے۔ البتہ صرف ایک غیر زبان کا مبہم سا خاکہ ضرور ان کے دماغ میں تھا۔ چنانچہ انھوں نے اسی کو عملی جامہ پہنا دیا بہر نوع آبحیات اردو میں تنقید نگاری کی پہلی کوشش تھی، مگر اس نے نہ تو شاعری کا کوئی اہم نظریہ

لہ The rule may be summed up in a word —— Disintersedness.

پیش کیا اور نہ تنقید کا کوئی خاص معیار ہی قائم کیا۔ البتہ شاعروں کے تذکرے میں بہترین افسانہ نگاری کا حق ادا کر کے آزاد نے "آبحیات" میں اپنی طبع رواں کے خوب خوب جوہر دکھائے ہیں

آزاد کے بعد دو شخصیتیں اور قابل ذکر ہیں۔ مولانا الطاف حسین حالی اور مولانا شبلی نعمانی، مولانا حالی کے پیش نظر "تنقید" کا صحیح مفہوم تھا جس کو انھوں نے "یادگار غالب" اور مقدمۂ شعر و شاعری میں پیش کیا "یادگار غالب" میں مولانا حالی نے غالب کی اصلی شخصیت پیش کرنے اور ان کی شاعری کی پوری اہمیت ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے، اور "مقدمۂ شعر و شاعری" میں اُنھوں نے شاعری کی تعریف اور شاعر کے لازمی خصوصیات بیان کی ہیں۔ دونوں کتابوں میں انھوں نے حقیقی معنیٰ میں تنقید نگاری کے اصول کو پیش نظر رکھکر رائے زنی کی ہے۔ اُن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ غیر جانبدار اور بے لاگ تھے۔ اُنھوں نے غالب کی خوبیوں اور اوصاف کے ساتھ اُن کے نقائص اور عیوب بھی بیان کر دیئے ہیں جس سے ناظرین کو غالب کی اصلی حالت کا اندازہ ہو جاتا ہے، اور کوئی بات پس پردہ نہیں رہ جاتی۔ جس سے تنقید میں سُقم پیدا ہو سکے۔

مقدمۂ شعر و شاعری میں مولانا حالی شاعری کی مکمل تعریف پیش کرنے سے قاصر رہے اور ایک حقیقی شاعر کا معیار قائم نہ کر سکے۔ اُن کا قول ہے کہ شاعر کا ذہن فوٹو کے کیمرہ سے مشابہت رکھتا ہے۔ اُس پر ایک واقعہ کا جو عکس پڑتا ہے اُس سے ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے، اور یہ کیفیت اس کو اس کے متعلق اپنے دلی جذبات بیان کرنے پر مجبور کرتی ہے، مگر اس نظریہ میں یہ نقص ہے کہ فوٹو کی پلیٹ ایک ہی وقت میں دو مخالف و متضاد مناظر پیش نہیں کر سکتی۔ اس کے خلاف اُردو شاعر (قافیہ پیمائی سے مجبور ہو کر) ایک ہی وقت میں دو مختلف جذبات پیش کر دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے اُردو شاعر کا دماغ فوٹو پلیٹ کے مشابہ نہیں ہوتا ہے۔

اس سے قطع نظر حالی نے جو کچھ لکھا ہے اس خیال سے لکھا ہے کہ عوام اس سے مستفیض ہو سکیں اور شاعری میں حسب ضرورت اصلاح پیدا ہو جائے۔ اُن کا مقصد یہ بھی تھا کہ نیچرل شاعری کی طرف عوام کا رجحان ہو۔

مولانا شبلی کی ذات مجموعۂ کمالات تھی، وہ ادیب، نقاد۔ سیرت نگار، فلسفی اور شاعر سبھی کچھ تھے، اور اُنھوں نے کامیابی کے ساتھ تنقید نگاری کا حق ادا کیا۔

اُن کی کتابیں "موازنۂ انیس و دبیر" اور "شعر العجم" بہت مبسوط اور جامع ہیں۔ شعر العجم میں

انھوں نے انتہائی تحقیق اور غور و فکر کے بعد شاعری کی تعریف، شاعر کے خصوصیات؛ اصناف شاعری اور ایرانی شاعری پر تبصرہ لکھا ہے، اور اس میں شک نہیں کہ اُنھوں نے فارسی شاعروں کا بے لاگ اور غیر جانبدارانہ تبصرہ کرکے عوام کو فارسی شاعری سے روشناس کر دیا ہے۔ گو بعض اوقات وہ ذاتیات میں پڑ کر اپنی ذاتی پسندیدگی کے رَو میں بہہ جاتے اور جانبدارانہ پہلو اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ بات مُسلّم میں اس لئے شمار نہیں ہو سکتی کہ ہر شخص کو اپنی پسند اور ناپسندیدگی کے اظہار کا حق حاصل ہے۔ مولانا شبلی نے شعرالعجم میں نہایت فاضلانہ طریقہ پر ایرانی شاعری اور شعراء کے ماحول کو پیش کیا ہے۔ جس سے اُس زمانہ کی شاعری کا پس منظر بھی سامنے آجاتا ہے مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ وہ اپنی اس متانت اور غیر جانبداری کو موازنہ انیس و دبیر میں قائم نہ رکھ سکے۔ اور دبیر کی اس قدر مذمت کی کہ انھیں مرثیہ گوئی میں کوئی جگہ ہی نہ دی۔ تاہم مجموعی طور پر اُردو زبان مولانا شبلی کے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی، کیونکہ انھوں نے اُردو ادب کی ایک بڑی کمی کو پُورا کر دیا ہے۔

مولانا شبلی کے بعد اُن کے شاگرد مولانا عبدالسلام ندوی نے بھی مولانا کے اُصول کو مدنظر رکھتے ہوئے اُردو شاعری کا تبصرہ کیا اور اکثر اُردو شاعروں کے کلام کے عیوب اور اوصاف کو منظر عام پر پیش کر دیا۔

دوسرے تنقید نگاروں میں مولانا وحیدالدین سلیم کا نام بھی قابل ذکر ہے، اُنھوں نے اُردو زبان کو سدھارنا چاہا، اور اس کو عام اور ہر دلعزیز بنانے کی کوشش کی۔ اُن کا خیال تھا کہ اُردو اُس وقت تک عوام میں مقبول نہیں ہو سکتی جب تک کہ عملی طور پر یہ ذہن نشین نہ کر لیا جائے کہ اُردو ایک مشترکہ زبان ہے۔ اسی بنا پر انھوں نے اس خیال کو دُور کرنے کے لئے کہ اُردو مسلمانوں کی زبان اور ان کی تہذیب و تمدن کا آئینہ ہے۔ اس زبان کا نام "ہند المانی" تجویز کیا تھا۔ کیونکہ اس ملک کی دونوں قومیں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے دوش بدوش تمدن و معاشرت کے منازل طے کر رہے ہیں، اور اردو پر دونوں کو یکساں حق حاصل ہے۔

مولانا وحیدالدین سلیم کا سب سے بڑا کارنامہ اُن کا مضمون "ہمارے شاعروں کی نفسیات" ہے۔ جس میں انھوں نے یہ واضح کیا ہے کہ مروّجہ اُردو شاعری صرف قافیہ پیمائی ہے۔ اُردو شاعروں کے ہاں واقعی قافیہ خیال پر مقدم ہے، اور وہ عموماً کسی خاص جذبہ سے متاثر ہو کر

شعر نہیں کہتے بلکہ اُن کے لئے خاص چیز "قافیہ" ہے اور اسی قافیہ کی مناسبت سے وہ خیال "باندھ" کر لاتے اور شعر موزوں کرتے ہیں۔

اُن کا خیال ہے کہ "غزل" اُردو شاعری کی تخریب کا باعث ہے، کیونکہ غزل میں شاعر مسلسل طور پر اپنے شاعرانہ خیالات کے اظہار سے مجبور رہتا ہے، اور ردیف و قافیہ کا التزام شاعر کے خیالات کے ادا ہونے میں سدّراہ ہوتا ہے۔ لہذا یا تو مثنویاں لکھی جائیں یا ایسی نظمیں ہوں جس میں قافیہ اور ردیف کا التزام بالکل نہ ہو۔ ان کے مضامین "سودا کی ہجویہ نظمیں" "میر کی شاعری" "عہد میر کی زبان" "اُردو شاعری کا مطالعہ" اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ مولانا موصوف نے انتہائی باریک بینی اور نکتہ رسی سے شاعروں کے کلام کا جائزہ لیا اور اس کے متعلق غیر جانبدارانہ رائے کا اظہار کیا ہے۔

مصنف روح تنقید نے تنقید کے اُصولوں کو کتابی شکل میں پیش کیا ہے، اور انھیں اصولوں کو پیش نظر رکھکر اُردو شاعری سے بحث کی ہے۔ قادری صاحب نے شاعری کی ایک جامع تعریف پیش کی ہے اور مختلف اصنافِ سخن پر فاضلانہ تبصرہ بھی کیا ہے۔ مگر ان سے ایک اہم غلطی یہ ہوگئی کہ اُنھوں نے غیر ملکی شاعری کی خصوصیات کو مشرقی شاعری کے ماحول سے ہم آہنگ کرنا چاہا، اس لئے وہ مشرقی شاعروں کی طبیعتوں کا صحیح اور مکمل جائزہ نہ لے سکے۔ البتہ انھوں نے اصول تنقید کو نئے طریقے پر یکجا کرکے اُردو میں ایک مفید کتاب ضرور پیش کردی ہے

اس وقت اُردو ادب میں تنقید نگاری کا کافی مسالہ جمع ہو رہا ہے۔ اکثر ادیبوں کو تنقید و تبصرہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو گیا ہے، جس سے اُمید ہے کہ آئندہ چل کر یہ زبان بھی دوسری زبانوں کے ہم پلّہ ہو جائے گی۔ تنقید سے ہمارے ادیبوں کے نظریے بھی درست ہو رہے ہیں۔ بعض بعض اُردو رسالوں میں بھی تنقید کتب کا خاص اہتمام ہے اور مولانا شبلی سے لیکر اب تک اُردو میں تنقید نگاری میں خاص ترقی ہوئی ہے جس کا فائدہ ہماری آئندہ نسلیں بخوبی اُٹھائیں گی۔

جہانِ فانی

فانیِ جہاں، یہ عکس فانی کیا ہے؟ شبنم کا فریب دُرفشانی کیا ہے؟
پھولوں کی ہنسی ہے شادمانی کیا ہے پانی کا اُبال ہے جوانی کیا ہے؟

مہ جوش ایم۔ اے

جگر پارے

تازہ کلام حضرت جگر مرادآبادی

سودا جو آپ ہے سر میں وہ سودا ہی اور ہے — اس کا چمن ہی اور ہے صحرا ہی اور ہے

لیلیٰ آب و گِل تو ہزاروں ہزار ہیں — مجنوں ہے جس کی روح وہ لیلیٰ ہی اور ہے

یہ حسنِ رنگ رنگ بھی کچھ کم نہ تھا، مگر — کیا کیجئے کہ دل کا تقاضا ہی اور ہے

جو حسنِ شش جہت سے نہ سیراب ہو سکی — محسوس اب ہوا وہ تمنا ہی اور ہے

صورت میں یہ فروغ یہ جذب و کشش کہاں؟ — در پردہ کوئی شاہدِ معنیٰ ہی اور ہے

خود حسن استعارہ ہے جس کے جمال کا — وہ جانِ حسن، حسن سراپا ہی اور ہے

جس سے کہ مطمئن ہو مری فطرتِ بلند — شاید وہ حسن و عشق کی دنیا ہی اور ہے

(۲)

جو مسرتوں میں خلش نہیں جو اذیتوں میں مزا نہیں — ترے حسن کا بھی قصور ہے میری عشق ہی کی خطا نہیں

مرے جذبِ عشق پہ تہمتیں مجھے بے بسی کا گلہ نہیں — ترے جبرِ حسن کی خیر ہو مرے اختیار میں کیا نہیں

جسے میں بھی خود نہ بتا سکوں مرا راز دل ہے وہ راز دل — جسے غیر دوست سمجھ سکے میرے ساز میں وہ صدا نہیں

یہ طریق جد ہے خوب تر مگر آہ واعظ بے خبر — اسے سازگار ہو زہد کیا جسے معصیت بھی روا نہیں

میرا ذوق بھی مرا شوق بھی ہے بلند سطحِ عوام سے — ترا ہجر بھی ترا وصل بھی مرے دردِ دل کی دوا نہیں

مرے درد میں یہ خلش کہاں مرے سوز میں یہ تپش کہاں — کسی اور ہی کی پکار ہے مری زندگی کی صدا نہیں

وہ ہزار دشمنِ جاں سہی، مجھے پھر بھی غیر عزیز ہے — جسے خاکِ پا تری چھو گئی وہ برا بھی ہو تو برا نہیں

مرے شعر میں ہیں نزاکتیں مری نظم میں ہیں لطافتیں
مرے فکر میں کہیں لے جگر ادب کثیف کی جا نہیں

(۳)

ناصح فسانہ اپنا ہنسی میں اڑا گیا — خوش فکر تھا کہ صاف یہ پہلو بچا گیا

اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہلِ دل — ہم وہ نہیں کہ جن کو زمانہ بنا گیا

دل بن گیا نگاہ، نگہ بن گئی زباں — آج اک سکوتِ شوق قیامت ہی ڈھا گیا

میرا کمالِ شعر بس اتنا ہے اے جگر — وہ مجھ پہ چھا گئے میں زمانے پہ چھا گیا

تبرّکاتِ شاد

(حضرت شاد عظیم آبادی کی ایک غیر مطبوعہ غزل[1])

بھول نہ اُس کو دُھن ہے جدھر کی، چونک مسافر رات نہیں ہے،
شکل نمایاں اب ہے سحر کی، چونک مسافر رات نہیں ہے

آنکھیں ملتے صحنِ چمن میں جھوم کے اُٹھے نیند کے ماتے
دیکھ صبا نے آکے خبر کی، چونک مسافر رات نہیں ہے

نیلے نیلے رنگ کے اُوپر بڑھتی ہی جاتی اب ہے سفیدی
ہوگئی رنگت زرد قمر کی، چونک مسافر رات نہیں ہے

پنکھ پکھیرو خواب سے چونکے، سب نے خوشی کے نعرے مارے
آئی صدا مرغانِ سحر کی، چونک مسافر رات نہیں ہے

زور نہ طاقت سنگ نہ ساتھی، پاؤں سے اپنے آپ ہے چلنا
تجھ پہ ہے بھاری راہ سفر کی، چونک مسافر رات نہیں ہے

کلامِ حسرت

تم کو اِس بات کا خیال نہیں — ورنہ جینا مرا محال نہیں
حُسن کو صبر پر ہے کیوں اصرار — عشق پابندِ اعتدال نہیں
تم سے رکھنا ہے کون دل کو عزیز — تم نے یہ کیا کہا کہ ٹال نہیں
حالِ دل سُن کے ہم سے کیوں ہو خفا — ایسی کو کہیں زوال نہیں

دامنِ شعرِ عشق پر حسرت
داغ اہمال و ابتذال نہیں

---

[1] حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم کے یہ اشعار یادگار اُن کے لائق نبیرہ حضرت ارشاد کاظمی کے لطف و توجہ سے مرحمت رسالہ کئے جاتے ہیں

کلامِ میرؒ[1]

۳

(از میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی)

نہیں وہ قید الفت میں۔ گرفتاری کو کیا جانے
تکلف برطرف، ہمسری یاری کو کیا جانے
(بے مہری)

مرتا ہے کیوں تو ناحق یاری برادری پر
دنیا کے سارے ناتے ہیں جیتے جی فلک کے
(جیتے جی تلک کے)

آج میرے خون پر اصرار ہر دم ہے تمھیں
آئے ہو کیا جانیے تم کس کے سنگارے ہوئے
(سنکارے ہوئے)

نوٹ: سنکارے ہوئے یعنی بھڑکائے ہوئے۔

تنک گرم تو سنگریزے کو دیکھا
(دیکھ)
نہاں اس میں بھی شعلۂ طور ہے

یہ گرد راہ اوسکی یارب کس اور سے اوٹھیگی
سو سو غزال ہر سو آنکھیں لگا رہا ہے

رہتے ہیں داغ اکثر نان و نمک کی خاطر
جینے کا اس سیتمن میں اب کیا مزہ رہا ہے
(ستم)

دل زخم خوردہ کی اور اک لگا دیئے
(کے) (لگائی)
مداوا کیا خوب گھائل کا اپنے

یہ فنِ عشق ہے آوے اسی طینت میں جس کی ہو
(نسے)
تو زاہد پیر نابالغ ہے بے تہ تجھکو کیا آوے

ہمارے دل میں آنے سے تکلف کو غم بیجا ہے
(غم کو بیجا ہے)
یہ دولت خانہ ہے اُسکا وہ جب چاہے چلا آوے

ضبطِ سرشک خونیں سے جی کیوں نہ کہ شاد ہو
اب دل کی طرف تو موکا سارا بہاؤ ہے
(تو ہو)

میر شوریدہ سر کے جو لوگوں نے کیا پوچھا تو کہے ہے کیا
(مرا) (کچھ گلہ)
جسے کہتے ہیں صاحبو یہ وہی تو خانہ خراب ہے
(جسے میر)

---

[1] اس سلسلے کے پہلے مضامین زمانہ جون، جولائی و دسمبر ۲۰ء اور اپریل ۲۱ء میں ہدیۂ ناظرین کئے گئے ہیں۔ ہمارے قابل دوست نے کلام میر کی صحت اپنے ذہن رسا سے کی ہے۔ (ا-ن)

ہر یک سے کہا نیند میں پر کوئی نہ سمجھا — شاید کہ مرے حال کا قصہ عربی ہے
ہند

عزلت سے نکل شیخ کہ تیرے لیے تیار — کوئی ہفت گزی مسیح کوئی دہ وجبی ہے
سیخ

روشن ہے جل کے مرنا پروانے کا ولیکن — اے شمع کچھ تو کہہ تو تری بھی تو زباں ہے
تو بھی کچھ کہہ تیرے بھی تو

گرم ہیں شور تجھ حسن کے بازار کئی — رشک سے جلتے ہیں یوسف کے خریدار کئی
گرم ہیں شور سے تجھ حسن کے

نوٹ :۔ تجھ حسن کے یعنی تیرے حسن کے

اپنے کوچے میں نکلیو تو سنبھالے دامن — یادگار مژۂ میر وہاں خار کئی
ہیں واں

رکھیو قدم سنبھل کے کہ نو جان تا نہیں — مانند نقش پا یہ سر راہ کون ہے
تو جانتا نہیں

ایسا اسیر خستہ جگر میں سنا نہیں — ہر آہ میر جس کی ہے جان کان ہے
جانکاہ ۔ کون ہے

کیا میر تو روتا ہے پامالیِ دل ہی کو — ان لونڈوں نے تو دلی سب سر پہ اٹھالی ہے
دلی

نمازِ چمن وہی ہے بلبل سے گو خزاں ہے — ٹہنی جو زرد بھی ہے سو شاخِ زعفراں ہے
نازِ چمن

باغ و بہار ہے وہ، میں کشتِ زعفراں ہوں — جو لطف اک ادھر ہے تو یاں بھی اک سماں ہے
سو رنگ اس طرف ہیں

اس فن کو کوئی بے تہ کیا ہو مرا معارض — اول تو میں سند ہوں پھر میری یہ زباں ہے
میں

تیرا خرام دیکھے تو جا سے نہ ہل سکے — کیا جی نظرو کا جو ترے آگے چل سکے
تندرو

نوٹ :۔ معلوم ہوا کہ دلی میں بھی ہلنا کو ہلنا بولتے تھے

کیا اس غریب کو سر سایۂ ہما — جو اپنی بیدماشی سے مکھی نہ جھل سکے
بیدماغی

ہے جائے حیف بزم جہاں مل لے اے پتنگ — اپنے اوپر جو کوئی گھڑی ہاتھ ہل سکے
مل

مرے اس رگ کے مرجانے سے وہ غافل ہے کیا جانے — گزرنا جان سے آسان، بہت مشکل ہے کیا جانے
(رگ کے)

طرف ہونا مرا مشکل ہے میر اس شعر کے فن سے — یوں ہی سودا کبھی ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے
(میں)

کب تلک جی رو کے جفا ہووے — آہ کریئے کہ ٹک ہوا ہووے
(کب تلک جی رُکے۔ خفا ہووے)

مر گئے ہم تو مر گئے تو جیئے — دل گرفتہ تری بلا ہووے
(ہم مرے تو مرے۔ جیئے تو جیئے)

تھے شہر میں اے پری جتنے سیانے — سب ہو گئے ہیں شور ترا سُن کے دوانے
(اے رشکِ پری)

کب کب مری عزت کے لئے ہو ٹک پاس — آئے بھی جو ہو تو مجھے مجلس سے اُٹھانے
(آئے ہو)

پایا ہے نہ ہم نے دلِ گم گشتہ کو اپنے — خاک اُسکی سرِ راہ کی کوئی کب تئیں چھانے
(ہی) (×)

ہم جگر سوختہ کی جی میں جو آوے تو ابھی — دردِ دل ہو کے فلک تجھ میں سرایت کیجئے
(ہم جگر سوختوں کے)

لطفِ قبائے تنگ پہ گل کا بجا ہے ناز — دیکھی نہیں ہے اون نے ترچھی بھیس رہی
(تری چولی پھنس رہی)

ہر گھڑی رنجش۔ ایسی باتوں میں — کوئی اخلاص و پیار رہتا ہے
(×)

آج کل بے قرار ہم بھی ہیں — بیٹھ جا۔ چلتے ہار ہم بھی ہیں
(چلنے ہار)

مدعی کو شراب۔ ہم کو زہر — عافیت دوستدار ہم بھی ہیں
(عاقبت)

نوٹ:۔ عاقبت بمعنی آخر۔ آخر ہم بھی تو دوست ہیں دشمن نہیں ہیں۔

یہ جان اگر بید مولہ کہیں دیکھے — باقی ہے کسی موئے پریشاں کی نشانی
(بید مولہ)

صبر بھی کریئے بلا پر میر صاحب جی کبھو — جب نہ تب رونا ہے کڑھنا، یہ بھی کوئی ڈھنگ ہے
(ہی)

آج تیری گلی سے ظالم میر — لہو میں شور بور آیا ہے
(لوہو)

جی میں تھا عرش پہ جا نہ دیئے تکیہ لیکن | بستر خاک ہی میں اب تو بچھایا ہم نے
بارے گل میں جا مرغ چمن سے مل کر | خوبی گل کا مزہ خوب اُڑایا ہم نے
بے کلی سے دل بیتاب کی مرگزرے تھے | سو تہ خاک بھی آرام اُٹھایا ہم نے
عرصہ ہے تنگ چال نکلتی نہیں ہے اور | جو چال پڑتی ہے سو وہ بازی بات کی
کھلکھلا کم کم کلی نے سیکھا ہے | اُس کی آنکھوں کی نیمخوابی سے
کام تھے عشق میں بہت پہ میر | ہم ہیں فارغ ہوئے شتابی سے

(دیوان دوم)

ہر ذی حیات کا تو سبب ہے جو حیات کا | نکلے ہے جی ہی اُس کے لئے کائنات کا
اشجار خامہ ہو ویں خامہ و آب سیہ بحار | لکھنا نہ تو بھی ہو سکے اُس کی صفات کا
مَیں مردماں کو آنکھیں دیا ہے خدا نے وے | سرمہ کریں ہیں وہ کے تری خاک دھول کا
برسوں سے مری اُس کی یہی رہتی ہے صحبت | تیغ اُس کو اُٹھانا تو سر مجھکو جُھکا جانا
اُس آفتاب بن مجھے کچھ سُوجھتا نہیں | گریے ہی اپنے دن ہیں تو ایک شب ہے کیا
قصہ تو مختصر تھا وے طول کو کھچا | اعجاز دل کے شوق سے اطناب سا ہوا
چل باغ میں بھی سوتے سے اُٹھکر کبھو کہ گل | تک تک کے راہ دیدۂ بیخواب سا ہوا
طرفہ آتش خیز سنگستاں ہے دل | متبس یاں سے ہے شعلہ طور کا
بلا سے اُسکی آنکھ جو پڑتی ہے دس جاگہ | ہمارا حال تو مد نظر نہیں رکھتا

یہ چھپڑ دیکھو ہنس کے رُخ زرد پر مرے — کہتا ہے میر رنگ تو اب کچھ نکھر چلا
دیکھو

وہ دل کہ تیرے ہوتے رہے تھے بھرا بھرا — اب اُس کو دیکھئیے تو ہے اِک گھر خراب سا
رہے تھا

سرہی چڑھا رہے ہے ہر اک بادہ خوار کے — ہے شیخ شہر یا کوئی جن ہے چڑھا ہوا
بڑھا ہوا

اُس کام وجان ودل سے جو کوئی جدا ہوا — دیکھا پھر ہم نے خاک میں اُس کو ملا ہوا
اس کام جان ودل سے — دیکھا پھر اُس کو خاک میں ہم نے

اِس قدر آنکھیں چھپاتا ہے تو اے مغرور کیا — ٹک نظر ادھر نہیں کہ اس سے ہے منظور کیا
ٹک نظر ادھر۔ نہیں کہ

نوٹ :۔ ذرا ادھر بھی نظر کر اور نہیں تو یہ کہہ تجھے کیا منظور ہے۔

وصل و ہجراں سے نہیں ہے عشق میں کچھ گفتگو — لال دل کی چاہئیے ہے یاں قریب و دُور کیا
لاگ دل کی

دیکھ ہنستے آنکھ میری ہنس کے بولا کل وہ شوخ — یہ نہیں ابتک ہوا منھ کا ترے ناسُور کیا
یہ نہیں ابتک ہوا

نوٹ :۔ یہ نہیں ہوا یعنی اچھا نہیں ہوا۔

یاہیں اپنے حال میں مجبور سب کو ہم — کہنے کو اختیار ہے پر اختیار کیا
پلتے ہیں

میرے مُردے سے بھی وہ چونکے ہے — اب تلک مجھ میں جان ہے گویا
چھنکے ہے

چاہیئے جیتے گزرنے اُس کا نام — منھ میں جبتک زبان ہے گویا
جپنے

پھر آج یہ کہ آنی کل شب یہ رہ گئی ہے — سوتا نہ رہتا ٹک تو قصہ ہی مختصر تھا
پھر آج کی کہانی

کیفی ہو کیوں تو ناز سے پھر کرم رہ ہوا — برسوں سے صوفیوں کا مصلیٰ تر نہ ہوا
گرم رہ — نہ تہ ہوا

نوٹ :۔ کیفی ہو یعنی مست ہو کر ناز سے چلنے لگا۔

کہتے ہیں ضائع کیا اپنے تئیں — میر تو رونا تھا یہ کیا کر گیا
دانا

ہر خستہ مرا خواہاں یک زخمِ دگر تھا — کی مشقِ ستم تو نے پر خون نہ کر آیا
(ترا — زخمِ دگر کا تھا)

بالفعل تو ہے قاصد محو اُس خط و گیسو کا — ٹک جیتے تو ہم پوچھیں کیا بیخبر آیا
(لے کے خبر آیا)

نوٹ :۔ ٹک جیتے یعنی ذرا حواس میں آئے تو پوچھیں کیا خبر لایا۔

صنعت گریاں ہم نے کیں سیکڑوں یاں لیکن — جسے کبھو وہ ملتا ایسا نہ ہنر آیا
(جس سے)

چمن میں جا کے جو میں گرم صف بار ہوا — گل اشتیاق سے تیرے گلے کا ہار ہوا
(گرم وصفِ یار ہوا — میرے)

بہت دنوں سے درونی میں اضطراب سا تھا — جگر تمام ہوا خون تب فرار ہوا
(درونہ — تب قرار ہوا)

نوٹ :۔ درونہ بمعنی دل

شکیب میر جو کرتا تو وَقر رہ جاتا — اُدھر کو جا کے عبث یہ جیب خوار ہوا
(یہ غریب)

ایک دل کو ہزار داغ لگا — اندرونی میں جیسے باغ لگا
(اندرونہ)

خونی کمینچہ بند خوباں کے — خوب بادھونگا گرد باغ لگا
(خوب کھینچوں گا — باندھوں گا — داغ)

ہم نہ جانا اختلاط اس طفل بازیکو شکار — گرم بازی آ گیا تو ہم کو بھی بہلا گیا
(طفل بازی کوش کا)

ہو گئے تحلیل سب اعضا مرے پا کر گذار — رفتہ رفتہ ہجر کا اندوہ مجھکو کھا گیا
(گداز)

جور و ستم اُٹھاتے ہی اُسکے پڑینگے شیخ — مسجد میں گر وہ عاشق بیدرد آ گیا
(اٹھانے ہی — باقی بیداد)

کہہ وہ شکستہ پا ہمہ حسرت نہ کیونکے جائے — جو نہ ایک دن تیری گلی میں چلا پھرا
(کیونکہ — جو ایک دن نہ تیری)

آنسو گرا نہ رازِ محبت کا پاس کر
میں جب سے ابر برسوں تئیں دل بھر پھرا
(جیسے — دل بھرا پھرا)

شاعر

(مسٹر جگدیش سہائے سکسینہ بی اے۔ ایل ایل۔ بی شاہجہاں پور)

ازل سے ہے فطرت مری عاشقانہ　　پیامِ محبت ہے میرا فسانہ
مرے جام میں وہ مئے آتشیں ہے　　تصدق ہے جس پر شرابِ مغانہ
لبِ آبِ کوثر کبھی پی تھی میں نے　　وہی میرے سر میں ہے کیفِ شبانہ
نگاہِ حقارت سے مجھکو نہ دیکھو　　کہ میں درحقیقت ہوں فخرِ زمانہ
صدائے ملائک ہے آواز میری　　سرودِ بہشتی ہے میرا ترانہ
میں وہ بلبلِ خوشنوائے چمن ہوں　　کبھی جس کا طوبیٰ پہ تھا آشیانہ

قلمرو میں داخل مری لامکاں ہے
فلک سے بھی اونچا مرا آستاں ہے

سخن میرا صافی ہے مشرب ہے عالی　　کہ سینہ ہے میرا کدورت سے خالی
دکھاتا ہوں میں حسنِ معنی کے جلوے　　نہ سمجھو کہ دنیا ہے میری خیالی
عدم کے کوئی مجھ سے اسرار پوچھے　　کہ بستی ہے وہ بھی مری دیکھی بھالی
بہت غمزدہ پہلے رہتی تھی دنیا　　سمجھتی تھی میں ہوں فنا ہونیوالی
نہ یہ چہچہے تھے عنادل کے لب پر　　نہ گلزار میں تھی یہ رنگیں جمالی
دیا جب پیامِ بقامیں نے آکر　　تو ہستی کے چہرے پہ آئی بحالی

جہاں سر جھکائے مرے آستاں پر
کہ احسان میرا ہے سارے جہاں پر

نہ اورنگ و افسر نہ زر بخشتا ہوں　　زمانہ کو ذوقِ نظر بخشتا ہوں
جو محروم ہیں دولتِ رنج و غم سے　　انھیں آنسوؤں کے گہر بخشتا ہوں
گدازِ محبت کی خواہش ہے جن کو　　انھیں داغہائے جگر بخشتا ہوں
ستارے بھی امیدوارِ کرم ہیں　　کہ ذروں کو تابِ قمر بخشتا ہوں

مجھے پیار کرتے ہیں مظلوم و بیکس
کہ آہوں کو ان کی اثر بخشتا ہوں

مرے در پہ حاضر ہوں شیخ و برہمن
کہ میں عشق نوعِ بشر بخشتا ہوں

ازل سے محبت کا ہے پاس مجھکو
غریبوں کے غم کا ہے احساس مجھکو

جو کہتے نہیں ہیں کچھ اپنی زباں سے
میں واقف ہوں ان کے بھی دردِ نہاں سے

نہیں ہے جنھیں رخصتِ آہ و زاری
فغاں کر رہے ہیں وہ میری زباں سے

فرشتو! یہ خلاقِ عالم سے کہہ دو
مجھے اُنس ہے خستگانِ جہاں سے

مرے دل کو اَزبر ہے اُن کی کہانی
کہ ہے ملتی جُلتی مری داستاں سے

نصیبوں کو اپنے دُعا دے رہا ہوں
کہ ناشاد ہوں گردشِ آسماں سے

کچھ ایسے بھی ہیں داغ میرے جگر پہ
جو خوشتر ہیں گلہائے باغِ جناں سے

ملی ہے مجھے ہستیِ غیر فانی
کہ دل میں ہے پنہاں غمِ جاودانی

جہاں جب تلک ہے میں گاتا رہونگا
بہشتی ترانے سناتا رہوں گا

حقیقت کے چہرے سے پردہ اُٹھاکر
حقیقت کا جلوہ دکھاتا رہوں گا

کدورت گہِ عالمِ آب و گِل میں
شرابِ محبت پلاتا رہوں گا

غریبوں کی مجبوری و بیکسی پر
لہو چشمِ تر سے بہاتا رہوں گا

رہے گا نہ یہ قصرِ سرمایہ داری
کہ بنیاد اس کی ہلاتا رہوں گا

زمانہ کی حالت نہ بدلے گی جب تک
میں روتا رہوں گا رُلاتا رہوں گا

کوئی حد بھی ہوتی ہے ضبطِ فغاں کی
ضرورت ہے اب انقلابِ جہاں کی

آنکھوں سے خونِ دل کے دریا بہا دیے ہیں
پھر بھی ہے نامکمل شرحِ غمِ نہانی

دونوں طرف کشاکش دونوں کھنچے کھنچے سے
ان کو بھی کچھ شکایت مجھکو بھی بدگمانی

کیا پھر وہی فسانہ دوہرائے گا زمانہ؟
کیوں یاد آ رہی ہے بیتی ہوئی کہانی

اے عشق اس حجابِ آخر کو بھی اُٹھا دے
اب میری زندگی ہی پردہ ہے درمیانی

[illegible]

مرزا غالب کی بے اعتدالیاں

(از مسٹر اقبال انصاری، ایم۔ اے)

تذکروں کے مطالعہ کے بعد ہندوستانی شعراء مثلاً فیضی، بیدل۔ خان آرزو۔ قتیل۔ واقف۔ فاخر۔ مظہر وغیرہ ہندوستانی شاعروں کے کمال فن پر ہم فخر کرتے ہیں۔ لیکن جب ہم عود ہندی میں ان کے متعلق مرزا غالب کے خیالات پڑھتے ہیں تو ہمارا حوصلہ بڑی حد تک پست ہو جاتا ہے۔ خان آرزو ہی کے متعلق ایک طرف سرو آزاد، خزانۂ عامرہ۔ عقد ثریا۔ چمنستان الشعراء۔ ریاض الشعراء سفینۂ خوشگوار اور مجمع النفائس رکھیے اور دوسری طرف غالب کی اس عبارت کو ملاحظہ فرمائیے "وارستہ سیالکوٹی نے خان آرزو کی تحقیق پر سو جگہ اعتراض کیا ہے اور ہر اعتراض بجا ہے"۔ اس جملہ کے وزن نے اگرچہ تحقیق کی روشنی میں اُن کی ادبی عظمت کو نہیں گھٹایا ہے، پھر بھی ایک فاضل مصنف کی زبان سے نکلنے کی وجہ سے اُسے بہت کچھ سُبک ضرور کر دیا ہے۔ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ خان آرزو بے مایہ ہیں، فارسی دانی سے نابلد ہیں تحقیق میں غلطیاں کی ہیں، تو بھی اُن کے لئے یہی شرف کیا کم ہے۔ وہ فاضل جیّد تھے، اُردو فارسی عربی میں شاعری کرتے تھے، صاحب تصنیفات تھے اور فارسی دانی میں شیخ علی حزیں، والہ داغستانی اور قزلباش خاں اُمید سے ٹکر لیتے تھے۔ سات دیوان اساتذۂ ایران مثلاً بابا فغانی، شفیعائے اثر کمال خجندی وغیرہ کے جواب میں کہے، ساقی نامہ ومثنویاں، حکیم سنائی، ملا نوعی، زلالی، خوانساری اور ظہوری، ترشیزی کے جواب میں لکھیں، ایران اُردو کا ایک بھی ایسا شاعر نہ پیدا کر سکا جو یہاں کے کسی شاعر کا ہم رتبہ کہا جا سکتا۔ مرزا معز فطرت اور قزلباش خاں اُمید ضرور ریختہ کی طرف متوجہ ہوئے لیکن اس میں جو اظہار کمال کیا ہے وہ یہ ہے، فطرت:-

از زلفِ سیاہِ تو بدل دُھوم پڑی ہے   در گلشن آئینہ گتا جوم پڑی ہے

قزلباش خاں اُمید:-

در و دیوار سے اب صحبت ہے   ما یہ بن گھر میں عجب صحبت ہے
تیری آنکھوں کو دیکھ ڈرتا ہوں   الحفیظ الحفیظ کرتا ہوں

اُمید کے اشعار فطرت کے مقابلہ میں زیادہ صاف و سلیس ہیں، لیکن یہ اُردو کا وہ زمانہ تھا جبکہ یہ اپنے شباب پر پہونچ چکی تھی۔ سودا و میر تقی کے اشعار کے سامنے ان کی کیا حقیقت ہے۔ ایرانیوں کی کاوشوں نے یہ چند شعر پیش کئے اور ادھر فیضی، غلام علی آزاد، بیدل و خان آرزو کے ضخیم دیوان دیکھئے اور فیصلہ کیجئے کہ شعرائے ایران قابلِ مدح و ستائش ہیں یا شعرائے ہندوستان۔

یہاں اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ میں اُردو کا اسکالر نہیں اور نہ غالب سے بغض و عناد رکھتا ہوں، غالب کا معتقد ہوں، اُن کے کمال فن کا معترف ہوں، اُن کی عزت اُسی طرح کرتا ہوں جیسے باسویل، ڈاکٹر جانسن کی کرتا تھا۔ مگر جہاں باسویل نے ڈاکٹر جانسن کو Monarch of Literature (تاجدار ادب) کہا ہے۔ وہاں اُن معمولی معمولی واقعات اور غلطیوں کا بھی ذکر کیا ہے جو اس ادیب سے وقتاً فوقتاً ہوتی رہی ہیں، اور یہ سب اس لئے کہ جانسن کی پوری تصویر ہمارے سامنے آجائے۔ آئیے اسی نظریہ کے ماتحت ہم بھی غالب کا مطالعہ کریں۔ یہاں پر ہم غالب کے چند خطوط پیش کرتے ہیں، جن سے اُن کے تنقید کا نظریہ اور بے اعتدالیوں کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

"فارسی کی تکمیل کے واسطے اصل الاصول مناسبت طبیعت کی ہے، پھر تتبع کلام اہل زبان، لیکن نہ قتیل و واقف و شعرائے ہندوستان کہ یہ اشعار سوائے اس کے کہ اُن کو موزونیِ طبع کہیئے اور کسی تعریف کے شایاں نہیں ہیں۔ نہ ترکیب فارسی نہ معنی نازک ہاں الفاظ فرسودہ و عامیانہ جو اطفال دبستاں جانتے ہیں اور جو متصدی نثر میں درج کرتے ہیں وہ الفاظ فارسی یہ لوگ نظم میں خرچ کرتے ہیں۔ جب رودکی و عنصری و خاقانی و رشید وطواط اور اُن کے امثال و نظائر کا کلام بالاستیعاب دیکھا جائے اور اُن کی ترکیبوں سے آشنائی بہم پہونچے اور ذہن آعوجاج کی طرف نہ لے جائے تب آدمی جانتا ہے کہ ہاں فارسی یہ ہے۔"

اِن سطروں میں تکمیل فارسی کے لئے دو چیزیں ضروری قرار دی گئی ہیں، تتبع اہل زبان و مناسبت طبیعت اور آگے چل کر قتیل وغیرہ کی "موزونیِ طبع" کو مان بھی لیا، تو اب مناسبت طبیعت کی بحث بہت کچھ کم ہو گئی۔ غالباً مرزا صاحب کا خیال مناسبت طبیعت سے فطری ذوق ہو اور یہ بھی واقف و قتیل کے لئے مسلّم ہے۔ واقف کے متعلق تو یہاں تک ایرانی کہا کرتے تھے "زاغ ہند زبانِ طوطی از کجا یاد گرفت" اب تتبع اہل زبان باقی رہ گیا تو اس کے متعلق بھی تذکرے بتاتے ہیں

کہ قتیل و واقف نے نہایت اہتمام کے ساتھ حصول زبان کی طرف توجہ کی۔ قتیل اٹھارہ برس کے سِن سے محمد باقر شہید اصفہانی کی زیرِ نگرانی و تربیت رہے اور شہید ہی نے مرزا صاحب کے لئے قتیل تخلص پسند کیا۔ (عقد ثریا)

واقف کے تتبع کے متعلق سفینۂ ہندی قلمی پٹنہ لائبریری کا جائزہ لیجیے اور اُس میں خود اُن کی شہادت سُنئے کہ ابتدا میں وہ خوشگو اور آفریں لاہوری سے اصلاح لیتے تھے لیکن اُن کی اصلاحیں واقف کو پسند نہیں تھیں، لہٰذا انھوں نے دیوانِ سعدی و خسرو کو سامنے رکھکر مشقِ سخن شروع کی۔ سعدی تو مسلّمات میں سے ہیں اب رہ گئے امیر خسرو تو اُن کی زباندانی، اہلیت و عظمت کے خود مرزا غالب معترف ہیں اور فرماتے ہیں:-

"خسرو کیخسرو قلمرو سخن طرازی ہے یا ہم چشم نظامی گنجوی و ہم طرح سعدی شیرازی ہے۔"

جہاں تک اُصول تنقید کا تعلق تھا مرزا صاحب کے معیار پر قتیل و واقف پورے اُترتے ہیں، اُس پر بھی وہ تمام ہندوستانی شعرا کو ہیچ و پوچ بتاتے ہیں۔ اگر ہندوستانی شاعر ایسے ہی جاہل تھے تو جال انجو شیرازی اور سروری کاشی اُن کے اشعار سند میں نہ پیش کرتے۔ قتیل و واقف نے تو تتبع کیا اور مرزا صاحب نے موردِ الزام ٹھہرایا۔ اگر یہ فارسی الفاظ میں تصرف بھی کرتے تو بیجا نہ تھا اس لئے کہ ایرانیوں نے بیسیوں عربی اور ہندی الفاظ پر تصرف کیا ہے لہٰذا "تصرف صاحب قدرتانِ ہند در فارسی چرا جائز نباشد" (شمر) اور قتیل و واقف کے صاحب قدرت و قادر الکلام ہونے میں کوئی شک نہیں۔ عنصری و خاقانی و طوا ط کی مثال تو مرزا صاحب نے دی لیکن شہادت و توضیح سے یکقلم گریز کیا ہے۔ اس کو تعصب کے سوائے اور کیا سمجھا جائے۔ ایک ہی موقع نہیں ہے۔ غالب کے اکثر و بیشتر خطوط سے اسی رویّہ کا پتہ چلتا ہے، وہ ایک ادبی ڈکٹیٹر کی طرح فوراً فیصلہ دیدیتے ہیں اور شہادت و صاحت سے ہمیشہ اغماض کرتے ہیں۔ وارستہ و خان آرزو ہی کا معاملہ لے لیجئے کہ اُس نے خان آرزو کا نام احترام سے لیا ہے۔ حاکم لاہوری کی غزلوں پر خان موصوف نے جو اعتراضات کئے تھے اُن کا جواب دیا ہے اور بہت سے اعتراضات کو صحیح بھی تسلیم کیا ہے۔ آزاد بلگرامی نے خزانۂ عامرہ میں دو تین شعر پیش کئے ہیں جن میں اُنھوں نے بھی خان آرزو کے بعض اعتراضات کو صحیح مانا ہے مصطلحات میں بھی وارستہ نے خان آرزو پر کافی اعتراضات کئے ہیں لیکن اس کے بھی اسباب ہیں، ایک تو یہ کہ وہ ہندیوں کا کلام سندی نہیں سمجھتا تھا، دوسرے یہ کہ وہ شیخ علی حزیں کے سلک ارادت میں داخل ہوچکا تھا۔ باینہمہ اپنے قول کی تصدیق میں اُس نے وہی اشعار پیش کئے ہیں جو خان آرزو نے چراغِ ہدایت میں دیئے تھے

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ وارستہ کا تمامی زندگی کا کارنامہ اور بنائے شہرت یہی مصطلحات ہے اور خان آرزو کی ذات مختلف علوم وفنون میں اس سے کئی گنا زیادہ ہے اور کئی گنا بے مثل اُن کی تصنیفیں ہیں۔ وارستہ نے خان آرزو پر اعتراضات کرکے اپنے کو کامیاب بنایا مگر یہ بھی یاد رہے کہ اس کام کے لئے اس نے خان آرزو ہی کی ذات کو منتخب کیا۔ اگر سراج اللغت وچراغ ہدایت نہ لکھی گئی ہوتیں تو غالباً آج وارستہ کے مصطلحات کا وجود بھی نہ ہوتا۔ اور جس فن کے خان آرزو مخترع ہوئے اس کا یہ مکمل اور یوں بھی اصل ونقل کا جو فرق ہونا چاہیئے وہ ظاہر ہے۔ اس کے علاوہ اس کے تمام اعتراضات صحیح نہیں ہیں۔ بلکہ بہت سے غلط بھی ہیں۔ اب مرزا غالب کا یہ کہنا کہ سیکڑوں اعتراضات ہیں اور ہر اعتراض بجا ہے بالکل قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے جس میں استدلال سے کوئی واسطہ نہیں رکھا گیا ہے پھر وارستہ کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ " جہاں اپنے قیاس پر جاتا ہے منھ کی کھاتا ہے" مرزا صاحب اگر اُن مقامات کو پیش کرتے جہاں اُسکو منھ کی کھانی پڑی تو سمجھ میں بھی آتا۔ اس کے علاوہ اپنے متقدم کے لئے یہ لہجہ اختیار کرنا بہت رکیک معلوم ہوتا ہے۔

حضرت صاحب عالم صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے مرزا صاحب لکھتے ہیں:-

...اب ایسا ہوا کہ جب تک فرید آباد کا کھتری دیوانی سنگھ متخلص بہ قتیل جس کو حضرت نے مرحوم لکھا ہے اُس کی تصدیق نہ کردے تب تک اس کا کلام قابل استناد نہو۔ قتیل اساتذہ سلف کے کلام سے قطعاً آشنا ہی نہیں۔ اس کے علم فارسی کا ماخذ اُن لوگوں کی تقریر ہے کہ نواب سعادت علی خاں کے وقت میں ممالک مغربی کی طرف سے لکھنؤ آتے اور ہنگامہ آرا ہوتے بیشتر ان میں کشمیری یا کابلی وقندھاری تھے اور اگر احیاناً کوئی عامۂ اہل ایران سے بھی ہو تو تقریر اور ہے اور تحریر اور ہے۔ اگر تقریر بعینہ تحریر میں آیا کرے تو خواجہ بقراط اور شرف الدین علی یزدی اور ملا حسین واعظ کاشفی اور طاہر وحید نثریں کیوں خون جگر کھایا کرتے۔ وہ سب طرح کی نثریں جو لالہ دیوانی سنگھ قتیل متوفی نے بہ تقلید اہل ایران لکھی ہیں نہ رقم فرمایا کرتے.... میں اور آپ بیٹھیں اور اس کے خرافات پڑھتے جائیں تب معلوم ہوگا کہ یہ کتنا لغو گو اور فارسی دانی سے کتنا بیگانہ ہے"

مرزا غالب کسی بات کے لئے جو کلیہ قائم کرتے ہیں اُس پر ثابت قدم نہیں رہتے۔ عود ہندی ہی میں ایک جگہ پر عرفی وابوالفضل کے مباحثہ میں عرفی کی فتح تسلیم کرتے ہیں، اور یہ ثبوت پیش کرتے ہیں کہ اُس نے جب سے ہوش سنبھالا۔ گھر کے بڈھوں بوڑھیوں سے فارسی سنی۔ یہاں پر شستی ہوئی

تقریر زباں دانی کے لئے لازمی قرار دی گئی، اور پھر سطور بالا میں یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ تحریر اور ہے اور تقریر اور ہے۔ یہ کلیہ بھی بالکل صحیح نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ خسرو و فیضی و سرخوش اہل ایران کی تحریروں ہی کا نتیجہ ہیں۔ خان آرزو اپنی کتاب مثمر میں مرکب الفاظ کی بحث میں اہل زبان سے جو غلطیاں ہوتی ہیں، اس پر اضافہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

"چوں مرکبات را معنیہائے خاص باشد و عوام را بر نکات ایں اطلاع نبود بعضے از فضلائے ہند یکے از شعرائے ایران گفتہ کہ ملائے شما فارسی را از پیرزالہائے خود آموختہ اند و ما از فصحائے شما مثل خاقانی و انوری و مراد فاضل مذکور ہمیں مرکبات است کہ در معنیہائے مختلف گونہ گوں آمدہ و عوام اسرار آں را نمی دانند پس تربیت کردۂ خواص بہتر از تربیت کردۂ عوام۔"

اب رہ گئی یہ بحث کہ قتیل پر غیر زباں دانوں نے اثر ڈالا تو یہ بھی وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ باقر شہید اصفہانی کی تربیت موجود ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ مرزا جیسے باکمال شاعر نے کیونکر ایسا غیر منصفانہ تبصرہ کیا ہم جانتے ہیں کہ مرزا صاحب کے اعتراضات و تبصرے اُن کے دل کا غبار اور مخالفین کی ہنگامہ آرائیوں کا نتیجہ ہیں، اور ایسی صورت میں قتیل پر اعتراضات کر کے وہ اپنے دل کو تسکین دے سکتے تھے۔ لیکن ہمیں اُن کے یہاں کچھ اور ملتا ہے جو مرزا ایسے مہذب انسان کے لئے کسی طرح بھی شایانِ شان نہیں۔ خیر اگر قتیل کو اُنھوں نے گالیاں دیں تو اُن کی آڑ لیکر تمام ہندوستانی ادب و شعر کو کیوں معرضِ تلف میں ڈال دیا۔ غیاث الدین۔ عبد الواسع ہانسوی و واقف وغیرہ کے متعلق کیوں اس قدر نا ملائم الفاظ لکھے۔ یہ تو اُن کے ہمعصر بھی نہیں تھے کہ ان کی ہرزہ سرائیوں کو معاصرانہ رقابت کا نتیجہ کہہ کر نظر انداز کر دیا جائے معاصرین کے ساتھ رشک و رقابت کے واقعات سے شعرا و علما سب کے تذکرے بھرے پڑے ہیں۔ اور آخر میں یہ بات بھی رہ جاتی ہے کہ آپ کو گالی دینے کا حق ہی کیا ہے۔ تنقید کا کوئی معیار گالیوں کو جائز نہیں رکھ سکتا۔ اس کے علاوہ غالب سے قبل کی صدیاں اس چیز کی متحمل نہیں تھیں کہ ہم اسے سوسائٹی کا نتیجہ کہہ دیں۔ اٹھارھویں صدی کو لیجئے، اس میں وارستہ و خان آرزو سے معرکے ہوئے۔ آزاد و خان آرزو ایک دوسرے پر اعتراضات کرتے تھے اور سب کچھ ہوتا تھا لیکن دامن تہذیب کو ہاتھ سے کہیں بھی جانے نہیں دیا گیا ہے۔ اور ہم کو اُن کی تحریروں میں آج بھی ایک لفظ ایسا نہیں ملتا ہے جو مرزا صاحب کے ارشادات کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکے۔ شیخ علی حزیں کی ایک ذات ضرور ملتی ہے جن سے خان آرزو کے تعلقات بہت کچھ کشیدہ ہو گئے تھے۔ لیکن وہ بھی مرزا صاحب ہی جیسے تھے۔

اور اُنھوں نے بھی خان آرزو کو بہانہ بنا کر تمامی ہندوستان کی ہجو کر ڈالی اور خود شعرا کو صلواتیں سُنائیں۔ لیکن آپ خان موصوف کا تمام کلام دیکھ ڈالئے، ایک لفظ بھی علی حزیں کی شان کے خلاف نہ ملے گا۔ کوشش سے بھی آپ کو شیخ کے متعلق اس سے زیادہ سخت الفاظ نہ ملیں گے کہ "شاعر روستائی ایران" کہا گیا ہو۔ جہاں ادب وتہذیب کا یہ لحاظ رکھا گیا ہو وہاں قتیل کے متعلق کھتری بچہ اُلّو کا پٹھا "عبدالواسع کے لئے "گھا گھس اُلّو"، اور غیاث الدین کے لئے "معلم فرومایہ" وغیرہ کے معزز القاب سننا کون پسند کرے گا؟

یقیناً کسی شخص کی ادبی زندگی اس کے اخلاق سے بالکل علیحدہ چیز نہیں سمجھی جا سکتی ہے۔ غالب کے اخلاق اپنے بیوی، بھائی کے ساتھ عمدہ رہے جس کا ثبوت اُردوے معلی میں موجود ہے لیکن معاصرین وغیر معاصرین وہندوستانی شعرا کے ذکر میں اخلاق وہمہ دانی کے دعوے نے اُن کی شعریت وادبیت کے پلّہ کو بہت ہلکا کر دیا ہے۔ اور ہم یہ دیکھکر گھبراتے ہیں کہ انھوں نے اپنی اس ذہنیت سے ہندوستانی ادب کو کس حد تک نقصان پہونچایا ہے۔ ہم کو مجبور ہو کر کہنا پڑتا ہے کہ غالب جہاں اپنی شاعرانہ نکتہ سنجیوں کے باعث احترام کا مستحق ہے، وہاں اپنے نامناسب رایوں کی وجہ سے حد درجہ قابل الزام بھی ہے۔ اس قسم کی بے اعتدالیاں آپ کو غالب کے یہاں اکثر ملتی ہیں، جو کبھی تنقید کے غلط اصول اور کبھی گالی کے بھیس میں ہیں۔ بہرحال ہم تو یہی کہیں گے کہ اگر مرزا صاحب خود بینی وخود پرستی کو دور کر سکتے تو آج تنقید کے وہ شاہکار ہمارے سامنے ہوتے جس کی دنیا میں نظیر نہ ملتی۔ لیکن افسوس ہے غالب جذبات کے سیلاب میں بہہ کر خدا معلوم کہاں سے کہاں چلے گئے۔ آخر میں ہم عرفی کے چند اشعار پر اس مضمون کو ختم کرتے ہیں، جن کو اُس نے غالباً ایسے ہی حضرات کے لئے کہے ہیں:۔

بچشم مصلحت بنگر مصاف نظم ہستی را	کہ ہر خارے درآں وادی درفش کاویاں بینی
زگرد رغبت خاطر فرو شو دیدۂ فطرت	اگر خواہی کہ حسن خار و گل یک یک عیاں بینی
تو سرہا دیدۂ بر شعلہ می تابی بہ خاکستر	بہ بینی حسن خاکستر چو در رو غنگراں بینی
تو از ملک عراقی واثہ گوں کن عادت پیشیں	اگر خواہی کہ حسن رونق ہندوستاں بینی

التماس کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اپنے حلقۂ احباب میں زمانہ کی توسیع اشاعت کی کوشش فرمائیں اگر آپ زمانہ کی ادبی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو اپنے علم دوست احباب سے اسکی خریداری کی سفارش میں کیوں پس وپیش کرتے ہیں؟

مینیجر زمانہ

اعترافِ کفر

(از منشی تلوک چند محروم ، بی ۔ اے)

ششدرِ جلوۂ نیرنگیِ یزداں ہوں میں — چمنِ وحدتِ باری کا غزلخواں ہوں میں
بلکہ حیرانِ بتِ آئینہ ساماں ہوں میں — کافرِ دیر نشیں نزدِ مسلماں ہوں میں

یہ اگر کفر ہے؟ اِس کفر پہ نازاں ہوں میں

بت نیرا کار مرا، دہر صنم خانہ مرا — دل رہا حسرتیِ جلوۂ جانانہ مرا
لادوا درد کی رُوداد ہے افسانہ مرا — زندگی درد ہے اور طالبِ درماں ہوں میں

یہ اگر کفر ہے؟ اِس کفر پہ نازاں ہوں میں!

ذرّے ذرّے سے عیاں پرتوِ انوار اُس کا — پھر بھی ممکن نہیں اے وائے کہ دیدار اُس کا
خالقِ پاک وہ ہے، میں ہوں پرستار اُس کا — اُس کے الطاف کا شرمندۂ احساں ہوں میں

یہ اگر کفر ہے؟ اِس کفر پہ نازاں ہوں میں!

گرچہ روپوشِ عناصر میں ہے معبود مرا — گنگ ہے اور نہ بتِ سنگ ہے مسجود مرا
منزلِ عرش سے بھی دُور ہے مقصود مرا — جانبِ منزلِ مقصود شتاباں ہوں میں

یہ اگر کفر ہے؟ اِس کفر پہ نازاں ہوں میں!

زیرِ محراب جو ہوتا ہے کبھی عشوہ فروش — شیخ کہتا ہے مجھے کافرِ زنّار بدوش
میں ہوں خاموش کہ بے حرفہ ہے یہ جوش و خروش — خاطر آزردہ ہوں اس سے، نہ پریشاں ہوں میں

یہ اگر کفر ہے؟ اِس کفر پہ نازاں ہوں میں؟

قائلِ اعمال کے آئینِ مسلّم کا ہوں — اپنے افعال سے ڈرتا ہوں اگر ڈرتا ہوں
عملِ خیر کی توفیق کا میں جویا ہوں — ہوں خطاکار، گنہگار ہوں، پشیماں ہوں میں

یہ اگر کفر ہے؟ اِس کفر پہ نازاں ہوں میں

آرزو ہے کہ دل و دست و زباں سے میرے — کسی جاندار کو آزار نہ ہرگز پہنچے
نظر آتی ہے رضاے حق کی اہنسا میں مجھے — جس کو آزار سے نفرت ہے وہ اِنساں ہوں میں

یہ اگر کفر ہے؟ اِس کفر پہ نازاں ہوں میں!

کیسی صورت جو قفس کی نظر آتی ہے مجھے
یہ کسی بلبلِ نالاں کی رُلاتی ہے مجھے

خونِ پروانہ کی بُو شمع سے آتی ہے مجھے
اِس لیئے گرمیِ محفل سے گریزاں ہوں میں

یہ اگر کفر ہے؟ اِس کفر پہ نازاں ہوں میں!

برہمن سے ہے عبث شیخ حرم کا جھگڑا
جو حقیقت پہ نظر ہو تو ہے بیجا جھگڑا

دم بخود سُن کے ہوں دونوں کا پُرانا جھگڑا
کہ دلبستانِ خموشی کا سخنداں ہوں میں

یہ اگر کفر ہے؟ اِس کفر پہ نازاں ہوں میں!

مجازِ حقیقت

(جناب مائل نقوی، سکرٹری انجمن ترقی ادب بھوپال)

کون ہے رازِ دارِ خلوتِ راز
سب ہیں پردے حقیقت اور مجاز

کر دیا دل کو وقفِ سوز و گداز
مرحبا عشق اے غریب نواز

اُن کے قدموں پہ ہے جبینِ نیاز
کوئی دیکھے نیازمند کے ناز

ہیں تصور سے اُن کے راز و نیاز
اے شبِ ہجر تیری عمر دراز

اللہ اللہ یہ لطافتِ عشق
درد بھی اب نہیں ہے محرمِ راز

کوئی ہمدم نہیں شبِ فرقت
اِک غمِ یار ہے مگر دمساز

جب چمن میں کلی چٹکتی ہے
صاف آتی ہے آپ کی آواز

میری غم کوشیوں کو کیا جانیں
ساکنانِ حریمِ نعمت و ناز

پھر ہے محبوب کیوں ہلالِ عید
اُن کے ابرو کے گر نہیں انداز

بیخود از چلا ہوں اُن کی طرف
سازِ دل پر ہیں نغمہ ہائے حجاز

عشق و دیوانگیِ ذوقِ جمال
حُسن مستور راز اندر راز

مائلِ خستہ اور یہ جوشِ کلام
حضرتِ عشق کے ہیں سب اعجاز

تنقیدِ حیات کی کوشش

(۳)

(از پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری ایم اے)

(۵۱) سنگ و آہن بے نیازِ غم نہیں   دیکھ ہر دیوار و در سے سر نہ مار

ایک دن اپریل کی خوشگوار اور خنک آمیز گرمی کی رات میں کسی نامعلوم جذبہ کی رَو میں بستر آرام چھوڑ کر ٹہلنے لگا۔ مجھ ایسی بے اختیار بے چینی پیدا ہوئی کہ دیوار سے سر ٹکرانے کو جی چاہنے لگا نہ جانے کس عالم میں تھا کہ اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی اچانک پیدا ہوا کہ کہیں میرے سر ٹکرانے سے در و دیوار کو چوٹ نہ لگ جائے۔ بیدل نے بھی اس پتھر کو جس سے اُسے سخت ٹھیس لگی تھی نرمی اور نزاکت کا خواب بنایا تھا۔ اور غالب نے بے ستون کو خواب شیریں لکھا ہے۔ لیکن بیدل اور غالب کے اشعار کی طرف میری توجہ میرے فاضل دوست مجنوں گورکھپوری نے اس وقت دلائی جب میں اپنا شعر کہہ چکا تھا۔ میرا شعر جہاں تک سنگ و آہن کی نزاکت کا تعلق ہے بیدل اور غالب سے ملتا ہے لیکن دوسرے مصرع نے اس میں ایک نئی شان پیدا کر دی ہے۔ یہاں پر یہ عرض کر دینا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ بیدل غالب اور میرا مفہوم عقل اور واقعیت کے خلاف نہیں ہے۔ سنگ و آہن گلاب کی پنکھڑی نہ ہوں اور اپنی جگہ غم سے بھی بے نیاز ہوں۔ لیکن ان کی بھی ایک قدر اور اہمیت ہے اور ہر شے کی طرف ہمارا رویہ مہذب ہونا چاہیئے۔ ہر شے سے ہمیں اپنی حساس زندگی کی وحدت کا احساس ہونا چاہیئے۔ مادے ہی کی لطافتوں سے ہماری رگیں اور ہمارا خون ہمارے دل و دماغ کی ساخت ہوئی ہے۔ عبرانی تصور یا مجازیت میں ثنویت (Dualism) کا عیب ہے اسی لئے اس تصور میں نہ نرمی ہے نہ گہرائی اور نہ مجازیت کے نام سے درسِ عمل میں کوئی معنویت۔

(۵۲) قید کیا رہائی کیا ہے ہمیں سے ہر عالم   رُک گئے تو زنداں ہے چل پڑے بیاباں ہے

(۵۳) خواب گاہ میں تیری ہم ہیں نیند کے جھونکے   اِک سکونِ بے پایاں ہستی پریشاں ہے

بقول اصغر گونڈوی "جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے"۔ انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں کے لئے رُک جانا پیامِ اسیری ہے اور چل پڑنا پیامِ آزادی۔ لیکن اس چل پڑنے میں بہت سے عقائد اور محبوب روایتوں کو الوداع کہنا پڑتا ہے۔

دوسرے شعر میں عشقیہ اندازِ بیان کی چاشنی دے کر اس راز کی طرف اشارہ ہے کہ انسانیت کا درد رکھنے والوں کے دکھتے ہوئے بے چین دلوں اور اُن کے چین کی نیند نہ سو سکنے ہی کا نتیجہ ہے کہ دنیا سکھ کی نیند سوتی ہے۔ ان کی ہستی پریشان دنیا کے لئے اک سکونِ بے پایاں ہے۔

(۵۴) ہر ذرّے کو وحشت میں بیاباں نہ سمجھ لے ہر قطرے کو گھبرا کے سمندر نہ بنا دے

ہر ذرّہ اور ہر قطرہ کو لامحدود کہا جا سکتا ہے، لیکن کھوٹے کھرے کی پرکھ ضروری ہے۔ مذہب سیاست، سماجی نظام سب کو خیر و برکت کا لامحدود بیابان اور سمندر نہ سمجھ لینا چاہیئے۔ عملی زندگی میں ردّ و قبول وفاداری اور غدّاری رفاقت اور مقابلہ سب کی ضرورت ہے۔ محض وجد کرنے سے کام نہیں چلتا۔ تخریب اور انقلاب بھی عملی زندگی کے اہم پہلو ہیں۔ نئی دنیا کی جولانگاہ مرتب کرنے میں ایسی وحشت اور گھبراہٹ نہ ہونی چاہیئے کہ ہم ہر ذرّے کو بیابان سمجھ لیں اور ہر قطرے کو سمندر مان لیں بہر حال اقرار کے ساتھ ساتھ عملی زندگی میں انکار کی بھی ضرورت ہے۔

(۵۵) غمِ حیات وہی دورِ کائنات وہی جو زندگی نہ بدل دے وہ زندگی کیا ہے

تقدیر پر بھروسہ کرنے والی یا راضی بہ رضا رہنے والی زندگی اور قانون و نظام (Law & order) والی زندگی، ہر حال میں اللہ کا شکر کرنے والی زندگی، انفرادی اور اجتماعی زندگی کا غلط تصوّر رکھنے والی زندگی، تبدیلی اور انقلاب سے نفرت کرنے والی یا ڈرنے والی زندگی موت کے برابر ہے جو زندگی نہ بدل دے وہ زندگی کیا ہے۔

(۵۶) کر عہدِ گذشتہ کو شریکِ غمِ امروز خاکسترِ ماضی سے کچھ اُٹھتا ہے دھواں بھی

مجھے بسا اوقات اپنی موجودہ زندگی کی غمگینی کے احساس کے ساتھ ساتھ گذشتہ زندگی اور اُس کے دُکھ سُکھ بھی یاد آ گئے۔ اور یہ محسوس کر کے دل دُکھ سا گیا کہ اب میں اپنی عمرِ رفتہ سے بے تعلق ہو چکا ہوں۔ ماضی سے یہ بے تعلقی مجھے ایک نفسیاتی خود غرضی معلوم ہوتی ہے کیونکہ ماضی بالکل مٹ جانے والی چیز نہیں ہے۔ "خاکسترِ ماضی سے کچھ اُٹھتا ہے دھواں بھی"

یہ شعر انھیں اثرات کے ماتحت موزوں ہوا ہے، اگرچہ جب سے ہوش سنبھالا غم ہی غم میں زندگی کٹی۔ اور آج بھی غم ہی کی زندگی ہے۔ لیکن حال کے غم میں اتنی محویت نہ ہونا چاہیئے کہ پُرانی حالت بھول جائے۔ اس لئے کم از کم عمرِ رفتہ کو جس کی خاکستر سے اب بھی دھواں اُٹھ رہا ہے غمِ امروز میں شریک کر لینا چاہیئے۔ سیاسی اور اجتماعی زندگی کو عہدِ گذشتہ کی تاریخ میں شریک کر لینا چاہیئے۔ ایسا کرنا رجعت پسندی نہیں بلکہ ترقی پسندی ہے۔ ورڈسورتھ کہتا ہے کہ میں

چاہتا ہوں کہ میری زندگی کے دن ایک فطری طہارت کے زیر اثر باہم منسلک رہیں۔

(۵۷) کہاں ہر ایک سے بارِ نشاط اُٹھتا ہے بلائیں یہ بھی محبت کے سر گئی ہوں گی

میں اپنے آپ کو غمگین پا کر اکثر یہ سوچا کرتا تھا کہ جو لوگ خوشحال اور تندرست ہیں، بڑے عہدوں پر ہیں، جاہ و ثروت کے مالک ہیں، جن کی خانگی زندگی بھی ناکامیاب نہیں نظر آتی اور جو عشق کی جانکاہ آزمایشوں سے محفوظ ہیں، اور جن کی زندگی میں ہریالی ہی ہریالی نظر آتی ہے وہ کتنے خوش اور بشاش ہوں گے۔ پچھلے پچیس برسوں سے بڑے غور سے ایسے لوگوں کے چہروں کا مطالعہ کرتا رہا۔ مگر مجھے تو ان کے چہروں پر ایک سُوناپن نظر آیا اور یہ بسا اوقات کھسیائے ہوئے سے دکھائی دیئے۔ کبھی کبھی ایک احمقانہ اطمینان بھی ان کے چہروں پر نظر آیا مگر وہ حقیقی خوشی نہ تھی رفتہ رفتہ مجھے معلوم ہوا کہ غمگین نہ ہونا خوش ہونا نہیں ہے، جیسے زہر نہ کھانا اچھی اور صحت بخش غذا کھانے کے برابر نہیں ہے۔ ۱۹۳۱ء میں اسی مشاہدہ سے متاثر ہو کر یہ شعر کہا گیا تھا، اسکے سال ڈیڑھ سال بعد یہ دو تین شعر ہوئے ہیں:۔

جو غم شناس نہیں وہ خوشی کو منہ نہ چڑھائیں لئے رہیں وہ زمانے میں اپنی بے فکری

رُکے نہ سانس مگر اُن کے دم بھی گھٹتے جائیں جو با فراغ ہیں کچھ پائیں زندگی کا مزا

جس پیکرِ نشاط کی رگ رگ دُکھی نہیں

اس کی خوشی کو غور سے دیکھو خوشی نہیں

میں نے ان لوگوں میں غم اور خوشی دونوں سے تڑپ جانے کی صلاحیت نہیں پائی۔ انگریزی فلسفی جان اسٹوارٹ مِل کا یہ مقولہ بھی ان اشعار کے کہتے وقت ذہن میں تھا کہ جس میں غمزدہ ہونے کی صلاحیت ہے اس میں خوش ہونے کی بھی صلاحیت ہوتی ہے، مگر غور و فکر کی دوسری منزلوں پر جا کر میں نے یہ سمجھا کہ زندگی غم اور خوشی دونوں سے بالاتر ہے، لیکن اس مقام پر پہونچنے کے لئے ضروری ہے کہ غم اور خوشی کے جھگڑوں سے ایک بار بلکہ کئی بار زندگی کی بنیادیں ہل جائیں۔ مگر یہ بات صرف عشق سے حاصل ہوتی ہے۔ نشاط کا بار بھی محبت ہی کو اُٹھانا پڑتا ہے" بلائیں یہ بھی محبت کے سر گئی ہونگی"۔ رہا حُسن اُس کی حالت بھی سُن لیجئے:۔

آج دُکھتے ہیں حُسن کے شانے کچھ گراں ہو چلا ہے بارِ نشاط

(۵۸) اشک سا دیدۂ انجم میں جھلک جاتا ہے یہ بھی اک راز ہے اِنسان کی قسمت کی طرح

کسی روز جب رات زیادہ گزر گئی ہو، زمین سے آسمان تک سناٹا ہو کچھ دیر تک ستاروں

کو دیکھلے ، وہ بھید جو بیان سے باہر ہے مگر جو انسان کی قسمت میں چھپا ہوا ہے اُس کی کچھ جھلک وہاں دکھائی دیتی ہے۔

(۵۹) کھلیں گے راز جہاں مشتِ خاکِ آدم سے اسی غبار میں اک کارواں بھی پنہاں ہے

موجوداتِ عالم میں غیر جاندار اور جاندار سب میں انسان ہی کی ہستی ایسی ہے جو خود بھی نئی ہوتی جا رہی ہے اور آفاق کو بھی نیا کرتی جا رہی ہے۔ صرف انسان کا وجود انقلاب پذیر ہے۔ دیگر موجودات بھی غیر شعوری طور پر انسان سے ہم آہنگ ہو رہے ہیں، لیکن اصول ارتقا صحیح معنوں میں انسانی زندگی میں کارفرما ہے۔ انسان کی فطرت بدل رہی ہے اور اس تغیر کی کوئی حد و انتہا نہیں مشتِ خاکِ آدم میں جو کارواں پنہاں ہے اُسی سے تمدن کے رنگا رنگ مظاہرے ہوتے ہیں۔

(۶۰) خستگیِ مہر و ماہ کی مت پوچھ کون پیمانہ ہے جو چُور نہیں

اصغر گونڈوی فرماتے ہیں:۔

اگرچہ ساغرِ گل ہے تمام ترلے بود چھلک رہی ہے چمن میں مگر شرابِ وجود

یہ شرابِ وجود وہ پگھلی ہوئی آگ ہے کہ مہر و ماہ کے پیمانے بھی اس کو برداشت نہیں کر سکتے اور وہ بھی اس سے خستہ اور چُور نظر آتے ہیں۔ شرابِ وجود ہمیشہ سے چھلک رہی ہے اور ہمیشہ چھلکتی جائے گی۔ لیکن یہ شراب پیمانہ گداز اور پیمانہ شکن ہے۔

(۶۱) شورشِ کائنات ہے خاموش موت ہے زندگی کے دوش بدوش

موجودہ نظامِ عالم انقلاب سے دوچار ہو رہا ہے۔ تمام تجارتی اور سیاسی زور و شور اُس پُراسرار سکوت کا پتہ دے رہا ہے جس کے بطن میں انقلاب تھرتھرا رہا ہے۔ سرمایہ داری اور ملوکیت کے تمدن کا یہ آخری دَور ہے، جس کی شورش انگیز زندگی کے دوش بدوش اس تمدن کی موت بھی چپ چاپ چل رہی ہے۔ یہ سناٹا طوفان کے قبل کا سناٹا ہے۔

(۶۲) تیری تقدیر ترے ہاتھ میں ہے شاملِ جبر اختیار بھی ہے

یہ شعر انفرادی زندگی کے لئے نہیں کہا گیا ہے، کیونکہ ہزارہا آدمیوں میں مشکل سے کوئی ایک اس حالت میں ہوتا ہے کہ انفرادی حیثیت سے اپنی زندگی بدل سکے۔ مگر اجتماعی زندگی پر یہ شعر بخوبی صادق آتا ہے۔ دنیا بھر کے مزدور پیشہ اگرچہ نظام سرمایہ داری کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے رہے ہیں مگر انقلاب کر کے اپنی تقدیر بدل سکتے اور دنیا میں اشتراکی راج قائم کر سکتے ہیں۔

(۶۳) ہاتھ ملتی آ رہی ہے موت بھی زندگی سی زندگی تو نے نہ کی

موت زندگی کی دشمن سمجھی جاتی ہے، حالانکہ یہ تصور بالکل غلط ہے، کیونکہ موت اور زندگی حقیقتاً ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔ جس شخص کو جینا نہیں آیا اُس کی موت بھی خوشی سے نہیں بلکہ جبراً و قہراً ہاتھ ملتی ہوئی آتی ہے، "جیتے مُردوں سے موت کیا لپٹے"

(۶۴) کچھ پوچھ نہ اِس وقفۂ ہستی کی کشاکش کچھ ٹھہری ہوئی موت ہے کچھ عمرِ رواں بھی

یہ شعر ایک نازک احساس کے ماتحت کہا گیا ہے، کبھی کبھی وقفۂ ہستی پر غور کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی اور موت دونوں کچھ ٹھہری ہوئی سی ہیں، بقول میر:-

"دیکھو تو انتظار سا ہے کچھ"

(۶۵) انقلابِ بے مفر ہر گردش و ہر دَور میں اِس زمین و آسماں کو کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

زمین و آسمان ہمارے لئے سامانِ سکون نہیں، کیونکہ وہ ہر لحظہ ایک ایسے انقلاب کا پتہ دیتے ہیں جس سے مفر نہیں۔ ایک دوسرا شعر بھی ملاحظہ ہو:-

تمام انقلاب ہے محال ہے ٹھہر سکے یہ دَورِ آسماں کہیں یہ گردشِ زمیں کہیں

انسانیت کو زندہ رہنے کے لئے وجود کا ایک متحرک تصور ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں ایک اور شعر بھی ملاحظہ طلب ہے:-

کریں تو کس سے کریں راہِ عشق کا شکوہ رُکیں تو پاؤں نہ مانیں چلیں تو منھ کی کھائیں

واقعی بغیر حقیقی توازن پیدا کئے نہ رُکنا ممکن نہ چلنا ممکن۔

(۶۶) موجِ فنا کو کشتیاں چیر گئیں، کہ دیکھتی بحر کی بیکرانیاں غفلتِ ناخدا تو کیا

غفلتِ ناخدا بحر کی بیکرانیاں کیا دیکھتی۔ سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے، غفلت ناخدا نہیں جاتی۔ لیکن کشتیاں بغیر ناخدا کی مدد کے موجِ فنا کو چیر گئیں۔ تعلیم یافتہ اور متمول "قائدانِ اعظم" اور بڑے بڑے "راشٹرپتی" "مسلم کلچر اور ہندو کلچر کا خواب دیکھ رہے تھے۔ جمہور کروڑوں کی تعداد میں کارواں در کارواں بڑھوں کا ایک لاتناہی سلسلہ بن کر اُٹھی، اور سرمایہ داری اور ملوکیت کی موجِ فنا کو چیرتی ہوئی بحر کی بیکرانیوں سے دوچار ہوتی ہوئی ساحل پر آ گئی اور دنیا بھر میں اشتراکی راج قائم کر دیا۔

(۶۷) مبارک نامِ آزادی، سلامت دردِ آزادی سکھایا سو طرح قطروں کو بحرِ بیکراں ہونا

دردِ آزادی کی بدولت قطرے سیکڑوں انداز سے سمندر سے ہم آہنگ ہونا سیکھ

لیتے ہیں۔ بکھری ہوئی بدنصیب اور مظلوم انسانیت آج آزادی کے نام سے آزادی کے
درد سے اُمڈے ہوئے بحرِ بیکراں کی طرح دنیا بھر میں اپنا راج قائم کرنا چاہتی ہے، یہ قطرے
ایک دن بحرِ بیکراں ہو کر رہیں گے۔

(۶۸) مدوائے انقلابِ زندگی ابتک نہیں آیا — زمیں ہونا زمیں کو آسماں کو آسماں ہونا

زمین و آسمان یوں تو رات دن چکر میں ہیں، لیکن جب تک انسانیت میں انقلاب
نہیں ہوتا زمین زمین نہیں ہو سکتی اور آسمان آسمان نہیں ہو سکتا۔ فطرت اور مظاہرِ قدرت
گویا خود انقلاب کے انتظار میں ہیں، یہ انقلاب ہو تو وہ بھی اپنی اصلی تشکل میں نظر آئیں۔

(۶۹) فریبِ ضبط کھا کر موت کو ہستی سمجھ بیٹھے — نہ آیا زندگی کو اضطرابِ جاوداں ہونا

موجودہ نفسیاتی تحلیل (Psycho-analysis) کی رُو سے ضبط و تشدد (Repression)
زندگی کے لئے مضر بلکہ مہلک ثابت ہوتا ہے۔ زندگی ایک اضطراب جاوداں ہے، اس کے ساتھ
ضبط یا زبردستی کر کے جو چھوٹا سا سکون حاصل ہوتا ہے وہ موت کو ہستی سمجھ لینے کے برابر ہے
یہ چھوٹا سا سکون قابلِ اعتبار نہیں ہے اور اسی کی بدولت انسان کا دل بغلی دشمن ثابت ہوتا ہے۔

(۷۰) گوش بر آواز ہونا ہی شکستِ ساز ہے — اِک سکوتِ غم کو ہنگامہ سمجھ بیٹھے تھے ہم

یہ شعر ایک نازک احساس کی ترجمانی کر رہا ہے، ہر صدا اپنی شکست کی آواز ہے، غور سے
سنیئے تو صدائے ساز شکستِ ساز ہے۔ ہم نغمۂ ساز کو ایک ہنگامہ سمجھ بیٹھے ہیں،
حالانکہ وہ حقیقتاً ایک سکوتِ غم ہے، میرا ایک شعر ہے:-

چھیڑنے والے چھیڑ کر سازِ طرب سنا کئے — نغمۂ درد بھی نہیں پردۂ کائنات میں

(۷۱) اللہ رے اضطراب کہ جس اضطراب کا — موجِ فنا بھی اِک اثرِ ناتمام ہو

اضطراب ایک جان لیوا لیکن زندہ چیز ہے، اتنی زندہ کہ موجِ فنا بھی اس کا اک اثرِ ناتمام ہے
اور موت تڑپتی ہوئی زندگی کی ایک جھلک ہے۔

(۷۲) یوں تھرتھرا رہی ہیں رگیں کائنات کی — گویا قریبِ روزِ قیامت ہے ان دنوں

جب انقلاب آنے والا ہوتا ہے تو مناظرِ قدرت بھی تھرتھراتے نظر آتے ہیں۔ جس
"روزِ قیامت" کا یہاں ذکر کیا گیا ہے یہ وہ قیامت نہیں ہے جو دُنیا کو مٹا دے اور ایک
فرضی جنت اور جہنم اور برزخ کو آباد کرے۔ بلکہ وہ قیامت ہے جو دنیا میں نئی روح دوڑا کر
اس کو بنا دے۔ اِسی نئی روح کے انتظار اور اسی کے خیر مقدم کے لئے کائنات کی رگیں

تھرتھرا رہی ہیں۔

(۷۳) جو گلے تک آکے اٹک گیا جسے تلخ کام نہ پی سکے
وہ لہو کا گھونٹ اُتر گیا تو سُنا ہے شیر و شکر بھی ہے

زہرابۂ غم جب تک گلے میں اٹکا رہے تلخ ہے۔ لیکن جب گلے سے اُتر کر ہضم ہوگیا تو یہی لہو کا گھونٹ شیر و شکر ہوگا۔ ایڈورڈ کارپنٹر کا قول ہے کہ جو شخص محبت میں ناکام رہا وہ اپنے کو دیوتا سمجھ سکتا ہے۔ میر ابھی شعر ہے:-

جو زہر ہلاہل ہے امرت بھی وہی لیکن معلوم نہیں تجھکو انداز ہیں پینے کے

(۷۴) تو زمان و مکاں سے گذر بھی جا تو رہِ عدم کو بھی کاٹ لے
وہ ثواب ہو کہ عذاب ہو، کہیں زندگی سے مفر بھی ہے

مِٹ جانا یا فنا فی اللہ ہونا خود فریبی ہے" زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا میں باز آیا" والی دُعا قبول نہیں ہوسکتی۔ زمان و مکان، وجود و عدم، عذاب و ثواب سے فرضی طور پر نکل کر بھی زندگی سے مفر نہیں۔ وجود کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں، عنوان بدلتے رہتے ہیں لیکن وجود باقی رہتا ہے خودی اور بیخودی زندگی کے محض دو رخ ہیں، اس لئے زندگی سے بھاگنے کی کوشش فضول ہے اور اس سے گھبرانا نادانی۔

یہ فنا بھی کیا یہ اجل بھی کیا کبھی دیکھ آکے فراق کو
اسی زندگی کی تجھے قسم کہ جو درد بھی ہے دوا بھی ہے

(۷۵) کوئی اہلِ دل کو کمی نہیں، مگر اہلِ دل کا یہ قول ہے
ابھی موت بھی نہیں مِل سکی ابھی زندگی میں کسر بھی ہے

اہلِ دل کے پاس کیا نہیں، بقول شاعر" قصیروں کی جھولی میں اب بھی ہے سب کچھ" لیکن وہ زندہ موت" وہ وجودِ محض ہونا، وہ آفاقی وجود حاصل کرنا ایسا بلند معیار ہے کہ اہلِ دل بھی کہہ اُٹھے" ابھی موت بھی نہیں مل سکی، ابھی زندگی میں کسر بھی ہے"! یعنی ابھی ان کا وجود موت اور زندگی، ہستی اور نیستی کے سرے نہیں ملا سکا۔ ابھی دونوں میں کسر ہے۔

(۷۶) یہ کام نہ لے نالہ و فریاد و فغاں سے افلاک اُلٹ دینے کا ڈھب ہی کچھ ہے

ہمارے شاعر قدیم تصوّر کی اس غلطی کا شکار رہتے کہ رونے چلّانے اور دُعا کرنے سے خدا خوش ہوکر تقدیر بدل دیتا ہے۔ یہ فلسفۂ دعا اور فلسفۂ گریہ و ماتم ایک فرضی خدا کے تصور کا

مرہونِ منت ہے۔ مگر افلاک اُلٹ دینے کا ڈھب اور ہی کچھ ہے یعنی منظم ہو کر انقلاب کرنا ایک اور شعر ہے:۔

خونِ شہید ناز کا آج ہے زیبِ داستاں　　نعرۂ انقلاب ہے ماتمِ رفتگاں نہیں

(۷۷) مذہب کی خرابی ہے نہ اخلاق کی پستی　　دنیا کے مصائب کا سبب اور ہی کچھ ہے

دین دھرم مٹنے سے دنیا پر مصیبت نہیں پڑی نہ پڑ سکتی ہے، دنیا کا اخلاق ہرگز پست نہیں۔ اور نہ اخلاق کو مذہب سے خواہ مخواہ کوئی تعلق ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ موجودہ دنیا کا اخلاق پچھلے زمانہ کے اخلاق سے بلند تر ہے۔ دنیا کے مصائب کا سبب اور ہی کچھ ہے۔ یعنی نظامِ سرمایہ داری اور ملوکیت جو دنیا کو چین سے جینے اور ترقی کرنے نہیں دیتے، اصلاحِ مذہب اور اصلاحِ اخلاق کے بجائے سیاسی اور اقتصادی انقلاب کی ضرورت ہے۔

(۷۸) دیکھ دنیا نہیں ہے وہ دنیا　　اب نہیں اہلِ دل کی ہمت اور

عشق حسن سے کہہ رہا ہے کہ ہم نے دنیا بدل دی، اس سے زیادہ ہماری ہمت نہیں۔ اس اظہارِ عجز و معذوری میں جو حلم اور غرور چھپا ہوا ہے ان پر غور کیجئے، میرا ایک اور شعر ملاحظہ ہو:۔

تجھ کو تو مرے حال سے کیا کام ہے لیکن　　شاید یہ مرا درد زمانے کے لئے ہے

(۷۹) معنیِ تقدیر تو وہ تھا، جسے　　کاتبِ تقدیر بھی سمجھا نہیں

وہ راز کیا جو کسی پر بھی کھُل سکے۔ سنسکرت کا مقولہ ہے کہ انسان کی تقدیر خدا تے بھی نہیں جانی، آدمی کی کون کہے۔

(۸۰) جس میں نئی دنیا کا تماشا نظر آئے　　سُنتے ہیں کہ وہ ساغرِ جم اور ہی کچھ ہے

جامِ جمشید میں تو یہی پُرانی دنیا نظر آتی تھی، ہم نے سنا ہے کہ ایک اور ساغرِ جم ہے جس میں نئی دنیا کا تماشا نظر آتا ہے، کیا یہ نیا ساغرِ جم انسانیت کے دل کا جامِ جم تو نہیں ہے جو آج نئی دنیا کا خواب دیکھ رہی ہے:۔

(۸۱) احساس بس احساس ہے یہ رنج و خوشی کیا　　اے عشق تجھے کارِ اہم اور ہی کچھ ہے

احساس کو دُکھ سُکھ غم اور خوشی سے معرّا کرنا اور اس کو شدید کر لینا یعنی واقعیت اور عمل کے مقاصد سے ہم آہنگ کر لینا ہی اسکو زندہ کر لینا ہے، اور یہی کارِ اہم عشق کے ذمہ ہے۔ یہ بڑا مشکل معیار ہے۔

(۸۲) تو نہ ہستی ہی کو سمجھا تو عدم سے بیخبر　　زندگی ہی زندگی ہے موت ہو یا زندگی

موت اور زندگی ایک دوسرے کے منافی نہیں جو ہستی اور عدم دونوں کو نہیں سمجھتے وہی زندگی اور موت میں فرق کرتے ہیں ورنہ" زندگی ہی زندگی ہے موت ہو یا زندگی۔"

(۸۳) ہر دل کو بنائیں گے جہاں تاب ہر جام کو جامِ جم کریں گے

جامِ جم حقیقت میں اُس صدق وصفا کا نشان ہے اور امکانات کی ایک علامت ہے جو انسان کے دل میں پنہاں ہیں۔ چنانچہ مسیحی روایتوں میں "ہولی گریل" (Holy Grail) کی روایت ہے۔ یہ جامِ جم اور "ہولی گریل" انسان کا دل اور انسانی شعور ہے۔

(۸۴) پھر جمودِ روزگار انگڑائیاں لینے لگا موت نے شاید نوائے زندگی پھر چھیڑ دی

جب میں وہ شعر کہہ چکا جو اس مضمون میں اکیسواں شعر ہے، یعنی آسمانوں کو بھی جیسے آ رہی ہے نیند سی، تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ نظمِ زندگی کی شاید صبح ہونے والی ہے۔ پھر جمودِ روزگار انگڑائیاں لینے لگا اور موت نے وہ نغمۂ سحری چھیڑ دیا جو پیامِ زندگی ہے۔ موت نے کیوں؟ اس لئے کہ کشت وخون کا بازار گرم ہوئے بغیر نہ جمودِ روزگار ٹوٹے گا اور نہ زندگی کا نظم ہی بدلیگا

اس شعر میں بھی تخلیقی انقلاب Creative Revolution کی طرف اشارہ ہے۔

(۸۵) تری طرف ہے محبت کی قوتِ تخریب بنا کوئی نئی دنیا اگر بنا آئے

قوتِ تخریب کو کام میں لائیں تو نئی دنیا بن سکتی ہے۔ انقلاب سے بربادی اور آبادی یعنی تخریب وتعمیر دونوں ہوتی ہے۔ اسی لئے انقلاب کو ایک تخلیقی قوت کہا جاتا ہے۔

(۸۶) نثار دیدۂ بے خواب۔ جاگنے کی طرح جو جاگ بھی نہ سکے اس کو نیند کیا آئے

بے خوابی کا ایک نفسیاتی سبب بھی ہوتا ہے۔ بسا اوقات رات کو بسترِ آرام پر جا کر مجھے یہ احساس ہوا کہ آج کا دن سُونا سُونا کٹ گیا۔ چنانچہ میں اس خیال سے ایسا غمِ آسودہ رہا کہ نیند بھی نہیں آئی۔ میرے جاننے والے اس کا حال بخوبی جانتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک یونیورسٹی کے طالب علم نے اس کا سبب پوچھا۔ یہ شعر اسی سوال کا جواب ہے۔ ایک دوسرا شعر بھی سُن لیجئے۔

نہ جاگنے دے نہ سونے دے وہ ہوا کیجئے یہ زندگی ہو تو اس زندگی کو کیا کہیے

تصحیح

افسوس کہ منشی تلوک چند صاحب محروم کے قطعہ مطبوعہ زمانہ اپریل ۱۹۳۱ء میں کتابت کی چند غلطیاں ہو گئی ہیں، جو درج ذیل ہیں۔ ناظرین رسالہ درست فرمائیں!۔

			غلط	صحیح
صفحہ ۱۸۲	شعر ۱	مصرعہ دوم	نزدیک ہے	نزدیک ہیں
"	شعر ۳	مصرعہ دوم	غوغائے آسماں	غوغائے میکشاں
"	شعر ۶	مصرعہ دوم	یہ سہو	نیا سہو

ہجومِ یاس

(از محمد فاروق احمد محشر بدایونی)

ماہ و انجم پا بیادہ ہیں بساطِ چرخ پر — چاندنی سے مطلعِ انوار ہیں دیوار و در
جگمگاتی پھر رہی ہیں جگنوؤں کی ٹولیاں — یا ستارے گر رہے ہیں آسماں سے ٹوٹ کر
دیدنی ہے صحنِ گلشن میں تماشائے بہار — وجد کرتے ہیں برابر جوشِ مستی میں شجر
شمعِ نظارہ سے پُرتنویر ہے بزمِ خیال — کثرتِ انوار سے روشن ہے فانوسِ نظر
کس قدر دلسوز ہے یہ منظرِ بیچارگی — سو رہی ہے اک سراپا ناز فرشِ خاک پر
آنکھ میں آنسو جگر میں ٹیس دل میں حسرتیں — جس کی دنیا میں نہیں عیش و مسرت کا گذر
ناتوانی کا نشانہ بے قراری کا شکار — جس کے رخ پر رنگ بن کر چھا گیا دردِ جگر
جس کے طرزِ بیخودی پر کہکشاں بھی لوٹ ہے — چھیڑتی ہے جس کو رہ رہ کر ستاروں کی نظر
نیم وا آنکھیں، نگاہیں مضمحل، چہرہ اُداس — موت بھی آنسو بہا دے جس کی صورت دیکھ کر
ایک وہ ناکام ہستی، ایک وہ مجبورِ غم — جس کے نالے نارسا جس کی دعائیں بے اثر
جس کی زلفیں چھانتی رہتی ہیں سرمہ خاک کا — مفلسی سر پیٹتی ہے جس کے حالِ زار پر
جس کی سانسوں میں نمایاں آہ کی چنگاریاں — جس کے سینہ میں جہانِ بےکسی زیر و زبر
گورا گورا جسم اُس پر میلے میلے چیتھڑے — غیرتِ گلشن سراپا پیکرِ غم سر بسر
سو گیا جس کا مقدر مفلسی کی گود میں — عمر بھر کو رنج و آفت کا دوشالا اوڑھ کر

اُف یہ سناٹے کا عالم حیف یہ تصویرِ یاس
کس قدر اندوہگیں ہے رات کا پچھلا پہر

میری فطرت

مصائب سے اُلجھ کر مسکرانا میری فطرت ہے — مجھے ناکامیوں پر اشک برسانا نہیں آتا
نگاہیں جس کی جم جاتی ہیں مستقبل کے چہرے پر — اُسے ماضی کی بے رخی کو دہرانا نہیں آتا

احسان دانش

فاشزم نازیزم اور عورت[1]

فاشزم اور نازیزم کی آزادی دشمنی اب اس قدر رسوائے زمانہ ہو چکی ہے کہ اس کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت باقی نہیں ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ یورپ کی موجودہ جنگ اور چھوٹی چھوٹی قوموں کی پسپائی اور غلامی کو دیکھکر بعض لوگوں کو یہ خیال پیدا ہو کہ فاشزم یا نازیزم صرف سیاسی آزادی کا دشمن ہے لیکن یہ خیال غلط ہے۔ فاشزم اور نازیزم بنیادی طور پر ہر قسم کی آزادی کے دشمن ہیں جو انسان کو انسان بناتی ہے۔ شخص واحد کی مجنونانہ حکومت کا نظارہ کتنا ہولناک ہے، اسے کچھ یورپ والے ہی بیان کر سکتے ہیں۔ اٹلی، جرمنی اور فاشسٹ یا نازی طرز حکومت میں انسان کتنا پابند اور مجبور ہوتا ہے اس کا مطالعہ بھی حد درجہ دلدوز ہے۔

آج اٹلی، جرمنی اور دوسری جگہوں پر جہاں یہ طرز حکومت جاری یا اثر انداز ہے وہاں مصنف فن کار، مقرر، اخبار نویس ہر ایک مجبور ہے۔ لیکن اس نظام حکومت میں سب سے زیادہ قابل رحم حالت عورتوں کی ہے۔

فاشزم یا نازیزم اور عورتوں کی آزادی ایک دوسرے کی ضد ہے۔ فاشسٹ حکومت دراصل مطلق العنانی، ہٹ دھرمی اور وحشت و بربریت کا مظاہرہ ہے، اس کو انسانیت، انصاف اور منطق سے کوئی لگاؤ نہیں۔ جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے فاشسٹ حکومت کے ماتحت عورت مردوں کا غلام بن کر رہ جاتی ہے۔ فاشسٹ حکومت میں عورت کی زندگی کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ ڈکٹیٹر کے مجنونانہ خیالات کی تکمیل کے لئے سپاہی پیدا کرے، اُن کی خدمت گزاری کرے، اور اُن کی ہوس کاریوں کا تختۂ مشق بنے۔

فاشزم کے قائد اعظم مسولینی نے اپنے مشہور سوانح نگار ایمل لڈوگ کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے صاف لفظوں میں کہا ہے کہ:-

---

[1] یہ مضمون سلویا پنکھرسٹ کے مضمون کو پڑھنے کے بعد لکھا گیا ہے، مگر لکھنے والے نے مزید معلومات بھی شامل کردی ہیں، ڈھانچہ البتہ سلویا پنکھرسٹ ہی کا مضمون ہے۔ آئندہ بھی نسوانہ میں اس قسم کے کئی سیاسی علمی مضامین شائع ہوتے رہیں گے۔ (ا-ز)

مرد کی خدمت گزاری اور فرمانبرداری ہی عورت کا فرض مقدم ہے۔ ریاست میں عورت کا اور کام ہی کیا ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ انھیں کسی قسم کا حق نہ ملنا چاہیئے۔ اگر میں عورتوں کو ووٹ دینے کا حق دیتا تو لوگ مجھ پر ہنستے۔ بہر حال جیسی طرز حکومت ہم لوگوں نے قائم کی ہے، اُس میں عورتوں کی کوئی گنتی نہیں۔"

امیل لڈوگ کی یہ کتاب دنیا بھر کی زبانوں میں شائع ہو چکی ہے، اور مسولینی کی مستند سوانح عمری شمار کی جاتی ہے۔ مسولینی عورتوں کے معاملے میں حد درجہ وحشی ہے، اُس نے ایک بار یہ بھی کہا ہے کہ "مجھے اپنے آباؤ اجداد میں سب سے زیادہ دلچسپی ایک شخص سے ہوئی جو وینس میں رہا کرتا تھا، اُس نے اپنی بیوی کو اس لئے قتل کر دیا تھا کہ اُس کے خیال میں وہ وفادار نہ تھی۔ اُس نے اُس کے سینہ میں دو چھریاں ماریں اور بھاگ گیا تھا...... رومانگنا گھرانے کے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں، اور میں بھی اُسی نسل سے ہوں۔"

جب سے اٹلی میں فاشزم کی طاقت بڑھ گئی تو وہاں ایک قانون یہ بھی بنا دیا گیا ہے کہ کوئی عورت گیارہ برس سے زیادہ عمر کے لڑکے کو کوئی ایسا مضمون نہیں پڑھا سکتی جس سے اُس کے کردار پر اثر پڑتا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فاشسٹ حکومت سارے ملک کے مردوں کو بربریت کے سانچے میں ڈھالنا چاہتی ہے، اور وہ جانتی ہے کہ انسان کے خیالات اور کردار کس طرح ترتیب پاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فاشسٹ حکومت کے قیام کے بعد وہاں کے مردوں میں عورتوں کے لئے ہمدردی کا کوئی جذبہ باقی نہیں رہا۔

اٹلی سے باہر یہ ناگوار حقیقت بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ وہاں کی عورتوں کو کس قدر ساری زندگی مردوں کے ہاتھوں بے جان کٹھ پُتلی کی طرح اشاروں پر چلنا پڑتا ہے۔ جو اُن کی زندگی دو بھر کر دیتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ فاشسٹ نظام حکومت اور فاشسٹ سماج نے عورتوں کو ہر حق سے محروم کر رکھا ہے۔ ملکی قانون کے مطابق عورتوں کی سماج۔ حکومت اور قانونی اداروں میں کوئی حیثیت ہی نہیں اور عورتوں کو طرح طرح کی چالاکیوں اور عیاریوں سے کام لیکر ہر حیثیت سے مجبور کر دیا گیا ہے۔

اٹلی میں فاشسٹ دور سے پہلے شادی کی عمر لڑکیوں کے لئے کم سے کم پندرہ ۱۵ سال اور لڑکوں کے لئے اٹھارہ سال تھی۔ اب اُسے گھٹا کر لڑکیوں کے لئے چودہ ۱۴ اور لڑکوں کے لئے سولہ ۱۶ کر دیا گیا۔ وہاں کی بے بس لڑکیوں کو جنھیں کسی قسم کا قانونی حق حاصل نہیں، کم عمری ہی میں ماں بننے پر مجبور کر دیا گیا ہے،

اٹلی کی غریب عورتیں اس قانون سے لازمی طور پر نقصان اٹھا رہی ہیں۔

اگر اٹلی کے سابق قانون اور نئے فاشسٹ قانون کا مقابلہ کیا جائے تو بڑی آسانی سے معلوم ہو جائے گا کہ فاسسٹ نظام حکومت کس طرح عورتوں کے حقوق پر چھاپا مار رہا ہے۔ ہر چند اٹلی کا قدیم قانون بھی کچھ زیادہ ترقی یافتہ نہ تھا، پھر بھی اس وقت سے ضرور بہتر تھا۔ موجودہ فاشسٹ عہد حکومت کے ماتحت تو عورتوں کی حیثیت گائے اور بکریوں سے زیادہ نہیں رہی۔ مرد مختار کل ہیں اور عورتیں مجبور محض۔

فاشسٹ قانون کے ماتحت گھر کے مالک کو حق ہے کہ وہ عورتوں اور بچوں کو جس قسم کی چاہے سزا دے سکتا ہے۔ مرد عورتوں کو مار پیٹ کرنے پر صرف ایسی حالت میں سزا کا مستحق سمجھا جاتا ہے جب عورت کو کوئی جسمانی نقص واقع ہو یا اُس کا دماغ خراب ہو جائے یا عرصہ تک بیمار رہے۔ لیکن ایسی حالتوں میں بھی مرد کو چھ ماہ سے زیادہ سزا نہیں دی جا سکتی، حالانکہ اس سے پہلے اس جرم پر پانچ سال تک کی سزا دی جاتی تھی۔ اگر مار پیٹ کی زیادتی کی وجہ سے عورت مر جائے تو مرد کو آٹھ سال تک کی سزا دی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ موت قتل نہیں سمجھی جاتی۔ حالانکہ پہلے قانون میں یہ جرم قتل ہی تھا۔ موجودہ قانون کے ماتحت اطالوی مرد کو اپنی بیوی پر ہر طرح کے اختیارات حاصل ہیں۔ جس طرح ایک قصاب کو اختیار حاصل ہے کہ جب چاہے اپنی خریدی ہوئی بکری کو ذبح کر ڈالے، اُسی طرح ایک شوہر کو اختیار ہے کہ جب چاہے اپنی بیوی کو مار پیٹ کرے بشرطیکہ اُس کی کسی ہڈی کو صدمہ نہ پہونچے۔ لیکن ہڈی ٹوٹنے یا کسی سخت صدمے کے بعد بھی قانون نمائشی ہی ثابت ہوتا ہے کیونکہ مرد کو آسانی کے ساتھ معافی مل جاتی ہے۔

اگر کوئی کم عمر لڑکی شوہر کے مظالم سے تھک کر بھاگ جائے تو پولیس اُس کو گرفتار کر کے اُس کے شوہر کے حوالے کر دیتی ہے۔ اس کے علاوہ شوہر کے گھر سے بھاگنے کی سزا ایک سال قید اور دس ہزار لائر[1] جرمانہ کی سزا مقرر ہے۔ لیکن مرد پر کوئی پابندی نہیں۔ اس کا جہاں جی چاہے جا سکتا ہے۔

اگر کوئی عورت کسی دوسرے مرد کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کرے تو قانوناً اُسے دو سال قید تک کی سزا مل سکتی ہے۔ سزائے قید کی یہ میعاد یورپ کی ساری حکومتوں سے زیادہ ہے لیکن اس کے برعکس مرد بالکل آزاد ہے۔ اُس پر کوئی پابندی نہیں بشرطیکہ وہ کوئی باضابطہ داشتہ نہ رکھے۔ وقتی طور پر وہ جس عورت سے دل چاہے تعلقات قائم کر سکتا ہے۔ بیوی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

---

[1] لائر اٹلی کا ایک سکہ ہے۔

اور اگر مرد کسی دوسری عورت کے ساتھ مستقل ناجائز تعلقات بھی قائم کر لیتا ہے تو فاشسٹ عدالت میں اُس پر جرم ثابت ہونا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔

"قتل" "عزت کے لئے" قاتل اگر مرد ہے اور مقتول عورت، تو فاشسٹ حکومت مرد کے ساتھ ہر طرح کی رعایتیں برتتی ہے۔ اس سے پہلے بیوی بیٹی یا بہن کے قتل پر بشرطیکہ مقتول کسی غیر مرد کے ساتھ پکڑی گئی ہو تین سے سات سال تک کی سزا مقرر تھی۔ لیکن نئی فاشسٹ حکومت نے قانون کو کھینچ تان کر بہت لچکدار بنا دیا ہے۔ اس لئے اگر کوئی مرد شک پر بھی اپنے گھر کی کسی عورت کو قتل کر دے تو اُسے رہائی مل سکتی ہے۔ بہر حال نئے فاشسٹ قانون نے مرد کو اپنی بیوی، بہن اور بیٹی کی زندگی کا مالک بنا دیا ہے۔ اگر کوئی مرد دوسری عورت سے تعلقات قائم کرے اور بیوی سے اس پر جنگ ہو تو وہ اُسے قتل کر کے اظہار شک کے بعد آسانی سے رہائی پا سکتا ہے۔

یہ قانون دراصل اُس وحشیانہ فلسفۂ اخلاق کے ماتحت بنایا گیا ہے جس کی تعلیم فاشزم سے ملتی ہے اور جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ "عورتیں مردوں کی جائداد ہیں، عورت مرد کی پابند ہے مگر مردوں کو دوسری عورتوں سے دلچسپیاں حاصل کرنے کی پوری آزادی ہے۔

اٹلی میں عورتوں کو عصمت فروشی کے جرم میں بھی سخت سزائیں دی جاتی ہیں، خواہ وہ افلاس ہی سے اس کے لئے مجبور ہوں۔ لیکن مردوں کو زنا بالجبر پر بھی محض معمولی سزا دی جاتی ہے، درحقیقت اٹلی میں بے بس عورتوں کی حفاظت کے لئے کوئی قانون ہی نہیں ہے۔ لڑکی کی رضامندی خواہ وہ کتنی ہی کم عمر کیوں نہ ہو مرد کے لئے جواز قرار دیدیتی ہے۔ قانون نہیں دیکھتا کہ مرد نے کم عمر لڑکی کو بہکا کر ایک قومی جرم کیا ہے، وہ مرد کو رہا کر دیتا ہے۔ البتہ ایسی حالت میں بھی کہ لڑکی سولہ سال سے کم عمر ہو اور مرد شادی شدہ۔ اور لڑکی یہ ثابت کر دے کہ مرد نے اپنا شادی شدہ ہونا چھپایا۔ اور اُس سے بیاہ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مرد کو تین مہینے سے لیکر دو سال تک کی سزا مل سکتی ہے۔ لیکن اگر مرد یہ ثابت کر دے کہ لڑکی پہلے سے آوارہ تھی، جو تعلقات قائم ہونے کے بعد آسانی سے ثابت کیا جا سکتا ہے تو پھر مرد کی رہائی یقینی ہو جاتی ہے فاشسٹ حکومت ہر طرح سے مرد کی مدد کرتی ہے، کیونکہ اُسے ہوس ملک گیری کی تکمیل کے واسطے درندہ صفت مردوں کی ضرورت ہے۔

سابق اطالوی قانون میں اغوا کی سزا سات سال تک تھی، اور عورت اکیس ۲۱ برس کی عمر تک نابالغ سمجھی جاتی تھی۔ لیکن نئے قانون کے ماتحت عورت چودہ ۱۴ برس کی عمر میں بالغ ہو جاتی ہے اور بالغ عورت کا اغوا تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اور نابالغ لڑکی کو اغوا کرنے کی سزا زیادہ سے زیادہ تین سال قید ہے۔

اٹلی کے نئی تعزیرات کی دفعہ ۵۲۰ اُس افسر یا پولیس کے سپاہی کے متعلق ہے جس کی حفاظت اور نگرانی میں کوئی عورت رکھی گئی ہو، لیکن سپاہی نے اُس کے ساتھ زنا کیا ہو۔ اٹلی میں یہ دفعہ نہایت اہم ہے کیونکہ اکثر عورتیں جو قید یا نظربند کی جاتی ہیں مردوں کی نگرانی میں رکھی جاتی ہیں۔ سابق قانون میں اس قسم کے جرم کی سزا دس سال تک تھی، لیکن اب زیادہ سے زیادہ تین سال کی سزا مقرر کی گئی ہے۔ لیکن اتنی سزا کسی سپاہی کو نہیں دی جاتی ہے!

اٹلی کے فاشسٹ نظام کا تو جائزہ ہو چکا، یہ وہی نظام ہے جس کی بنیاد ہی بقول مسولینی "روحانیت اور بلند اخلاقی" نظریوں پر قائم ہے۔ اب آیئے ہٹلر کی قومی اشتراکی حکومت میں عورتوں کی حالت کو دیکھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نازی حکومت عورتوں کے حق میں فاشسٹ حکومت سے بھی زیادہ ہولناک ہے۔ اور نازی نظام نے عورت کو بالکل پامال کر دیا ہے اور وہ اسے ایک قابل فخر کارنامہ سمجھتا ہے۔ چنانچہ کچھ عرصہ ہوا ایک جرمن اخبار نے لکھا تھا کہ:-

"جو عورت خود کماتی ہے، وہ مرد کو زخمی کرتی ہے، صرف اسی حیثیت سے نہیں کہ وہ مرد کی مقابل بن جاتی ہے۔ بلکہ درحقیقت وہ مرد کو خاندان کا سرپرست اور سردار بننے سے روکتی ہے۔"

کیسا سیدھا سادہ نظریہ ہے اور کیسی کھری بات ہے، مگر نازی ازم نے عملی طور پر بھی اسے کر دکھایا ہے۔ ۱۹۱۹ء کے انقلاب کے بعد عورتوں کو ریشتاغ اور صوبائی پارلیمنٹوں میں جو جگہیں ملی تھیں اُسے نازی ازم نے اقتدار پاتے ہی عورتوں سے چھین لیا، اور اُن تمام عورتوں کو جو حکومت، مقامی کونسلوں یا دوسرے سرکاری یا نیم سرکاری دفتروں میں ملازم تھیں برطرف کر دیا۔ انتہا یہ کہ اسپتالوں اور اسکولوں کی ملازمتوں سے بھی انھیں زبردستی علٰحدہ کر دیا گیا۔ تیس سال تک کی عورتوں پر قانوناً پابندی لگا دی گئی۔ اور وہ عورتیں بھی ملازمتوں سے محروم کر دی گئیں جن کے شوہر غیر آریائی تھے۔ ۳۰۔ جون ۱۹۳۲ء کو ایک نیا قانون بنا جس کے رو سے ساری شادی شدہ عورتوں کو ملازمتوں سے الگ کر دیا گیا اور اُن عورتوں کو جن کی شوہر کے علاوہ باپ۔ بھائی یا اور کوئی عزیز کفالت کر سکتے ہوں ملازمت کے حق ہی سے محروم کر دیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چھوٹی تنخواہیں پانے والے اکثر مردوں پر بڑے بڑے خاندانوں کا بوجھ پڑ گیا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ غریب ہو گئے۔ اُن کے لڑکے روپیوں کی کمی کی وجہ سے سائنس، فلسفہ اور علم پڑھنے کے بدلے کم عمری میں نازی فوج میں داخل ہوتے چلے گئے۔ لیکن اس سلسلہ میں سب سے بڑی زیادتی یہ ہوئی کہ نازی حکومت نے یہ قانون جاری کرنے سے پہلے ہی ہزاروں عورتوں کو برطرف کر دیا

جو جمہوری حکومت کے زمانہ سے بہت سے دفتروں میں کام کر رہی تھیں۔

پچھلے پچیس ۲۵ سال سے جرمنی کی عورتوں کو بغیر کسی شرط کے یونیورسٹیوں میں داخل ہونے کا حق حاصل تھا۔ وہ قانونی پیشے بھی اختیار کر سکتی تھیں، لیکن اب صرف دس فی صدی لڑکیاں با سالاوریٹ (Baccalaureat) (جو میٹرکیولیشن کے مقابلہ کا امتحان ہے) کے امتحان میں شریک ہوسکتی ہیں اس حق تلفی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ۱۹۳۴ء میں دس ہزار پانچ سو لڑکیوں نے یہ امتحان پاس کیا، اُن میں سے صرف ایک ہزار لڑکیوں کو یونیورسٹی میں داخل ہونے کی اجازت ملی لیکن یہ لڑکیاں بھی ایسے تعلیمی شعبوں میں داخل نہیں ہوسکتیں کہ کوئی آزاد پیشہ اختیار کرسکیں البتہ پچھتر ۷۵ لڑکیوں کو صرف ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت مل جاتی ہے۔ لیکن جرمنی کے ڈاکٹر اس کے بھی خلاف ہیں۔

جرمنی میں سائنس کی تعلیم صرف مردوں کے لئے مخصوص ہے۔ اس کے متعلق ایک جرمن اخبار میں یہ سرکاری بیان شائع ہو چکا ہے:۔

> "عورتوں کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ سائنس کے سارے کام مردوں کے ہیں، عورتوں کو نظری طور پر غور و فکر نہیں کرنا چاہیئے، اُس کا دماغ ایسی باتوں سے خالی رہنا چاہیئے۔ عورت کا کام صرف اچھے بچے پیدا کرکے اُن کی پرورش کرنا ہے۔"

اس عہد میں جب کہ مادام مَیری کیوری اور مَیریا مونٹسری پیدا ہو چکی ہیں یہ بات کتنی حیرت انگیز اور عجیب ہے!

جرمنی کی تعلیم گاہوں میں عورتوں کو صرف نیچے درجے کی جگہیں مل سکتی ہیں، اور بقول ایک تعلیمی رسالہ "مرد جو تعلیم دیا کرتے ہیں وہ عورتوں کے مقابلہ میں لڑکوں کی ذہنیت کو زیادہ بہتر ترتیب دیتے ہیں" حالانکہ آج ساری دنیا اس کو تسلیم کر چکی ہے کہ عورتیں شفیق معلّمہ ثابت ہوتی ہیں۔ لیکن ہٹلر کے جرمنی کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ ساری دنیا جس بات کو مانتی ہے جرمنی میں وہ غلط سمجھی جاتی ہے، ساری دنیا جس بات کو بُرا سمجھتی ہے جرمنی میں اسکو صحیح سمجھا جاتا ہے۔ اسکا نتیجہ یہ ہے کہ جرمن عورتوں کی ذہنی نشو ونما ختم ہو رہی ہے۔ اُن کو مار مار کر گھریلو دھندوں میں اُلجھایا جا رہا ہے اور اگر اُنھیں ملازمتیں دی بھی جاتی ہیں تو اسلحات کے کارخانوں یا زہریلی گیسیں بنانے کے کارخانے میں۔

ان دنوں جرمن عورتوں کو دن میں بارہ گھنٹے کام کرنے کے بعد نازیت پر لکچر سُننے پڑتے ہیں آپ خود اندازہ کیجئے کہ سارا دن کھیتوں اور گھروں کا کام کرنے کے بعد ایک عورت کس طرح لکچر

سُننے جا سکتی ہے۔ لیکن اٹھارہ سے اکیس سال تک کی عورتوں کو تو ایک مستقل ضابطہ کے ماتحت محنت کرنا پڑتی ہے اور جو عورتیں کل تک دفتروں میں اعلیٰ عہدوں پر نظر آتی تھیں آج کھیتوں اور گھروں کا کام کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس سے اندازہ کر لیجئے کہ نازیت کے ماتحت انسانی تہذیب کی ترقی میں کتنی بڑی رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے۔ کیا عورتوں کی آزادی کے بغیر انسانی تہذیب ترقی کر سکتی ہے؟

ریاضِ رضواں

(از حکیم سید محمد عباس صاحب رضواںؔ)

کیفِ نگاہِ مست سے، بھر گئے دن بہار کے
پھولوں میں رنگ بھر گئے، دیدۂ پُر خمار کے

ہم سے قفس نصیب سب، گلشنِ روزگار کے
گنتے ہیں انگلیوں پہ دن، آتی ہوئی بہار کے

آئے جو چشمِ شوق تک، دستِ تصورِ جنوں
سیکڑوں پُرزے ہو گئے، دامنِ انتظار کے

وحشیِ عشق ایک جا، باغ میں بیٹھتے ہیں جب
رہتے ہیں روز تذکرے، گذری ہوئی بہار کے

جامۂ دل میں عمر بھر، بوئے جنوں بسی رہی
سونگھ لیے تھے قیس نے، پھول مرے مزار کے

زخمِ جگر میں بخیہ گر، بخیہ رفو کا کام ہے
ٹانکے یہ ٹوٹ جائیں گے آتے ہی دن بہار کے

ختم اُسی جگہ ہوئیں، راہِ وفا کی منزلیں
اُڑ کے جہاں جہاں گئے ذرّے مرے مزار کے

بجلی قضا کی لب پہ تھی آپ کھڑے تھے سامنے
ہو گیا چپ مریضِ غم، پھر یہ کسے پکار کے

مانا کہ شوقِ دید ہے، ہوش میں رہیے گا کلیم
چڑھیے گا بامِ طور پر، پردہ ذرا پکار کے

شام ہوئی تو شمع نے، اشک بہائے رات بھر
صبح ہوئی تو ہنس دیئے پھول مرے مزار کے

رضواںؔ عدم میں روشنی پہونچی دیارِ عشق سے
بن گئے داغِ دل چراغ، شب کو مرے مزار کے

ہوائے زمانہ

(از منشی جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی بی-اے ایل ایل بی)

جوانی کی رنگین راتیں فسانہ ۔ بہار آفریں حسن کا کیا ٹھکانا
محیطِ فلک چار دن چاندنی ہے ۔ گھڑی بھر ستاروں کی یہ روشنی ہے
بہار و خزاں کے ہیں دن آتے جاتے ۔ انھیں دیر لگتی ہے جاتے نہ آتے
گل و یاسمن کا ہے بلبل کو رونا ۔ برابر ہے کانٹوں کا ہونا نہ ہونا
سرِ شاخ شبنم کا موتی پرونا ۔ شب و روز سبزہ کا دامن بھگونا
گلِ لالہ دل دے کے ہوتا ہے داغی ۔ نسیمِ سحر ہے گلستاں سے باغی

کسے راس آئی ہوائے زمانہ؟

بنی ہے جبھی تک یہ دنیا بنی ہے ۔ یہاں جیز ہے جو بھی وہ رفتنی ہے
نہیں جز طلسم نظر دار فانی ۔ کہانی ہے اور وہ بھی جھوٹی کہانی
بدلتا ہے گر رنگِ عالم تو پھر کیا ۔ اِسی پر ہے دورِ فنا منحصر کیا؟
نگاہوں پہ غفلت کا پردہ پڑا ہے ۔ نہاں فی الحقیقت بقا در فنا ہے
تغیّر کے چکر میں ہر شئے ہے قائم ۔ رہا ہے رہے گا یہی رنگ دائم
وہی آسماں ہے وہی سرزمیں ہے ۔ ابھی تک جواں ہے نئی ہے حسیں ہے
وہی خندۂ گل بداماں چمن ہے ۔ وہی شمع سوزاں وہی انجمن ہے
وہی آب و گل ہے وہی باد و آتش ۔ وہی طرز و انداز نقش و نگارش
خدائی کا ہے یہ عجب کارخانہ ۔ وہی طائرِ دل وہی آب و دانہ
نیا رنگ و روغن نیا پیرہن ہے ۔ بنوعِ دگر تازہ عہدِ کہن ہے

ابھی تک وہی ہے ادائے زمانہ



تنقید کتب

مبادی سیاسیات

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے پروفیسر ہارون خان شروانی ایم اے نے ۱۹۲۷ء میں یہ کتاب دو حصوں میں لکھی تھی۔ چنانچہ دونوں حصے الگ الگ جلدوں میں شایع کئے گئے تھے اور پہلے حصے پر زمانہ میں ریویو بھی ہو چکا ہے۔ مگر اب پروفیسر صاحب نے دونوں حصوں کو بعد نظر ثانی یکجائی طور پر شایع کیا ہے جس سے یہ کتاب پہلے سے کسیقدر مختلف اور جامع ہوگئی ہے ۱۹۳۷ء سے اب تک دنیا کے سیاسی حالات نے اسقدر پلٹا کھایا کہ فاضل مصنف کو اس کتاب میں جگہ جگہ ردو بدل کرنا پڑا۔ اور ۱۵ راپریل ۱۹۳۹ء تک جو واقعات دنیا میں ہوئے ان کے ضروری نتیجے بھی انھوں نے پیش کر دیئے ہیں۔

کتاب کا موضوع پولٹیکل سائینس ہے۔ فاضل مصنف نے اسمیں افلاطون کی مشہور کتاب "ریاست" کی طرح مختلف ابواب قائم کر کے سیاسیات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ زبان بھی صاف اور عام فہم ہے کتاب کے آخیر میں اردو انگریزی اصطلاحات کی بھی ایک جامع فہرست دیدی ہے۔ غرض یہ کتاب اسکولوں اور کالجوں کے طالبعلموں کے لئے خاص طور پر مفید ہے

فاضل مولف نے ایک جدت یہ کی ہے کہ انھوں نے بعض جغرافیائی ناموں کا نیا ترجمہ کیا ہے۔ مثلاً (۱) آئرلینڈ کی جگہ آئرستان اسکاٹلینڈ کے بجائے اسکاچستان لکھا ہے اسطرح سوئٹزرلینڈ کو سوئسرستان۔ نیوزیلینڈ کو نوزستان وغیرہ قرار دیا ہے۔ ہم کو افسوس ہے کہ ہم اس جدت کی تائید نہیں کر سکتے ہیں۔ ہماری رائے میں پروفیسر صاحب نے اس طبع آزمائی کی ناحق تکلیف اٹھائی ہے کیونکہ اردو داں جماعت جس آسانی سے آئرلینڈ یا نیوزیلینڈ سمجھ لیتی ہے آئرستان یا نوزستان کو نہیں سمجھ سکتی۔ اسکے علاوہ انکی وضع کی ہوئی بعض اصطلاحیں اسقدر ثقیل اور غیر مانوس ہیں کہ ان کے سمجھنے کے لئے لغت درکار ہے۔ مثلاً "دساتیر" جو "دستور" کی جمع ہے اور "کانسٹی ٹیوشن" کا ترجمہ ہے ہمارے نزدیک ریپبلک کی انگریزی اصطلاح زیادہ مانوس ہے اسلئے اسے بدستور رہنے دیا جاتا تو بہت اچھا ہوتا۔ کتاب کی لکھائی، چھپائی عمدہ ہے۔ ضخامت ساڑھے سات سو صفحات سے زیادہ قیمت پانچ روپیہ ملنے کا پتہ جامعہ ملیہ دہلی۔

تازیانے

یہ پندرہ دلچسپ افسانوں کا ایک دلپذیر مجموعہ ہے۔ جو مختلف اہل قلم کے زور طبع کا بہترین نمونہ کہے جا سکتے ہیں افسانوں کو الطاف مشہدی صاحب نے جمع کیا ہے اور ان کو دیکھکر ہم اُن کے نظر انتخاب کی داد دیتے ہیں۔ منشی پریم چند کا افسانہ شطرنج اور مسٹر علی عباس حسینی کا قصہ "باون تیجے" پلاٹ اور لٹریچر دونوں لحاظ سے قابل تعریف ہیں۔ بہرحال یہ کتاب سفر میں وقت کاٹنے کے لئے اچھی چیز ہے۔ بعض افسانوں میں زبان کی خامیاں موجود ہیں۔ جن کی وجہ سے اُن کی دلچسپی کم ہوگئی ہے لکھائی چھپائی اچھی ہے۔ ضخامت ۲۰۴ روپیہ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ مسز لاجپت رائے اینڈ سنز لاہور

تصحیح: زمانہ مئی ۱۹۴۱ء صفحہ ۲۴۰ پر حضرت مدہوش نے قطعہ خیر مقدم کے چوتھے شعر کا دوسرا مصرع "جو شعر کی زبان ہے بڑھ جائے آسماں سے" غلط چھپ گیا ہے۔ صحیح مصرع یہ ہے۔ جو شعر کی زمیں ہے بڑھ جائے آسماں سے

صفحہ ۱۹۷ سطر ۲۳ پر شعر مندرجہ کا مصرع اول "ہر شام ہوئی صبح کو اک خواب فراموش۔" غلط ہے صحیح مصرع یہ ہے: ہر رات ہوئی صبح کو اک خواب فراموش۔ یہ شعر جناب جگر مرادآبادی کا نہیں بلکہ حضرت یگانہ چنگیزی لکھنوی کا ہے۔

رفتارِ زمانہ

جنگ کے حالات

جرمنی کی لڑائی ابھی تک کسی فیصلہ کن مرحلہ پر نہیں پہونچی۔ افریقہ کے مشہور جنگی ماہر جنرل اسمٹس کا (جواب فیلڈ مارشل ہو گئے ہیں) قول صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ابھی جنگ کا خاتمہ دور ہے۔ اُن کی رائے میں ابھی گویا لڑائی کی شروعات ہی ہوئی ہے۔ عنقریب ہی اتحادیوں کو سخت ترین آزمایشوں سے گذرنا پڑیگا امریکہ کے وزیر جنگ مسٹر (Stimson) کا بھی یہی خیال ہے کہ یہ جنگ آیندہ چار سال تک تو ضرور چلے گی برطانیہ کے افسران اور مدبر بھی ایک طولانی مقابلے کے لئے تمام ضروری تیاریاں کر رہے ہیں۔ جرمنی کو اپنی تیاریاں مکمل کرنے میں آٹھ دس سال لگے ہیں۔ برطانیہ کے مدبر آغاز جنگ سے خواب غفلت سے بیدار ہوئے اور اُنھوں نے جو کچھ کیا ہے پچھلے اکیس بائیس مہینوں میں کیا ہے۔ برطانیہ کی آبادی بھی جرمنی سے تقریباً نصف ہے لیکن برٹش نو آبادیوں، برطانوی مقبوضات اور سب سے بڑھکر امریکہ کی امداد سے اُمید قوی ہے کہ اسلحہ اور دیگر ضروری سامان کے اعتبار سے وہ اس سال کے آخر تک جرمنی کے ہم پلّہ ہو جائیگا۔ اس وقت سلطنت برطانیہ تن تنہا جرمنی کا مقابلہ کر رہی ہے۔ روس کے علاوہ تمام یورپ پر اس وقت جرمنی کا عارضی قبضہ ہو گیا ہے اس لئے نہ صرف جنگ جاری رکھنے بلکہ عارضی فتوحات حاصل کرنے میں اُسے بڑی سہولت ہو گئی ہے۔ چنانچہ پچھلے دنوں جزیرہ کریٹ پر اس کی ہوائی فوج نے اس زور و شور کا حملہ کیا کہ بارہ تیرہ دن کے اندر شاہ یونان کی یہ آخری جائے پناہ بالکل ملیامیٹ ہو گئی۔ برطانوی فوجیں چھ سات ماہ سے کریٹ میں موجود تھیں اس لیے عام خیال تھا کہ جرمن آسانی سے اس اہم جزیرہ پر فوج کشی نہ کر سکیں گے۔ لیکن تجربہ سے یہ خیال درست ثابت نہیں ہوا۔ ہٹلر نے بیشمار ہوائی جہازوں کے ذریعہ کریٹ میں نہ صرف کثیر فوج اُتار دی بلکہ اُن کی مدد کے لئے تمام ضروری سامانِ جنگ بھی پہونچا دیا۔ برطانوی سپاہیوں نے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی فوج کی مدد سے اس حیرت انگیز حملے کا بڑی دلاوری اور پامردی سے مقابلہ کیا لیکن میدان جنگ سے قریب ہوائی اڈوں کی کمی کے باعث یہ مقابلہ زیادہ کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر انھیں اپنی بچی کھچی جمعیت کے ساتھ میدان چھوڑنا پڑا۔ مگر انھوں نے اتنی مزاحمت ضرور کی کہ جرمنوں کو فتح کے لئے بہت گراں قیمت ادا کرنی پڑی۔ چنانچہ یونان اور کریٹ کے نقصانات کے علاوہ جہاں برطانیہ کے پندرہ ہزار سپاہی ہلاک اور زخمی ہوئے وہاں جرمنی کے بارہ ہزار سپاہی قتل و مجروح کردیئے گئے۔ اس کے علاوہ

برطانوی بیڑہ نے پانچ ہزار جرمن سپاہی سمندر میں غرق کردیئے اور جرمنی کے تقریباً دوسو لمبارہوائی جہاز اور ڈھائی سو فوج لیجانے والے ہوائی جہاز بھی تباہ و برباد ہوئے۔ برطانوی جنرل برطانوی سمندری بیڑے کی مدد سے اپنے سترہ ہزار سپاہی کریٹ سے صاف بچا لائے۔ اسی دوران میں بحری بیڑوں کا بھی مقابلہ ہوا اور گو برطانیہ کے بھی کئی جہاز برباد ہو گئے لیکن ان سب کے معاوضہ میں تسبارک نامی جرمنی کے مشہور و معروف جنگی جہاز کو غرق کردیا گیا جس کے متعلق ہٹلر کا دعویٰ تھا کہ وہ ایسا مضبوط تیار ہوا ہے کہ کسی طرح سے غرق ہی نہیں ہوسکتا ہے۔ اس عظیم الشان جنگی جہاز کی غرقابی برطانوی بیڑہ کی ایک زبردست فتح ہے۔ کیونکہ جرمنی کے لئے اس نقصان کو پورا کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ اس کے علاوہ معرکہ کریٹ کے دوران میں اٹلی اور جرمنی کے کئی اور بڑے بڑے جہاز غرق کردیئے گئے۔ برطانیہ کو بھی نقصان پہونچایا گیا لیکن جیسا کہ ہم آگے چلکر دیکھیں گے یہ نقصان دشمن کے نقصانات کے مقابلے میں بہت کم رہا۔

معرکہ کریٹ کے متعلق اکثر لوگوں کو سخت مایوسی ہوئی ہے جس کی آواز بازگشت انگلستان کے اخبارات اور برطانوی پارلیمنٹ کے مباحثے میں سنائی دی۔ لیکن ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو پچھلی جنگ یورپ کے دوران میں بھی اس قسم کے کئی دلشکن واقعات ہوئے تھے۔ ایسی سخت اور تند لڑائی میں جیسی کہ آجکل ہو رہی ہے ہم کو وقتاً فوقتاً ناگوار باتیں برداشت کرنے کیلئے تیار رہنا چاہیئے۔ مگر کریٹ کی شکست کے بھی بعض خوش گوار پہلو ہیں جیسا کہ برٹش اخبار ڈیلی اکسپرس کے فوجی نامہ نگار نے لکھا ہے کہ برطانوی فوج نے کریٹ میں رات دن ایک کرکے ہٹلر کے اٹھارہ ہزار بہترین جوانمرد موت کے گھاٹ اتار دیئے۔ اس کا بیان ہے کہ اس معرکہ میں جرمنی کے تقریباً چھ سو بہترین حملہ آور ہوائی جہاز برباد ہوئے۔ انگریزی فوج کو ہوائی جہازوں سے اُترنے والی فوج کے مقابلے کا بھی غیرمعمولی تجربہ حاصل ہو گیا۔ کیونکہ معرکہ کریٹ سے پہلے دنیا کی تاریخ میں اس قدر کثیر فوج نے ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے پہونچکر کبھی کسی ملک پر ایسا زبردست حملہ نہیں کیا تھا۔ کریٹ کا تجربہ برطانوی فوج کے لئے خود برطانیہ میں اس قسم کے حملہ کی مدافعت میں بڑا مفید ثابت ہوگا۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ یہ تجربہ اتحادیوں کے لئے بڑا تلخ تجربہ تھا۔

مگر اس جنگ میں کسی ایک میدان کے سر نہ ہونے سے بددل ہونے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ مجموعی حیثیت سے مختلف محاذوں پر نظر ڈالکر ہم کو اپنی رائے قائم کرنا چاہیئے۔ جرمنی نے یونان کو فتح کرکے فی الحال اٹلی کے حوالہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے لیکن ۲۰ مئی کو مشرقی افریقہ میں اٹلی کی عظیم الشان سلطنت کا بالکل خاتمہ ہی ہوگیا۔ اس وقت تک تقریباً ڈھائی لاکھ اطالوی سپاہی برطانیہ کی قید میں آچکے ہیں ابی سینیا (حبش) اطالوی قبضے سے بالکل نکل گیا۔ اور سابق شاہ حبش پھر اپنے پرانے پایہ تخت ادیس ابابہ میں

پہونچ گئے ہیں۔ شروع ۱۹۴۱ء میں مشرقی افریقہ میں تین لاکھ مستقل اٹالین فوج موجود تھی، جس میں ایک لاکھ خالص اطالوی سپاہی تھے۔ ان کے ساتھ ایک ہزار بڑی توپیں، صدہا آہن پوش ٹینک اور بہت سے ہوائی جہاز بھی تھے۔ پچھلے چار ماہ کی لڑائی کا یہ نتیجہ ہوا کہ یہ ساری فوج تباہ اور اُس کا کل سامان برباد ہوگیا۔ اس فوج کے ایک لاکھ تیس ہزار سپاہی قید اور پچپن[۵۵] ہزار قتل ہوئے، باقی یا تو گم ہیں یا کسی نہ کسی طرح ختم ہو چکے ہیں۔ اس عظیم الشان فوج کا سارا سامان انگریزوں کے ہاتھ لگا اور سات لاکھ مربع میل کی اراضی اٹلی کی سلطنت سے نکل گئی۔ اس وقت تک جو نو آبادیاں اٹلی کے قبضے سے نکل گئی ہیں اُن کا رقبہ ایشیائے کوچک کے برابر اور برطانیہ سے سات گنا زیادہ ہے۔ اطالوی فوج کے سپہ سالار اعظم ڈیوک اوسٹا (Duke Aosta) اور ان کے ساتھ کے دوسرے کئی بڑے بڑے جنرل بھی گرفتار کر لئے گئے ہیں۔ جو سامان جنگ ضائع ہوا اس کی قیمت کا اندازہ دس ارب پاؤنڈ لگایا گیا ہے جس کی تیاری کے لئے پورے دو سال درکار ہونگے۔ اطالوی سپاہیوں نے جان توڑ کر مقابلہ کیا لیکن انگریزی جنرلوں کی حسن تدبیر اور اُن کے سپاہیوں کی پامردی کے آگے کچھ پیش نہ گئی۔ افریقہ کے معرکوں میں ہندوستانی فوج نے بھی بڑی جوانمردی دکھائی۔ ہمارے لئے یہ بڑی خوشی اور فخر کی بات ہے کہ ہندوستانی سپاہیوں نے ہر جگہ جہاں اُنھیں اب تک بھیجا گیا ہے اپنی بہادری کے بے نظیر ثبوت دیئے۔ حال میں ہمارے ایک نوجوان فوجی افسر لفٹیننٹ بھگت کو جن کی عمر ابھی صرف ۲۳ سال کی ہے ملک معظم نے اس کی بے نظیر جوانمردی کے اعتراف میں برطانیہ کا سب سے بڑا جنگی اعزاز وکٹوریہ کراس عطا کیا ہے۔

ان شاندار فتوحات کے علاوہ برطانیہ کو عراق کے معرکہ میں قابل قدر کامیابی حاصل ہوئی۔ جرمنوں نے بعض ذی اثر عراقیوں کو انگریزوں کی مخالفت پر اُبھارا تھا چنانچہ رشید علی جیلانی نے اپنی طرف کچھ فوج کر کے عارضی طور پر گورنمنٹ عراق پر قبضہ کر لیا۔ مگر چند ہی روز میں رشید علی کو ایران بھاگنا پڑا اور زیادہ خونریزی کے بغیر اب اس بغاوت کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ بغداد میں ایک ماہ کے شور و شر کے بعد پُرانی حکومت از سر نو قائم ہوگئی ہے، اور برطانوی سفارت خانہ کو پھر اس کی پُرانی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ جرمنی نے مصر پر بھی دست درازی شروع کی ہے لیکن اسکندریہ کی شہری آبادی پر متعدد ہوائی حملوں سے جان و مال کا نقصان پہونچانے کے علاوہ اور کچھ حاصل نہیں ہوا۔ برطانیہ نے اس کا رد عمل یہ کیا کہ فوراً ہی آزاد فرانسیسی فوج کی امداد سے سیریا کو وشی گورنمنٹ کی غلامی سے آزاد کرنے کی عملی تدبیر شروع کردی۔ چنانچہ اس وقت تک کئی اہم مقامات اتحادیوں کے قبضہ میں آگئے ہیں، دمشق پر بھی عنقریب ہی قبضہ ہونیوالا ہے۔ سیریا میں داخل ہوتے ہی آزاد فرانسیسی اور برطانوی افسروں نے سیریا اور اُس کے مضافات کو آزاد کرنے کا اعلان کر دیا۔

تیئیس[۲۳] سال ہوئے اتحادی فوجیں سیریا کو وسطی دولِ یورپ سے آزاد کرانے کی غرض سے اِس ملک میں داخل ہوئی تھیں۔ اب انھوں نے اُسے سیاسی و اقتصادی آزادی دلانے کا وعدہ کیا ہے۔ پچھلی جنگ کے خاتمے پر سیریا کی حکومت جمہوریۂ فرانس کے سپرد کی گئی تھی۔ مگر جمہوریۂ فرانس نے اسکے ساتھ اپنے وعدے پورے نہیں کئے اور اب خود فرانس کی جمہوری حکومت بھی قائم نہیں رہی۔ اس طرح اخلاقی حیثیت سے وشی گورنمنٹ کو سیریا پر قبضہ قائم رکھنے کا کوئی حق باقی نہیں رہا، لیکن وہ اب بھی سیریا پر قبضہ رکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اتحادی سیریا کو حتی المقدور نقصانات سے بچانا چاہتے ہیں، اس لئے اتحادی فوج نرمی سے کام لے رہی ہے۔ ہم کو امید ہے کہ عنقریب سیریا آزاد ہو جائے گا کیونکہ اس پر موجودہ فرانسیسی حکومت کا قبضہ قائم رہنا اتحادیوں کے لئے بہت مخدوش ہے۔ اس کے ہوائی اڈّوں سے جرمن عراق اور موصل کے تیل کے چشموں، نیز فلسطین اور مصر پر آسانی سے حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر سیریا اتحادیوں کے ساتھ ہو جائے تو عراق، خلیج فارس اور ہندوستان تک کی آسانی سے حفاظت کی جا سکتی ہے اور سائپرس بھی بہت کچھ محفوظ ہو سکتا ہے۔ بغداد ریلوے کا ایک حصّہ سیریا ہوتے ہوئے ترکی جاتا ہے۔ ان سب باتوں کے علاوہ سیریا کو آزادی دے کر اتحادی اپنا اکیس سال کا پُرانا عہد پورا کر رہے ہیں جو اُنھوں نے پچھلی جنگ کے خاتمے پر کیا تھا۔ اور جسے فرانس اب تک لیت و لعل میں ڈالے ہوئے تھا۔ سیریا کی آبادی تیئیس[۳۲] لاکھ اسی ہزار ہے جس میں تقریباً چوبیس[۲۴] لاکھ مسلمان اور تقریباً سات لاکھ عیسائی ہیں۔ ہم کو اُمید کرنا چاہیئے کہ جس پالیسی کا برطانیہ نے سیریا میں اعلان کیا ہے اس کو آئندہ بھی اپنے تمام نوآبادیات میں قائم رکھیگی۔

بحرِ اطلانتک کی لڑائی میں بھی برطانیہ اپنی پوزیشن بخوبی قائم کئے ہوئے ہے۔ شروع ہی سے فریقین ایک دوسرے کے جہازوں پر بے پناہ حملے کر رہے ہیں۔ آخری نتیجہ کیا ہوگا اس بارے میں قطعی حکم لگانا تو مشکل ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ ہٹلر نے جو دعویٰ کیا تھا کہ وہ مارچ ۱۹۴۱ء کے شروع ہوتے ہی برطانوی جہازوں کی آمد و رفت بند کر دیگا وہ پورا نہیں ہوا اور امید ہے کہ آئندہ بھی پورا نہ ہوگا۔ یوں تو پچھلے بیس[۲] ماہ سے جہازوں پر برابر حملے ہو رہے ہیں جن سے اوسطاً ہر ماہ تین لاکھ چھ ہزار چار سو ٹن کے وزنی جہازوں کا نقصان ہو رہا ہے۔ پچھلے مہینوں میں سب سے زیادہ نقصان مارچ ۱۹۴۱ء ہی میں ہوا جب چار لاکھ نواسی ہزار ٹن وزنی جہاز غرق کئے گئے۔ لیکن اس نقصان کی اصلی اہمیت اُسی وقت ذہن نشین ہو سکتی ہے جب ہم یہ سمجھ لیں کہ برطانیہ کے اس سے چوگنے پچگنے وزن کے جہاز ہر وقت بحرِ اطلانتک سے گذرتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ برطانوی پنڈبکیاں بھی جرمن جہازوں پر حملے کرتی رہتی ہیں۔ مثلاً پچھلے مئی ۱۹۴۱ء میں ان حملوں کی بدولت جرمنی کے دو لاکھ ستاون ہزار ٹن وزنی جہاز غرق ہوئے۔ برطانیہ کا نقصان تین لاکھ چالیس ہزار ٹن سے

زائد نہیں ہوا۔ پچھلے چند مہینوں کے برطانوی نقصانات کی تفصیل یہ ہے:۔

جنوری ۱۹۴۱ء	تین لاکھ چھ ہزار	فروری ۱۹۴۱ء	تین لاکھ ۴۴ ہزار
مارچ ۱۹۴۱ء	چار لاکھ ۸۹ ہزار	اپریل ۱۹۴۱ء	چار لاکھ ۵۴ ہزار

مئی ۱۹۴۱ء تقریباً تین لاکھ ۵۴ ہزار جس میں معرکۂ کریٹ کے نقصانات بھی شامل ہیں۔

اسی طرح اپریل کے نقصانات میں بحر اٹلانٹک کے ایک لاکھ ستر ہزار ٹن کے نقصانات شامل ہیں۔ بحری نقصانات کے ساتھ ہی ساتھ ہم کو ہوائی جنگ کے نقصانات کا بھی مقابلہ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ وسط مشرق کے مختلف محاذوں پر (بشمول عراق) مئی ۱۹۴۱ء میں اتحادیوں نے دشمن کے سولہ سو چھیانوے (۱۶۹۶) ہوائی جہاز تباہ و برباد کئے، مگر دشمن ان کے دو سو ساٹھ (۲۶۰) ہوائی جہازوں سے زیادہ تباہ نہ کر سکا۔ اسی طرح برطانیہ کی سرزمین پر ۱۴۳ بمبار ہوائی جہاز نیچے گرائے گئے۔ اگر سب قسم کے ہوائی جہازوں کو شامل کر لیا جائے تو برطانیہ نے دشمن کی ۲۵۸ مشینیں تباہ کیں، اس کے مقابلے میں برطانیہ کی طرف ۶۲ مشینیں برباد ہوئیں۔ گویا برطانیہ اور جرمنی کے نقصانات ایک اور چار کی نسبت سے ہوئے۔

یہ اعداد و شمار تسلی بخش ہیں، اور اگر ہم امریکہ کی بڑھتی ہوئی امداد کا اندازہ کریں تو پھر اتحادیوں کی آخری فتح کے متعلق کوئی خدشہ باقی نہیں رہتا ہے۔ اس وقت امریکہ کے کارخانے اس زور شور سے کام کر رہے ہیں کہ آئندہ چھ ماہ یعنی ۱۹۴۱ء کے آخر تک ۱۲½ لاکھ ٹن وزن کے سوداگری جہاز تیار ہو کر مکمل ہونے کی توقع کی جاتی ہے اور اگلے سال یعنی ۱۹۴۲ء میں ۳۵ لاکھ ٹن وزن کے جہاز اور ۱۹۴۳ء میں پچاس لاکھ ٹن وزن کے جہاز تیار کرنے کا بندوبست ہو رہا ہے۔ ان جہازوں کی قیمت کا اندازہ آپ اس سے کر سکتے ہیں کہ ۵۰۰ سوداگری جہازوں کی تیاری میں ایک ارب ½ ۹۲ لاکھ ڈالر کا صرفہ آتا ہے۔

پریسیڈنٹ امریکہ نے ہر ممکن طریقہ سے برطانیہ کی امداد کا تہیہ کر لیا ہے۔ چنانچہ اس وقت وہ بڑی سرگرمی سے جرمن جاسوسوں کی شرارتوں کا تدارک کر رہے ہیں جو آئے دن کارخانوں میں ہڑتال کرا کے برطانیہ کی امداد کے کام میں روڑے اٹکا رہے ہیں۔ پریسیڈنٹ موصوف نے ۱۳۔ جون کو جنگی سامان بنانے والے کارخانوں کو سرکاری انتظام میں چلانے کا اختیار لے لیا ہے۔ انھوں نے اسی ماہ ایک بہت بڑے صنعتی کارخانے کی ہڑتال حکماً ختم کر دی۔ امریکن سینٹ کے ۴۶ ممبروں نے (بخلاف ۲۵) اس حق کی تائید میں ووٹ دیئے حال میں پریسیڈنٹ روزویلٹ نے امریکہ کے مختلف شہروں سے جرمنی کی سفارتی ایجنسیوں کے بند کر دینے کا بھی حکم جاری کیا ہے۔ یہ ایجنسیاں بظاہر سفارتی ضروریات اور تجارتی معاملات طے کرنے کی غرض سے قائم تھیں لیکن در پردہ ان میں جرمنی کا سیاسی پروپیگنڈا ہوتا تھا۔ پریسیڈنٹ صاحب نے جرمنی کی مخالفت کی پروا نہ کرتے ہوئے

ان ایجنسیوں کو یک لخت ختم کر دیا ہے۔ عام خیال ہے کہ اس حکم کے بعد برطانیہ کے ساتھ امریکہ کے باضابطہ شریکِ جنگ ہونے میں بہت ہی کم کسر رہ جاتی ہے۔ شروع جون ۱۹۴۱ء میں عام باشندگان امریکہ کی بابت کا جو اندازہ کیا گیا تھا اس کے مطابق (۶۲) باسٹھ فیصدی امریکن جنگ میں فوراً شامل ہونے کی طرف تھے باقی میں چھبیس ۲۶ فیصدی لوگ جنگ سے علٰحدہ رہنے کی طرف اور بارہ ۱۲ فیصدی بالکل غیر جانبدار تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ عنقریب ہی اسی یا پچاسی فیصدی امریکن جنگ کے موافق ہو جائیں گے اور پھر پریسیڈنٹ صاحب کو اعلان جنگ کرنے میں کوئی پس و پیش نہ ہوگا۔ حالات تیزی کے ساتھ امریکہ کو جنگ کی طرف لئے جا رہے ہیں۔ وسط جون میں جرمنی نے رابن مور نامی امریکن جہاز ڈبو دیا ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق امریکہ نے جرمنی سے جواب اور نقصان کا معاوضہ طلب کیا ہے۔ پریسیڈنٹ صاحب امریکن جہازوں کی حفاظت کے تمام ضروری انتظامات کرنے پر آمادہ معلوم ہو رہے ہیں۔ مسٹر چرچل وزیر اعظم برطانیہ نے اہل امریکہ سے اپیل کی ہے کہ برطانیہ کی امداد میں وقت کی تنگی کا پورا لحاظ رکھا جائے۔ مسٹر موصوف نے اسی تقریر میں کہا ہے کہ خواہ کتنی ہی مشکلات کیوں نہ پیش آئیں لیکن برطانیہ آخر وقت تک اپنی اور دوسرے ملکوں کی آزادی کی اٹل حفاظت کرتا رہے گا۔

چند دنوں سے جرمنی خاموش ہے، دیکھئے روس کی طرف توجہ ہوتی ہے یا برطانیہ پر حملہ کا خیال پورا کیا جاتا ہے۔

شاید برطانیہ کے پارلیمنٹری حلقوں میں ہندوستانی مسئلہ کے متعلق کچھ بے اطمینانی پیدا ہو رہی ہے پچھلے پارلیمنٹری مباحثہ سے بھی یہی ترشح ہوتا تھا اور حال کے واقعات سے بھی یہی بات ظاہر ہو رہی ہے۔ واقف حال انگریز اور مزدور پارٹی کے ممبران مسٹر ایمرے وزیر ہند کے طرز عمل سے مطمئن نہیں ہیں، اور اس بات کی کوشش شروع ہو گئی ہے کہ جب مسٹر چرچل اپنے وزیروں میں ردّ و بدل کریں تو مسٹر ایمرے کو ان کی مسلّمہ قابلیت کے مطابق کوئی اور موزوں و مناسب عہدہ دیدیا جائے۔ اور ہندوستان کی حکومت کی باگ ڈور کسی دوسرے ہمدرد، تجربہ کار اور روشن خیال مدبر کے سپرد کی جائے۔ اس سلسلہ میں مسٹر ویجوڈ بین کا نام لیا جاتا ہے جو لیبر گورنمنٹ کے زمانے میں وزیر ہند رہ چکے ہیں۔ مگر کوئی وزیر ہند وزیر اعظم کی پالیسی کے خلاف عملی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ اور مسٹر چرچل نے ابھی تک ہندوستان کے متعلق ایک حرف بھی اپنی زبان فیض ترجمان سے نہیں نکالا ہے۔ اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ مسٹر ایمرے کا غیر ہمدردانہ رویّہ کہاں تک خود ان کی رائے کا عکس ہے اور کہاں تک وہ اس بارے میں مسٹر چرچل کی ممنوائی کر رہے ہیں۔ لیکن یہ بات محتاج تشریح نہیں ہے کہ مسٹر ایمرے وزیر ہند کی حیثیت سے قطعاً ناکامیاب ثابت ہوئے ہیں چنانچہ جب کبھی پارلیمنٹ میں یا اس کے باہر ان کو ہندوستان کے متعلق کچھ کہنے کا موقع ملا ہے ان کی باتوں سے

اہلِ ملک کو شکایت ہی کا موقع ملا ہے۔ کانگریس کا تو ذکر ہی کیا ہے، انھوں نے ہندوستان کے مسلمہ و مستند
وفادار لبرل لیڈر ان کو بھی اپنے بیجا شکوک اور ناروا الزامات سے ناراض کر دیا ہے۔ حال میں ان کی جو دو ایک
تقریریں ہوئی ہیں اُن میں کوئی تقریر ایسی نہیں ہے جو نکتہ چینی سے بالاتر کہی جا سکے۔ غالباً مسٹر ایمرے اور اُن کے
ہم خیال لوگ جنگ کے دوران بھر ہندوستان کے ملکی انتظامات میں کسی اُصولی تبدیلی کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ اسی لئے
وہ ایک نہ ایک بہانہ سے ہندوستانی مدبروں کے مطالبوں کو برابر ٹالتے رہتے ہیں۔ مسٹر ممدوح سے بارہا یہ بھی
اپیل کی گئی کہ ہندوستان آکر اور حالات کا خود مشاہدہ کر کے تمام مطالبات کے متعلق مناسب فیصلہ کریں، مگر انھوں
نے اس پر بھی کوئی دھیان نہیں دیا اور اس زحمت کو غیر ضروری سمجھا۔ اپنی تقریروں میں وہ کبھی کوئی بات کہکر اور کبھی
کوئی اور بات کہکر معاملے کو برابر ٹالتے رہتے ہیں۔ ہندوستانی مطالبات پورے کرنے کی تو انھیں کوئی عجلت نہیں لیکن
اُن کی یہ خواہش ضرور ہے کہ تمام ہندوستان بلا پس وپیش جنگی امداد پر کربستہ نظر آئے۔ انگریزی مدبروں کی اس
وقت عام طور پر یہی خواہش معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ شروع جون میں مس ایلنار راتھبورن صاحبہ ممبر پارلیمنٹ نے
کانگریسیوں کے نام ایک کھلی چٹھی بھیجی جس میں انھوں نے جنگ کے بارے میں پولیٹیکل لیڈروں کے رویہ کی
سخت شکایت کی ہے اور آخر میں اُن کا لہجہ دھمکی آمیز بھی ہو گیا ہے۔ ہندوستان کی طرف سے اس کا مفصل اور
ترکی بہ ترکی جواب شاعرِ اعظم رابندر ناتھ ٹیگور نے دیدیا ہے۔ ٹیگور ان روشن خیال ملکی رہنماؤں میں ہیں جو
انگریزی راج کے احسانات تسلیم کرتے ہیں۔ مگر اس بزرگی کے زمانے میں شاعرِ اعظم نے جن الفاظ میں بعض تلخ حقیقتوں
کا اظہار کیا ہے، اس سے اس وقت عام ہندوستانیوں کی اندرونی بد دلی کا ثبوت ملتا ہے۔ حال میں چند اور
انگریزی عورتوں نے بھی ہندوستان کی عورتوں سے جنگی امداد کی اپیل کی ہے۔ اس کا جواب مسز وجے لکشمی پنڈت
صاحبہ نے (جو صوبہ متحدہ کی کانگریسی گورنمنٹ میں وزیر رہ چکی ہیں اور حال میں ستیاگرہ کے سلسلے میں اپنی سزا
ختم کر کے جیل خانہ سے رہا ہوئی ہیں) اچھے طور پر دیدیا ہے۔ کانگریسی ستیاگرہ کے سلسلے میں اس وقت تقریباً
بیس ہزار محبِ وطن جیل خانوں میں بند ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ حالت کسی نقطۂ خیال سے قابلِ اطمینان نہیں ہے
اس لئے ہماری رائے تو یہی ہے کہ اس حالت کو جلد سے جلد ختم کر دینا چاہیئے۔ اس سلسلے میں یہ بات تسلی بخش ہے
کہ تمام دلشکن حالات کے باوجود دونوں ملکوں کے چند ذی اثر اصحاب اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش جاری کئے
ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو اور کنور سر جگدیش پرشاد صاحبان آخری ہفتہ جولائی میں بمبئی کانفرنس کا ایک
دوسرا اور پہلے سے وسیع تر اجلاس منعقد کر رہے ہیں۔ اُدھر برطانیہ کے چند اُولو العزم نوجوان آکسفورڈ یونیورسٹی میں
آئندہ ماہ کے آخر تک مدبرانِ برطانیہ کی ایک مشاورتی کانفرنس طلب کر رہے ہیں جس میں ہندوستان کے قائم مقام بھی

ےل Miss Eleanor Ruthborne M.P.

مدعو ہوگئے اور یہ چھ دن تک برابر جاری رہیگی۔ اس کانفرنس میں مسٹر چرچل وزیر اعظم برطانیہ کے شرکت کی بھی اُمید کی جاتی ہے۔ دیکھئے ان تحریکوں کا کیا نتیجہ ہوتا ہے، اور ملک کے لئے کوئی مفید بات نکلتی ہے یا نہیں

پچھلے دو مہینوں سے تحریک پاکستان میں کچھ ضعف آتا ہوا معلوم ہو رہا ہے۔ مسلم لیگ کے دو مقتدر رکن سر سکندر حیات اور مسٹر فضل الحق نے اپنے اپنے طریقہ سے اس کی مخالفت شروع کر دی ہے۔ سر سکندر وزیر اعظم پنجاب تو بارہا اپنی تقریروں میں اس سے اپنی بے تعلقی بلکہ بیزاری کا اظہار کر چکے ہیں، اب پُرجوش وزیر اعظم بنگال نے بھی سیاسی سمجھوتہ کی خواہش ظاہر کی ہے اور ماضی و حال کے تمام صوبجاتی وزیروں کی ایک گول میز کانفرنس کی تجویز پیش کی ہے۔ اتنے دنوں کی خاموشی کے بعد مدبران ملک میں سمجھوتہ کی خواہش پیدا ہونا آئندہ کے لئے فال نیک ہے۔ حال میں بعض معززین نے بھی تحریک پاکستان کی علانیہ مخالفت کی ہے۔ مثلاً نواب صاحب مرشد آباد نے ۱۰ جون ۱۹۴۱ء کو اخبارات کے نام ایک مفصل بیان شائع کیا ہے، جس میں اُنھوں نے ملک کے مختلف طبقوں میں اتفاق باہمی کی ضرورت پر بہت زور دیا ہے اور فرقہ وارانہ اسپرٹ کی ترقی کو ملک کے لئے سخت مضر قرار دیا ہے۔ آپ کی رائے میں سیاسی دور اندیشی کا تقاضا یہ ہے کہ خیر خواہانِ ملک اس موقعہ پر ہاتھ پر ہاتھ دھرے ہوئے خاموش نہ بیٹھے رہیں بلکہ اُس تحریک کو جسے وہ بدنصیب سمجھتے ہیں اپنا سر اُٹھانے کا موقعہ ہی نہ دیں۔ آپ کی رائے میں اس کا نتیجہ اس کے سوائے اور کچھ نہیں نکل سکتا کہ ہندوستان کی دُور تک پھیلی ہوئی آبادی میں جنم بھر کا بیر ہو جائے۔ اس لئے ہندوستان کی حقیقی بیداری اس میں ہے کہ اس کے ہر طبقہ کے لیڈران ملکی ترقی کے دشوار گذار راستے میں کوئی ایسی رکاوٹ باقی نہ رہنے دیں جو ہمارے آخری اور مشترکہ سیاسی مقصد کے حصول میں سدراہ ہو۔ آپ لکھتے ہیں کہ کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان کے ہندو مسلمان جو عہدِ مغلیہ سے ابتک بھائیوں کی طرح رہتے چلے آئے ہیں اور کبھی ایک دوسرے سے قطع تعلق کر کے جدا نہیں ہوئے ہیں اس نازک وقت پر بھی امن اور صلح کے ساتھ نہ رہیں۔

۸ جون کو مسٹر ایم بشریف سابق وزیر صوبۂ متوسط کی صدارت میں احاطۂ مدراس کے ضلع کمبا کونم میں جنوبی ہند کے مسلمانوں کی اینٹی پاکستان کانفرنس ہوئی۔ مسٹر شریف کی صدارتی تقریر ہندوستان کی ملکی یگانگت کا ایک پرزور اور مدلل بیان ہے۔ اُنھوں نے بجا طور پر اس بات پر زور دیا ہے کہ جمہوریت میں کثیر التعداد طبقہ کا اولین فرض ہے کہ وہ قلیل تعداد والی جماعتوں کی پوری طور پر حفاظت کریں، مگر انکی رائے میں محض حقوق پر زور دینے سے غلط فہمیاں پیدا ہونے کے سوائے اور کچھ نہ ہوگا۔ یہ کانفرنس ہر حیثیت سے جنوبی ہند کے مسلمانوں کی نمایندہ کانفرنس تھی۔ اور مارچ کی پاکستانی کانفرنس کے بعد اس نے ان اطراف کے تمام مسلمانوں کی وکالت کا پورا حق ادا کر دیا۔ مسٹر شریف کو ذاتی حیثیت سے کانگریس ہائی کمانڈ سے کافی شکایات ہیں مگر اُن کی حُبِ وطنی کی تعریف کرنا چاہیئے کہ انھوں نے ذاتی شکایتوں سے متاثر ہو کر کانگریس سے کنارہ کشی نہیں کی۔

مدراس مسلم لیگ کے بعض بڑے بڑے لیڈران نے بھی پاکستان کی تجویز سے اپنا اختلاف ظاہر کیا ہے۔ دوسرے صوبوں کے اکثر لیڈران اس تحریک کی محض اس لئے تائید کر رہے ہیں کہ ان کا خیال ہے کہ یہ انقلابی مطالبہ اُن کے فرقہ کے لئے مفید ہوگا۔ کیونکہ اس طرح کانگریس ملکی یگانگت قائم رکھنے کی دھن میں ان کی جائز اور ناجائز سب باتیں منظور کرلے گی۔ اس خیال کی پرزور تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حال میں حیدر آباد یونیورسٹی کے ڈاکٹر سید عبداللطیف نے جو موجودہ تجویز پاکستان کے اولین محرک ہیں خاص خاص کانگریسی لیڈروں سے اس مسئلہ پر مفصل خط وکتابت کی ہے۔ آپ کی صاف اور صریح رائے ہے کہ مسلمان پاکستان کی تجویز سے دست بردار ہوجائیں اگر اُن کو اس بات کا اطمینان دلا دیا جائے کہ ہندوستان کے اتر پوربی اور اُتر پچھمی حصوں میں جہاں اُن کی کثیر تعداد ہے انھیں مرکزی حکومت کی مداخلت کے بغیر اندرونی انتظامات کی پوری آزادی حاصل ہوگی۔ ڈاکٹر راجیندر پرشاد نے ڈاکٹر لطیف کی چھٹی کے جواب میں عام طور پر اس مطالبے سے ہمدردی کا اظہار کیا ہے اور اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ ۱۹۳۵ء کے اصلاحات کی رو سے صوبوں کو اندرونی معاملات میں بہت کچھ اختیارات حاصل ہوگئے ہیں۔ ان اختیارات کے فروغ اضافہ میں بھی انھیں کوئی عذر نہیں ہے۔ لیکن ملکی حفاظت اور خارجی معاملات میں وہ صوبوں کو مرکزی حکومت سے آزاد کرنے کے سراسر خلاف ہیں اور اس میں کوئی کمی برداشت نہیں کرسکتے۔ یہی پوزیشن ہر دوراندیش محب وطن کی ہوگی جو ملکی ضروریات کو صوبہ اور فرقہ سب سے بالاتر سمجھتا ہے۔ برطانوی مدبر بھی اس سے منحرف نہیں ہوسکتے۔ خواہ اس وقت وہ کسی مصلحت سے اس امر کا صاف اعلان کریں یا نہ کریں۔

پاکستان کے ایجی ٹیشن نے عوام کو عجیب و غریب غلط فہمیوں میں مبتلا کردیا ہے۔ انھیں میں ایک خاص غلط فہمی کا جو ریاست حیدر آباد کی مسلم آبادی میں رفتہ رفتہ پھیلائی گئی ہے ہز اکزالٹڈ ہائی نس اعلیٰحضرت نظام دکن نے بر وقت نوٹس لیا ہے۔ کچھ دنوں سے عوام حیدر آباد میں یہ نظریہ پھیلایا جا رہا ہے کہ خسرو دکن ریاست کی مسلم آبادی کے قائم مقام کی حیثیت سے ریاست دکن کے حکمراں ہیں۔ یہ انوکھا نظریہ تاریخی نقطۂ خیال سے سراسر لغو اور بے بنیاد ہے۔ مگر اس کا زہر آہستہ آہستہ عوام میں سرایت کر رہا تھا۔ لیکن بیدار مغز حکمران ریاست نے اس باہمی نااتفاقی اور بدامنی کی تخم ریزی کا سدباب کردیا اور ایک خاص فرمان جاری فرما کر اس دعوئ باطل کو ہمیشہ کے لئے ختم کردیا۔ اعلیٰحضرت نے پچھلے دو ماہ میں پے درپے تین اہم فرمان جاری فرمائے ہیں۔ ان میں سے ایک میں اس بات کی پرزور تردید کے بعد کہ رعایا کے کسی طبقہ کو حکومت میں کوئی خاص دخل یا پوزیشن حاصل ہے جو دوسرے طبقوں کو نہیں ہے اس امر کا بخوبی اطمینان دلایا گیا ہے کہ اعلیٰحضرت خود بدولت اس بات کے ذمہ دار ہیں کہ ان کی رعایا کے ہر فرد کے ساتھ بلا لحاظ اس کے کہ وہ اعلیٰ ہے یا ادنیٰ، امیر ہے یا غریب یکساں انصاف اور مساوات کا سلوک کیا جائے گا۔ تیسرے فرمان میں ہز اکزالٹڈ ہائی نس نے اس بات کو آئینہ کی طرح صاف کردیا ہے کہ انکی اور اُن کے بزرگوں کی ہمیشہ یہی

عام مقصد نہیں ہے کہ ریاست میں کسی مذہب یا ملت کے ساتھ کسی قسم کی تنگدلی یا دل آزاری کا برتاؤ نہ کیا جائے اور درحقیقت بہ حیثیت حکمران ان کا کوئی خاص مذہب نہیں ہے (اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اعلیٰحضرت لامذہب یا خدا کی ہستی کو ماننے والے نہیں ہیں) بلکہ اس سے یہ مراد ہے کہ حکمران کی حیثیت سے انہیں نہ کسی خاص مذہب یا فرقہ سے کوئی خصوصیت اور نہ کسی سے کوئی تعصب ہے۔ اعلیٰحضرت نے اس سلسلے میں اپنے ایک پرانے فرمان کا حوالہ دیا ہے جسمیں آٹھ سال ہوئے ممدوح نے صلح کل کا اعلان فرمایا تھا اور اس بات کا اعادہ کیا تھا کہ ریاست میں اعلیٰحضرت کے ماتحت مختلف مذاہب کے پیرو اور مختلف قوموں کے لوگ آباد ہیں اور مدت دراز سے ان سب کے مکانات اور عبادت گاہوں کی حفاظت کا فرض وہ خود بدولت اور اُن کے بزرگ انجام دیتے آئے ہیں۔

اس سے زیادہ صاف اور زیادہ واضح اور کیا اعلان ہو سکتا ہے۔ درحقیقت یہ اعلان نہ صرف نظام عالی مقام کی رعایا کے لئے اطمینان بخش ہوتا۔ بلکہ ملک کے عام ہندو مسلمان بھی ان سے مفید سبق لے سکتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ یہی نیک اوصاف اور اعلیٰ خیالات اعلیٰحضرت کی ذات بابرکات کو خاص و عام میں اس درجہ ہردلعزیز بنائے ہوئے ہیں۔ چنانچہ پچھلے دنوں اعلیٰحضرت کی والدہ ماجدہ کے انتقال پُرملال کے موقعہ پر دکن کے لکھوکھا ہندو مسلمان تہ دل سے اعلیٰحضرت کے شریک ماتم رہے۔ خود اعلیٰحضرت[1] کئی میل تک پا پیادہ مادر دکن کے جنازے کے ساتھ گئے اور ان کی ہندو مسلمان رعایا لکھوکھا کی تعداد میں برابر اُن کے ہمراہ رہی۔ اس بیساختہ اظہار وفاداری و ہمدردی کا اعلیٰحضرت نے جس اُولوالعزمی سے اعتراف فرمایا ہے اس پر اہل دکن کو جس قدر فخر ہو کم ہے۔ ہم بھی اس سانحۂ عظیم میں اعلیٰحضرت کی خدمت بابرکت میں اپنی مؤدبانہ ہمدردی پیش کرتے ہیں۔

موجودہ حالات کا ایک دلشکن پہلو وہ فرقہ وارانہ فسادات ہیں جو حال میں ڈھاکہ۔ بہار۔ احمد آباد اور بمبئی وغیرہ میں ہوئے ہیں۔ ان سب میں ڈھاکہ کا فساد تندی اور طوالت دونوں لحاظ سے سب سے بازی لے گیا۔ بہار شریف میں بھی ہولناک واقعات ہوئے ہیں اور احمد آباد اور بمبئی میں بھی بیدردی سے صدہا غریبوں اور بیگناہوں کا خون بہایا گیا۔ بمبئی میں تو اب بھی اکا دکا واقعات ہو جاتے ہیں۔ فساد ڈھاکہ کے سلسلے میں اکثر مواضعات میں ناگفتہ بہ مظالم ہوئے جنکی وجہ سے وہاں کے غریب اور بے بس باشندے ہزاروں کی تعداد میں اپنا گھر بار چھوڑ کر اپنی جان لیکر قریب کی دیسی ریاستوں میں چلے گئے۔ بنگال گورنمنٹ نے تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر دی ہے جس نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ بہار میں بابو راجیندر پرشاد اور اُنکے ساتھیوں نے قابل تعریف مستعدی سے امن و امان قائم کر دیا ہے۔ بمبئی میں گورنمنٹ کی کوششیں ابھی تک پورے طور پر کامیاب نہیں ہوئیں۔ مہاتما گاندھی نے آئے دن کے فسادات کے متعلق کئی مضامین شائع کئے ہیں اور لیڈروں نے بھی ان کے تدارک کی مختلف تدبیریں پیش کی ہیں۔ لیکن اصل یہ ہے کہ جبتک ہندو مسلمان لیڈران اور گورنمنٹ تینوں یکدل ہو کر اتفاق رائے سے ان باتوں کا سدباب نہ کرینگے یہ فسادات ہوتے ہی رہینگے۔ جبتک ملکی فضا درست نہ ہوگی اور لوگوں کو اپنے اپنے فرقہ کی جانبداری کا خیال رہیگا شورہ پشت طبقہ کی دانستہ یا نادانستہ مگر برابر حوصلہ افزائی ہوتی رہیگی۔ اسکے ساتھ ہی عوام میں مقابلہ کی طاقت اور ہمت پیدا کرکے انہیں اس قابل بنانے کی بھی ضرورت ہے کہ وہ بلا امداد پولیس و فوج خود منظم ہو کر اتفاق باہمی سے اپنے ننگ و ناموس اور جان و مال کی حفاظت کا ضروری انتظام کر سکیں۔

[1] یہ جمعرات ۲۰ جون کو کھلی گاڑی میں تھا اسکے بعد ... اعلیٰحضرت ... پیدل ... ایک میل کا فاصلہ ... طے کیا۔